فقه المعاملات

یعنی

جدید معاملات کے شرعی احکام

۳ جلد یکجا مجلد

جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب

معین مفتی واستاد جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی

دار الاشاعت

اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان فون: 2631861

فقہ المعاملات

یعنی

جدید معاملات کے شرعی احکام

کامل ۳ جلد یکجا

جلد دوم

جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب
معین مفتی و استاد جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی

دار الاشاعت
اردو بازار، ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی
طباعت : فروری ۲۰۰۷ء علمی گرافکس
ضخامت : 263 صفحات

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمد للہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو ازراہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

……… ملنے کے پتے ………

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد
مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

انگلینڈ میں ملنے کے پتے

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

امریکہ میں ملنے کے پتے

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست مضامین

تمّت

شرکت کے احکام

شرکت کے لغوی معنی:

اختلاط ، یقال ، شارکہ ، ای خلط مالہ بمالہ .

اس نے اپنے مال کو اسکے مال کے ساتھ خلط کرلیا، یعنی شرکت کے لغوی معنی مطلقاً ملانا ہے۔

لغوی تعریف:

اختلاط النصیبین فصاعدا، بحیث لایتمیز ثم اطلق اسم الشرکة علی العقد وان لم یوجد اختلاط النصیبین . (القاموس الفقهی)

شرکت کی اصطلاحی تعریف:

هی عقد بین المتشارکین فی رأس المال ، والربح .

(فقه المعاملات)

شرکت کرنے والوں کا رأس المال (سرمایہ) اور نفع میں شرکت کرنا۔

دوسری تعریف یہ ہے کہ

بانها ثبوت الحق لا ثنین فاکثر علیٰ جهة الشیوع .

(تکملة الحموع شرح المهذب : ۵۰۵/۱۳)

یعنی دو یا دو سے زیادہ افراد کے لئے حق کا بطریقۂ شیوع ثابت ہونا۔

شرکت کی مشروعیت:

ثبت مشروعیة الشرکة بالکتاب ، والسنة ، والاجماع ،

اماالکتاب فقول اللّٰه عزوجل :

وقال سبحانه : ﴿ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلىٰ نِعَاجِهِ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلىٰ بَعْضٍ ﴾ والخلطاءُ : هم الشرکاء . (سورة صٓ : ۲۴)

وأما السنة : فقد قال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم : يقول اللّٰه تبارك وتعالىٰ أي في الحديث القدسي أنا ثالث الشريكين مالم يخن أحدهما صاحبه، فان خان أحدهما صاحبه، خرجتُ من بينهما .

(أخرجه ابو داؤد ، والحاكم في المستدرك ، وانظر جامع الأصول : ٦/١٠٨)

ومراد الحديث القدسي : أن اللّٰه عزوجل يبارك لهما في تجارتهما ، ويحفظهما ويرعاهما، مالم تحصل خيانة من أحدهما نحو الأخر .

وفي صحيح البخاري : عن أبي المنهال، أنه قال : وقد سئل عن الصرف : اشتريت أنا وشريك لي شيئاً، يدًا بيد، أي نأخذ ونعطي ، نسيئة أي الي أجل ، فجاء نا البراءُ بن عازب فسألناه ، فقال : فعلتُ ذلك أنا وشريكي "زيد بن ارقم" وسألنا النبي صلی اللّٰه عليه وسلم عن ذلك؟ فقال ماكان يداً بيد ، أي متقابضين أخذًا وعطاءً، فخذوه وماكان نسيئة فذروه اى اتركوه لأنه محرم .

وانما نهاهم صلی اللّٰه عليه وسلم عن النسيئة ، لأنه بيع مال بمال ، فيدخل في باب الصرف ،ويشترط في الصرف أن يكون مقبوضاً في الحال دون تأخير، لئلا يدخل فيه الربا .

وقد دلَّ الحديث الشريف على جواز الشركة ، فقد كان البراءُ وزيد شريكين ، وأقرَّهما النبي صلی اللّٰه عليه وسلم على هذه الشركة،فدلَّ ذلك على مشروعية الشركة .

وأما الاجماع : فقد أجمع المسلمون على جواز الشركة في الجملة ، وبُعث صلی اللّٰه عليه وسلم والناسُ يتعاملون بالشركة، فلم ينههم عنها، فدلَّ على جوازها .

شرکت کی مختلف صورتیں اور انکا ارتقاء:

بنی نوع انسانی کی ضروریات زندگی اور خواہشات طبعیہ میں اضافے کے ساتھ لوگوں کے

باہمی تعلقات اور معاملات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، چنانچہ بیع وشراء اور تجارت میں اضافے کی خاطر انسان نے نت نئے راستے نکالے اور معاملات کی مختلف صورتیں رائج کیں، انہی صورتوں میں سے ایک عقد شرکت بھی ہے جسکی مزید نئی شکلیں اور متنوع اقسام زمانہ کی گردش کے ساتھ ساتھ منظر عام پر آتی رہیں اور انہیں انسانوں نے قبول کر کے اختیار کیا، انہی انسانوں میں سے اہل عرب کو بھی شرکت کی ان اقسام کا علم حاصل ہوا اور انہوں نے اس کے مطابق تعامل اور باہمی لین دین کا عقد کرنا شروع کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے جب دینِ اسلام کی آفاقی تعلیمات کی تبلیغ کی اور شرعی احکام کو نافذ فرمایا تو ان تعلیمات اور احکامات کا ایک جزو اعظم ''معاملات'' بھی تھے لہذا انہوں نے ان معاملات میں سے جو تمام بنی نوع انسانی کے لئے ضروری اور مناسب تھے ان کو باقی رکھا، البتہ ان میں سے وہ جو نفع عامہ کے منافی تھے اور اس سے انسان کا دین و دنیا کا ضرر تھا ان کو ممنوع قرار دیدیا۔

جب صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں اسلام جزیرۂ عرب سے دنیا کے دور دراز خطوں میں پھیلا تو مختلف شہروں اور علاقوں کے معاملات بشمول عقد شرکت کے ایسی نت نئی اور مختلف صورتیں سامنے آئیں جو اس سے پہلے موجود نہ تھیں، لہذا فقہاء اسلام نے اسلام کے زریں اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اجتہاد کیا اور انتہائی عرق ریزی کے بعد ان میں سے بعض صورتوں کو جائز اور بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا اور مزید یہ کہ ادلہ اربعہ کی روشنی میں ایسے اصول مستنبط فرما دیئے جن سے بعد میں آنے والوں کو ان کی روشنی میں جزوی مسائل کا علم ہو جائے۔

شرکت کی اقسام:

شرکت کی ابتداءً دو قسمیں ہیں:

۱۔ شرکت املاک ۲۔ شرکت عقود

شرکت املاک:

اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) دو یا دو سے زیادہ افراد کا کسی چیز کا مشترکہ طور پر مالک بننا، مثلاً کسی گھر، زمین یا گاڑی کا بطور خریداری مالک بن جائے، اس کو ''شرکت ملک اختیاریہ'' کہا جاتا ہے۔

(۲) دو یا دو سے زیادہ افراد بطریق میراث کسی گھر یا گاڑی، دکان وغیرہ کے مالک

ہو جائیں اس کو "شرکت ملک جبریہ" کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس جیسی شرکت میں دونوں کے اختیار کا دخل نہیں ہے۔

شرکت املاک کا حکم:

شرکت املاک کا حکم یہ ہے کہ ان شرکاء میں سے ہر ایک دوسرے کے حصے کے حق میں اجنبی ہے، اس لئے کسی شریک کے لئے جائز نہیں کہ دوسرے کے حصہ میں بلا اجازت کسی قسم کا تصرف کرے، لہٰذا اگر کوئی شریک مشترکہ چیز کو دوسرے کی اجازت کے بغیر فروخت کردے تو یہ بیع دوسرے کی اجازت پر موقوف ہوگی، ہاں البتہ اپنا حصہ اپنے شریک کے ہاتھ فروخت کرے تو یہ نافذ ہو جائے گی کیوں کہ یہ حصہ مبیع اس کے حوالہ کرنے پر قادر ہے۔

قال فی الاختیار: الشرکة نوعان: شرکة ملك. وشرکة عقد. وشرکة الملك نوعان. جبریة واختیاریة. اما الجبریة بان یختلط مالان لرجلین اختلاط لا یمکن التمییز بینهما او یرثان مالاً. والاختیاریة. ان یشتریا عینا أو یوصی لهما او یخلطامالهما، وفی جمیع ذالك کل واحدمنهمااجنبی فی نصیب الاخر لا یتصرف فیه الاباذنه لعدم اذنه له فیه ویجوز بیع نصیبه من شریکه فی جمیع الوجوه. (الاختیار لتعلیل المختار: ۱۲/۳)

شرکتِ عقد

شرکتِ عقد دو شریکوں کے درمیان یا کئی شرکاء کے درمیان اصل سرمایہ اور منافع میں شرکت کا معاملہ طے کرنا۔

شرکتِ عقد کی اقسام:

فقہائے کرامؒ نے شرکت عقد کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں، فقہائے احنافؒ کے نزدیک شرکت عقد کی چھ قسمیں ہیں:

(۱) شرکت الاعمال

(۲) شرکت الاموال

(۳) شرکت الوجوہ

اور پھر ان تینوں قسموں کی دو قسمیں ہیں:

(۱) شرکت المفاوضہ

(۲) شرکت العنان

اس طرح کل ملا کر چھ قسمیں بن جاتی ہیں۔ (۱)

(۱) شرکت الاموال:

دو یا زیادہ افراد اپنا معین سرمایہ اس شرط پر لگائیں کہ ان میں سے ہر ایک یا بعض افراد کام کریں گے اور نفع دونوں میں مشترک ہوگا، مثلاً زید اور بکر ایک لاکھ روپے ملا کر لگائیں اور یہ طے کرلیں کہ ہم دونوں نفع میں سے آدھا آدھا لیں گے۔ (۲)

(۲) شرکت الأعمال:

اسے شرکت صنائع ابدان یا تقبل بھی کہا جاتا ہے، اس کی صورتیں یہ ہوتی ہیں کہ دو یا زیادہ افراد کوئی ایسا کاروبار شروع کرتے ہیں جس میں لوگوں کے کام اجرت پر کئے جاتے ہوں اور جو کمائی ہو اس میں دونوں شریک ہوں، اب دونوں مختلف پیشہ ور بھی آپس میں مل کر ایک شراکتی ادارہ قائم کر سکتے ہیں، اسی طرح سروسز کے کاروبار میں بھی اشتراک کیا جا سکتا ہے جس کی تفصیل آگے تیسرے باب میں ذکر کی جائے گی۔

نفع کی تقسیم کام کے اندازے پر نہیں بلکہ حسب قرارداد ہوگی، اگر یہ طے کیا کہ ہر شخص اپنے کام کے بقدر منافع کمائے یا کچھ طے نہ ہوا ہو تو شرکت نہیں رہے گی۔

(۳) شرکت الوجوہ:

اسے بعض فقہاء کرام شرکت الذمم بھی کہتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ شریک افراد کے پاس مال نہیں ہوتا وہ اپنی وجاہت اور اپنی ساکھ کے ذریعہ تاجروں کے یہاں سے سامان

---

(۱) شریکوں میں سے جو شخص بھی کوئی کام لے گا اس کی انجام دہی دونوں کو لازم ہوگی اور جو مزدوری ایک کے کام کرنے سے حاصل ہوگی وہ طے شدہ شرح کے مطابق دونوں کے درمیان تقسیم ہوگی اگرچہ دوسرے نے وہ کام نہ کیا ہو مثال کے طور پر زید اور عمر درزی کے کام پر اشتراک کرلیں کہ ہم مل کر کپڑے سیا کریں گے اور اس کی جو مزدوری ہوگی وہ دونوں میں آدھی آدھی یا کسی اور شرح سے تقسیم ہوگی، اب اگر زید کپڑے سیئے اور عمر نہ سیئے یا زید کے مقابلے میں کم سیئے تب بھی سلائی کی اجرت دونوں پر طے کردہ شرح کے مطابق تقسیم کی جائے گی۔

(۲) شرکت اعمال میں ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہے، کسی ایک شریک کو کام دے کر دوسرے شریک سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے، کسی بھی فریق کو اجرت دی جا سکتی ہے۔

ادھار لاتے ہیں اور نقد فروخت کر کے نفع حاصل کرتے ہیں جو ان میں تقسیم ہوتا ہے، شرکت کی یہ صورت بھی صحیح ہے، شرکت کی یہ قسم صرف امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے، ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک یہ شرکت جائز نہیں ہے۔

اس شرکت میں بھی ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے نفع بقدر ضمان تقسیم ہوگا، اس کے خلاف مقرر کرنا جائز نہیں ہے،[1] خریدے ہوئے مال کی قیمت ہر ایک پر اس کے حصہ کے بقدر واجب ہوگی، اگر شروع میں یہ طے کیا گیا کہ جو چیز بھی خریدی جائے گی وہ نصف نصف ہوگی تو ہر ایک چیز کی نصف قیمت واجب ہوگی اور نفع بھی نصف تقسیم ہوگا، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح نقصان بھی ہر شریک پر اس کے خریداری کے تناسب سے آئیگا۔

یہ شرکت کی ابتدائی تین قسمیں تھیں، اب ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ شرکت المفاوضہ

۲۔ شرکت العنان

(۱) شرکت المفاوضہ:

دو یا زیادہ شریک اس طرح شراکت کریں کہ اپنا مکمل سرمایہ جو کہ برابر سرابر ہو وہ سب اکٹھا کر کے کسی کاروبار میں لگا دیں، ان کا مال حقوق تجارت، عمل و نفع سب مساوی ہوں، اس شرکت میں ہر شریک دوسرے کا وکیل اور کفیل ہوتا ہے، یہ شرکت شاذ و نادر پائی جاتی ہے، مثلاً زید اور عمر ہزار ہزار روپے لگا کر سرمایہ کاری کریں اور ان میں ہر ایک کا نفع نصف نصف ہو، حقوق تجارت بھی برابر ہوں، تو یہ مفاوضہ کہلائے گی، لیکن اگر کسی ایک شخص کے سرمایہ میں ذرا سا بھی اضافہ ہو گیا تو وہ فوراً مفاوضہ سے بدل کر عنان بن جائے گی، ہر شئے میں مساوات اور برابری برقرار رہنا چونکہ مشکل کام ہے لہٰذا مفاوضہ کا وجود بہت کم ہوتا ہے، زیادہ تر عنان ہی ہوتا ہے، اس لئے آگے ہماری بحث کا موضوع زیادہ تر عنان ہی ہوگا، اسی لئے مفاوضہ کے بارے میں مزید تفصیل ذکر نہیں کی جائے گی۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں:
الكاساني، علاء الدين ابوبكر بن مسعود (۵۸۷ هـ) بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، بيروت، مؤسسة التاريخ العربي ۱۴۱۷ هـ، ايچ ايم سعيد كمپنی (۶: ۱۳۳) الربح بينهما على قدر الضمان فإن شرطا لأحدهما فضل ربح على حصته من الضمان فالشرط باطل ويكون الربح بينهما على قدر ضمانهما عن المشترى الخ (۶: ۶۵)

(۲) شرکت العنان:

دو یا زیادہ افراد اس طرح شریک ہوں کہ ہر ایک کا سرمایہ عمل، حقوق و نفع مساوی نہ ہوں اس میں ہر شریک دوسرے کا صرف وکیل ہوتا ہے کفیل نہیں ہوتا، مثال کے طور پر اگر زید اور عمر مل کر شرکت کریں اور زید ایک ہزار روپے کا سرمایہ لگائے اور عمر ڈیڑھ ہزار روپے کا سرمایہ لگائے اور منافع بھی اس تناسب سے طے کرلیں تو یہ شرکت عنان کہلائے گی۔ (۱)

شرکت المضاربۃ:

دو افراد کا اس طرح شرکت کرنا کہ ایک طرف سے مال ہو اور دوسرے کی طرف سے عمل اور نفع میں دونوں شریک ہوں، صاحب مال کو رب المال یا سرمایہ کار (Investor) کہتے ہیں، جبکہ عمل کرنے والے کو عامل اور مضارب کہتے ہیں، جو مال لگایا جاتا ہے وہ رأس المال (Capital) اور سرمایہ کہلاتا ہے، مثلاً زید اپنا سرمایہ بکر کو دے اور یہ کہے کہ تم اس سرمایہ سے تجارت کرو اور جو نفع حاصل ہو، اس کا نصف نصف ہم دونوں لیں گے، یہ شرکتِ مضاربت ہے، زید رب المال ہوگا، بکر مضارب اور سرمایہ رأس المال کہلائے گا۔ (۲)

فقہاء مالکیہؒ نے شرکت العقد کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں، البتہ بعض مالکیہؒ نے مضاربت کو بھی شرکت العقد میں داخل فرما کر کل چھ قسمیں بیان کی ہیں، شرکت عقد کی پانچ قسمیں یہ ہیں:

۱۔ شرکت مفاوضہ
۲۔ شرکت عنان
۳۔ شرکت وجوہ
٤۔ شرکت قبول
۵۔ شرکت مضاربہ

اس طرح بنیادی طور پر شرکت عقد کی کل پانچ قسمیں ہوئیں۔

(۱) ملاحظہ فرمائیں
الکاسانی، علاء الدین ابوبکر بن مسعود، ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، موسسۃ التاریخ العربی، ایچ ایم سعید کمپنی۔ (٦-٥٦)
(۲) دیکھئے
المرغینانی (برهان الدین ابو الحسن) علی بن عبد الجلیل أبو بکر الرشدانی، الهدایۃ، مکتبہ امدادیہ ملتان، المضاربۃ عقد یقع علی الشرکۃ بمال من احد الجانبین ومراده الشرکۃ فی الربح وهو یستحق بالمال من أحد الجانبین والعمل من الجانب الآخر و کا المضاربۃ بدونها، (۳: ۲۵۵)

عقد مضاربت مشروع ہونے کی حکمت:

عقد مضاربت مشروع ہوئی ہے لوگوں کی حاجت وضرورت کی بناء پر کیوں کہ تجارت کے معاملہ میں لوگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں، بعض مالدار ہوتے ہیں لیکن خرید وفروخت کے ذریعہ مال کو آگے بڑھانے، نفع کمانے کے طریقوں سے ناواقف ہوتے ہیں، جبکہ بعض لوگ فقیر ہوتے ہیں اگر چہ ان کی ملک میں مال نہیں ہے لیکن خرید وفروخت کے ذریعہ مال کمانے کے طریقوں سے واقف ہیں اب دونوں کے آپس میں معاملہ طے پایا جائے ایک کی طرف سے مال دوسرے کی طرف سے محنت وکوشش ہوگی تو دونوں کی ضرورتیں پوری ہوں گی۔

وروی عن ابن عباس رضی الله عنهما، كان يدفع ماله مضاربة ويشترط على مضاربه الا يسلك به بحرًا ، والا ينزل به واديا ، ولايشترى به ذات كبد رطبة ، أي المواشي لانها قد تهلك فان فعل ذالك ضمن ، فبلغ ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم فاستحسنه واجازه .

وبعث عليه الصلاة والسلام والناس يتعاملون به فاقرهم عليه ، وعن عمررضى الله عنه أنه دفع مال اليتيم مضاربة لينميه، وعليه الاجماع . (فقه المعاملات)

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے زمانہ میں لوگ مضاربت کا معاملہ کرتے تھے آپ نے منع نہیں فرمایا یہ مضاربت کے مشروع ہونے کی دلیل ہے نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ نے ایک یتیم کے مال کو مضاربت پر لگایا تھا تا کہ نفع حاصل ہو اور مضاربت کی مشروعیت پر اجماع بھی منعقد ہوا ہے۔

صحت مضاربت کی شرائط:

(۱) شرکت ومضاربت نقد میں یعنی، درہم ودنانیر (موجودہ زمانہ میں کرنسی نوٹوں کے ذریعہ) صحیح ہوگی، اس کے علاوہ جو اموال ہیں مثلاً گندم، کپڑے اور دیگر اشیاء ان کے ذریعہ صحیح نہیں ہوگی، الا یہ کہ مضارب کو مال دیکر وکیل بنادے کہ اس کو فروخت کر کے جو رقم بنے اس سے مضاربت شروع کریں، اس طرح صحیح ہوجائے گی۔

(۲) دونوں کی شرکت نفع میں ہو، یعنی یوں معاملہ طے کیا جائے کہ اس تجارت سے جو نفع حاصل ہوگا، اس کا آدھا یا تہائی یا چوتھا حصہ صاحب مال کا بقیہ مضارب کا، یعنی کسی ایک کے لئے نفع کا حصہ مقرر کردینا صحیح نہیں ہے کہ مثلاً ہر ماہ لاکھ پر دو ہزار صاحب مال کا ہوگا بقیہ مضارب کا چونکہ اس میں احتمال ہے کہ کل نفع ہی دو ہزار یا اس سے کم حاصل ہو تو مضارب کا بڑا نقصان ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ نفع کی تقسیم فیصد کے تناسب سے ہو۔

(۳) نفع ونقصان دونوں میں شرکت ہو یعنی اگر نفع ہوا تو طے شدہ شرط کے مطابق تقسیم کیا جائے گا اور اگر نقصان ہوا تو یہ رب المال یعنی (سرمایہ فراہم کرنے والا) کو پورا نقصان برداشت کرنا پڑے گا، باقی مضارب کو بھی اپنے عمل کا کوئی بدلہ نہیں ملے گا، اسطرح وہ بھی نقصان میں شریک ہوا۔

(٤) مال مکمل طور پر مضارب کے حوالے کرنا ضروری ہے تا کہ اس کو تجارت میں اختیار کلی حاصل ہو۔

(٥) مضارب کا حصۂ نفع متعین ہونا ضروری ہے (مثلاً نفع کا آدھا حصہ) اگر رأس المال میں شرکت کو ضروری قرار دیا جائے تو مضاربت فاسد ہو جائے گی۔

قال صاحب الهداية: ومن شرط المضاربة ان يكون الربح بينهما مشاعاً، اى غير محدود، لايستحق احدهما دراهم مسماة من الربح، لان ذلك يقطع الشركة بينهما، فان شرط زيادة عشرة فله اجر مثله لفساد الشركة فلعله لا يربح الاهذا القدر فتنقطع الشركة، اى تبطل والربح لرب المال لانه نماء ملكه، وللعامل، اى المضارب اجر المثل. (هداية: ٣/٢٢٦)

نفع کی مقدار متعین کرنے کی وجہ سے عقد شرکت فاسد ہو جاتا ہے؟

آج کے دور میں شرکت کی ایک صورت یہ بھی چل نکلی ہے کہ ایک چلتی دکان یا فیکٹری وغیرہ کا مالک اپنے رشتہ داروں یا جاننے والوں سے کہتا ہے کہ تم کاروبار میں اتنی رقم شامل کرو تو ہر مہینہ تمہیں اتنا فیصد نفع ملے گا، وہ رقم شامل کرتا ہے اور ہر ماہ اس کو نفع کی مقررہ مقدار مل جاتی ہے اس کو عام طور پر لوگ جائز کاروبار سمجھتے ہیں حالانکہ شرعی نقطہ نگاہ سے اس میں کئی خرابیاں ہیں۔

(۱) کسی بھی کاروبار میں سرمایہ پر نفع متعین کر کے دینا یہ قرض دے کر سود وصول کرنے کے حکم میں داخل ہے جو صریح حرام ہے۔

(۲) اس میں رقم شامل کرنے والا نقصان کی صورت میں نقصان برداشت نہیں کرتا، وہ دکاندار کے کھاتے میں ڈالدیا جاتا ہے، جبکہ شرعاً شرکت کے لئے ضروری ہے کہ نفع نقصان دونوں میں شرکت ہو، لہٰذا یہ شرکت فاسدہ ہوئی شرکت کی یہ صورت ناجائز ہے، لہٰذا اس سے اجتناب لازم ہے۔

وفی الدر المختار: کتاب الشرکۃ: وشرطها کون المعقود علیه قابلا للوکالة، فلاتصح فی مباح کاحتطاب وعدم ما یقطعها کشرط دراهم مسماة من الربح لاحدهما لانه قد لا یربح غیر المسمی وحکمها الشرکة فی الربح۔فی رد المحتار تحت قوله "وحکمها الشرکة "واشتراط الربح متفاوتاً عندنا صحیح فیما سیذکر۔

(ردالمحتار: ۳/۵۲)

اب یہاں سے شرکت کے بارے میں چند مسائل کو سوال و جواب کی صورت میں نقل کیا جاتا ہے تاکہ جزئیات سمجھنے میں آسانی ہو اور مسائل منقح ہو جائیں۔

شرکت و اجارہ دونوں جمع نہیں ہو سکتے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس بارہ میں کہ زید دوکان میں اپنے ساتھ شریک بکر، خالد، جعفر، امین ملا کر کل پانچ شریک قرار دیتا ہے جن میں زید اور بکر دو بڑے حصہ دار ہیں اور پچھلے تینوں چھوٹے چھوٹے حصہ والے ہیں اور چونکہ پچھلے تینوں شریک خالد، جعفر، امین کے حصوں کا نفع ان کے حق المحنت کو دیکھتے ہوئے ناکافی ہے اس لئے چاہتا ہے کہ بقدر حصہ نفع کے علاوہ خالد کو چار سو روپیہ ماہوار اور جعفر اور امین کو ڈھائی ڈھائی سو ماہوار دوکان سے دیا کرے تو آیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو کون سی صورت ایسی ہے جس میں ان کا حق المحنت پورا ان کو مل جایا کرے، درآن حالیکہ اس کے لئے ان کا حصہ بڑھا دینے کے بعد پھر گھٹانا زیادہ دشوار ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کی مذکورہ تنخواہوں میں حسب موقع کمی بیشی کی جایا کرے۔ بینوا توجروا

الجواب: صورت مذکورہ میں شریک کا اجیر ہونا لازم آتا ہے اور شرکت اور اجارہ جمع نہیں

ہو سکتے ،اس کی صورت جواز یہ ہے کہ اصل سرمایہ میں تو ان شرکاء کا حصہ نہ بڑھایا جائے مگر نفع میں بڑھایا جائے مثلاً جس شریک کا حصہ دوکان ۴/۱ ہے اس کا حصہ نفع میں ۳/۱ کر دیا جائے اور اس کے لئے تمام شرکاء کی رضا شرط ہے پھر اگر زیادت نفع بھی دواماً منظور نہ ہو تو اس کے لئے باہمی معاہدہ تحریری سے ایک میعاد مقرر کردی جائے کہ فلاں فلاں شرکاء کی حسن کارکردگی کی وجہ سے فلاں میعاد تک ان کا حصہ نفع میں بڑھایا جاتا ہے اور شرکت عنان میں رأس المال کی نسبت سے نفع کا زیادہ ہونا جائز ہے۔

ويجوز التفاضل في الربح مع تساويهما في رأس المال

(عالمگيرية : ۲ / ۳۱۰ ، مدة الاحكام : ۳ : ۳۱٤)

باقی شریک کو ملازم رکھنے کا جو مسئلہ مذکور ہے کہ اس کو ناجائز قرار دیا ہے ،اس بارے میں حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ شریک کو ملازم رکھنا جائز ہے، چنانچہ احسن الفتاویٰ (۳۲۱/۷) میں اس کی تفصیل موجود ہے جس کا خلاصہ ہم نے جلد اول میں نقل کیا ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

باپ بیٹوں کی مشترک آمدن کا حکم:

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ زید کے پانچ فرزند ہیں:

(۱) عمر (۲) خالد (۳) ولید (٤) فجر علی (٥) ولی احمد

اور تین اولاد نابالغ ہیں:

(۱) عبداللہ (۲) عبدالرحمٰن (۳) فاطمہ

زید نے اپنی ذاتی محنت سے ہزار روپیہ کے نقود واجناس واراضی کسب کئے پھر جب عمر، خالد وغیرہ ہوشیار اور قابل کسب ہوئے تو بہ معیت ان کے چار ہزار روپیہ کا مال کمایا ،غرض فی الحال زید کے پاس پانچ ہزار کا مال موجود ہے اور کاروبار زید کے ہاتھ میں ہے،اموال مشترکہ ہیں، کس نے کس قدر کسب کیا اور کہاں تک محنت کی؟ منضبط نہیں ہے اور نہ انضباط تحقیقی ہو سکتا ہے، ولید نے تقریباً آٹھ سال تک علم حاصل کیا، اس نے سب کے نقود مشترکہ میں سے بہت سے روپے خرچ کئے ، طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ تھوڑے عرصہ تک کسب معاش میں شریک رہے اور ولی احمد کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔

اب زید فرزندوں سے اور فرزند ہر ایک دوسرے سے جُدا ہونا چاہتے ہیں، پس تقسیم اموال ان میں کیسے ہوگی؟ آیا بقدر کسب بطور تخمین ہوگی یا جملہ اموال زید کا قرار دے کر فرزندوں کا اجر مثل دیا جائے گا اور ایام ماضیہ کا نان ونفقہ اجر مثل سے وضع ہوگا یا حکم مقاصہ کیا جائے گا، ولید کا کیا حکم ہے کہ اس نے زیادہ خرچ کیا، ولی احمد کی شادی کا خرچہ سب کے ذمہ پر ہے یا صرف باپ کے ذمہ ہوگی؟ نابالغ اولاد کو بھی حصہ ملے گا یا نہیں؟ نیز تحریر فرمائیں کہ تقسیم چار ہزار میں جاری ہوگی یا پانچ ہزار میں اور یہ بھی قلم بند فرمائیں کہ صورت مسئلہ میں اگر کاروبار کسی فرزند کے ہاتھ میں ہو تو کیا حکم ہے؟ بینوا بالکتاب تو جروا اجرًا جزیلًا عند الوهاب

الجواب: زید نے جو اپنے لڑکوں کو کاروبار میں اپنے ساتھ شریک کیا ہے تو اس کی صورت کیا تھی، آیا زید نے ہر بیٹے کو کچھ رقم سرمایہ ہبۃً دے دیا تھا، پھر وہ رقم یا سرمایہ کاروبار میں لگا کر لڑکا شریک تجارت ہوا یا باپ نے کسی بیٹے کو کچھ رقم ہبۃً نہیں دی، نہ سرمایہ دیا اور نہ بیٹوں کے پاس اپنی ذاتی رقم یا سرمایہ تھا جس کو کاروبار میں ملا کر وہ شریک ہوئے ہوں بلکہ بیٹے ولید ہی بدون رقم دیئے کام کرنے لگے اور اس شرکت سے کام کو ترقی ہوئی، پس صورت اولیٰ میں تو یہ البتہ شرکت ہے اور ہر شخص اپنی رقم وسرمایہ کی نسبت سے اسوقت اصل نفع میں مستحق ہوگا اور صورت ثانی میں یہ شرکت ہی نہیں بلکہ کل سرمایہ زید کی ملکیت ہے اور سب لڑکے اس کے معین شمار ہوں گے اور جس لڑکے پر زیادہ خرچ ہوا اس صورت میں وہ سب باپ ہی کا خرچ ہوا اس سے زیادہ کے رجوع کا حق کسی کو بھی نہیں، نیز اولاد کو اپنے سے علیحدہ کرنے کے لئے زید کو اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ اس سرمایہ کو ان میں تقسیم کرے بلکہ اولاد بالغین کو بدوں کچھ سرمایہ دیئے بھی الگ کرسکتا ہے اور اگر ان کو کچھ سرمایہ دے کر الگ کرے تو یہ اچھا ہے اور اس صورت میں سب کو برابر سرمایہ دے اور نابالغوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے، بلوغ سے پہلے ان کو الگ نہیں کرسکتا۔

قال فی الحامدیة اب وابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیءٌ ثم اجتمع لهما مال یکون کله للاب اذا کان الابن فی عیاله واجاب خیر الرملی عن سوال اخر بقوله حیث کان من جملة عیاله والمعینین لهٗ فی اموره واحواله فجمیع ماحصله بکره وتعبه فهو ملکٌ خاص لابیه لاشئی لهٗ فیه حیث لم یکن لهٗ مالٌ لو اجتمع لهٗ

بالکسب جملة اموال لانهٔ فی ذلك لابیه معین اهـ . (۱۸/۲)

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں باپ اور بیٹوں کے مشترک کاروبار کی صورت میں تمام ملک باپ کی شمار ہوتی ہے، لہٰذا باپ اپنی زندگی میں جو تصرف چاہے کرسکتا ہے، باپ کے انتقال کے بعد تمام ورثاء میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه: معزیا الی القنية: والاب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهماشئی فالکسب کل للاب ان الابن فی عیاله لکونه معینا له الاتریٰ لو غرس شجرة تکون للاب (الیٰ أن قال) وفی الخانیة زوج بنیه الخمسة فی داره وکلهم فی عیاله واختلفوا فی المتاع فهو للاب وللبنین الثیاب التی علیهم لاغیر. (ردالمحتار: ۳۶۰/۳، أحسن الفتاویٰ: ۳۹۳/۶)

تقسیم ترکہ سے قبل ایک وارث کا ترکہ سے تجارت کرنا:

سوال: وراثت کا روپیہ قبل تقسیم ہونے کے کسی شریک نے بلا اطلاع دوسرے شریک کے کسی کو مضاربت پر دے دیا اور مضاربت صحیح ہوئی یا نہیں اور جو نفع ہوا ہے مضارب اس میں سے نصف نفع مقررہ لینے کا مستحق ہے یا نہیں؟

الجواب: جس شریک نے مضاربت پر روپیہ دیا ہے نفع مقررہ اس کی ملک تو ہوگیا لیکن اس میں سے فقط اپنے حصہ وراثت کے مطابق اسکو حلال ہے اور باقی نفع خبیث ہے، اس لئے دوسرے ورثاء کو بقدر ان کے حصص کے دے دے یا محتاجوں کو دے دے۔

کما فی عالمگیریه: لو تصرف احد الورثة فی الترکة المشترکة وربح فالربح کلهٗ للمتصرف وحدهٗ کذا فی الغیاثیة وفیه ایضاً بعد اسطر سئل ابوبکر عن شریکین جُن احدهما وعمل الآخر بالمال حتی ربح او وضع قال الشرکة بینهما قائمة الی ان یتم اطباق الجنون علیه فاذا قضی ذلك یتفسخ الشرکة بینهما فاذا عمل بالمال بعد ذالك فالربح کله للعامل والوضیعة علیه وهو کالغصب بمال المجنون فیطیب لهٗ من الربح حصّة ماله ولایطیب لهٗ من مال

المجنون فیتصدّق به کذا فی المحیط قال الشامی : وفی القهستانی وله ان یؤدیه الی المالك ویحل له التناول لزوال الخبث. (١٨٤/٥)

اور مضارب کے لئے بھی یہی حکم ہوگا کہ کل نفع مقررہ اس کی ملک ہے لیکن جس شریک نے اس سے عقد مضاربت کیا ہے اس کے حصہ کے موافق حلال ہے اور زائد حلال نہیں بلکہ وہ دوسرے شرکاء کو دے دے یا فقراء کو دے دے۔

وهذا هو مقتضی القواعد ولم ارهٗ صریحًا، واللّٰه اعلم.

(إمداد الاحکام : ٣١٩/٣)

نابالغ کے ساتھ مشترک مصارف:

سوال : مرحوم کی بیوہ کے نام کچھ رقم پینشن دس سال کے لئے منظور ہوئی ہے اور چھبیس روپے ماہوار ملنے بھی شروع ہو گئے ہیں۔

اسی طرح دوسرے امدادی فنڈ سے سولہ روپے ماہوار بچوں کے بلوغ تک کے لئے منظور ہوئے ہیں، جو ملنے شروع ہو گئے ہیں۔

بیوہ اور چاروں بچے جن میں سے دو بالغ ہیں سب اکھٹے ساتھ رہتے ہیں اور اکھٹے کھاتے پیتے ہیں، اس رقم کو مجموعہ خرچ میں صرف کریں یا علیحدہ کر کے اخراجات کا حساب رکھیں؟

بینوا توجروا

جواب : جو رقم نابالغوں کے لئے منظور ہوئی ہے اس میں سے بالغوں پر خرچ کرنا جائز نہیں ،صرف نابالغوں کے مصارف میں خرچ کی جائے ،البتہ کھانے پینے میں سب کا حساب مشترک رکھ سکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم (أحسن الفتاوی : ٤٠٢/٦)

بالغ ونابالغ ورثاء کی مشترکہ جائیداد میں تصرف کا حکم:

سوال : حضرت میرے سسر صاحب نے چھ وارث چھوڑ کر انتقال کیا ان میں سے ایک میری ساس صاحبہ پانچ میں سے دو بالغ ایک میری بیوی اور ایک میرا سالا اور تین نابالغ ہیں، اب عرض یہ ہے کہ اگر وہ مال شرکت میں رہے تو بالغ کی اجازت سے اس میں سے ہمارا کھانا از روئے فتوی کیسا ہے؟ دیگر عرض یہ ہے کہ اگر بالغ ونابالغ مل کے دستکاری سے کوئی مال کھاویں اس حال میں کہ ابتک وہ مال تقسیم بھی نہیں ہوا اور بالغ نے کھانا کھلانا چاہا تو اس کے کھانے میں کیا حکم ہے؟

الجواب: قال فی الهداية فشركة الاملاك العين يرثها رجلان ويشتريانها فلايجوز لاحدهما أن يتصرف في نصيب الآخر الا باذنه وكل واحد منهما في نصيب صاحبه كالاجنبي اه.

وفي الحاشية عن الظهيرية ان شركة اذا كانت بينهما من الابتداء بأن اشتريا حنطةً اوورثاها كانت كل حبةٍ مشتركة بينهما اه. (٣/ ٦٠٤)

ترکہ مشترکہ میں اگر ورثاء سب بالغ ہوں تب تو ایک وارث دوسروں کی اجازت سے اس میں تنہا تصرف کرسکتا ہے اور اگر نابالغ بھی ہوں تو اس وقت کوئی بھی بدون تقسیم ترکہ کے اس میں تصرف نہیں کرسکتا، کیوں کہ نابالغ کا اذن معتبر نہیں، پس صورتِ مسئلہ مسئولہ میں ترکہ غیر منقسمہ سے سائل کا یا کسی اور کا کھانا جائز نہیں اور یہی حکم کسب مشترک کا ہے۔ واللہ اعلم

(امداد الاحکام: ٣/ ٣٢١)

شرکت مع مضاربت جائز ہے:

سوال: زید و عمر میں یہ طے پایا کہ دونوں کاروبار میں برابر سرمایہ لگائیں گے، عمر چونکہ کام بھی کریگا لہٰذا کام کے عوض نصف ربح عمر کا ہوگا اور باقی نصف اصل سرمایہ کے مطابق دونوں میں برابر تقسیم ہوگا، یہ طریقہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کیا یہ صفقہ فی صفقۃ یا عقد بشرط میں داخل نہیں؟ بینوا توجروا

جواب: شرکت میں عمل من الجانبین شرط ہے جو یہاں مفقود ہے اس لئے یہ شرکت نہیں مضاربت ہے، پھر اگر رب المال کی طرف سے مال لگانا درجہ شرط میں نہ ہو تو کوئی اشکال نہیں اور اگر مشروط ہو تو بھی مضاربت و شرکت میں ملایمت کی وجہ سے جائز ہے، چونکہ اس صورت میں مضاربت اصل ہے اور شرکت بالتبع، اس لئے عمل من الجانبین کی شرط مرتفع ہوگئی۔

اسی طرح اشتراط العمل من الجانبین کے ساتھ تفاضل فی الربح بھی اسی لئے جائز ہے کہ یہ صورت اولیٰ کے برعکس اصل میں شرکت ہے اور مضاربت بالتبع، اسلئے اشتراط العمل علی الجانبین مضر نہیں۔

قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ في الشركة: وفي النهر اعلم

انهما اذا شرطا العمل عليهما ان تساويا مالاً وتفاوتا ربحاً جاز عند علمائنا الثلاثة رحمهم اللّٰه تعالىٰ خلافا لزفر رحمه اللّٰه تعالىٰ والربح بينهما على ما شرطا وان عمل احدهما فقط وان شرطاه على احدهما فان شرطا الربح بينهما بقدر رأس مالهما جاز ويكون مال الذى لا عمل له بضاعة عند العامل له ربحه وعليه وضيعته وان شرطا الربح للعامل اكثر من رأس ماله جاز ايضًا على الشرط ويكون مال الدافع عند العامل مضاربة ولو شرطا الربح للدافع اكثرمن رأس ماله لا يصح الشرط ويكون مال الدافع عند العامل بضاعة لكل واحد منهما ربح ماله والوضيعة بينهما على قدر رأس مالهما ابداهذا حاصل ما فى العناية اهـ مافى النهر ، قلت وحاصل ذلك كله انه اذا تفاضلا فى الربح فان شرطا العمل عليهما سوية جاز ولو تبرع احدهما بالعمل وكذا لو شرطا العمل على احدهما وكان الربح للعامل بقدر رأس ماله او اكثر ولو كان الاكثر لغير العامل او لا قلهما عملا لا يصح وله ربح ماله فقط، هذا اذا كان العمل مشروطا الخ .

(ردالمحتار : ۳/ ۳۵۱)

مضارب بغیر کوئی وصیت کئے فوت ہو جائے تو مال کی حفاظت اور ضمان کا حکم:

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمر سے بطور مضاربت روپیہ لے کر تجارت میں لگایا، اتنے میں اس کا یعنی زید کا انتقال ہو گیا اور مرتے وقت کسی قسم کی وصیت نہیں کی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ مال تجارت کس کا حق ہے اور اس کی حفاظت کس کے ذمہ ہے؟ رب المال کے یا مضارب کے؟ اور اگر وہ مال تجارت اتفاق سے ضائع ہو جائے تو نقصان کس کا سمجھا جائے گا اور آیا اس روپیہ کی بابت وارثان زید پر عمر کو کسی قسم کا جبر کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب : فى العالمگيرية : (۵/ ۲۰۰) وان كانت المضاربة حين مات المضارب عروضًا او دنانير (اى وكان رأس المال دراهم)

فأراد رب المال أن يبيعها مرابحة ولم يكن له ذلك والذي يلي بيعها وصي المضارب فان لم يكن له وصي جعل القاضي له وصيا يبيعها فيوفي رب المال رأس ماله وحصته من لربح ويعطي حصة المضارب من الربح غير ماده وقال في المضاربة الصغيرة يبيعها وصي الميت ورب المال وما ذكر هنا اصح كذا في المبسوط .

اس سے معلوم ہوا کہ اصح یہ ہے کہ وصی المضارب نہ ہونے کی صورت میں یا تو قاضی اس کی جانب سے وصی مقرر کردے جو مال فروخت کرکے رأس المال اور نفع میں سے مضارب کو دیدے یا رب المال بدون مرابحہ اس مال کو فروخت کرکے سرمایہ وصول کرلے اور جو چیز اتفاقاً کم ہوگئی ہے اس کا ضمان واجب نہیں، اگر تعدی سے نقصان ہوا ہو تو تعدی کرنے والے پر ضمان ہے۔

واللہ اعلم

مضاربت میں کل نقصان رب المال کے ذمہ ہوگا مضارب کے ذمہ کچھ نہیں:

سوال: زید نے بکر کو روپیہ دیا، بکر کام کرنے والا ہے، اور زید صرف روپیہ دینے والا ہے اور ان دونوں میں منافع میں یہ شرط قرار پائی ہے کہ زید ایک حصہ منافع لے اور بکر دو حصے اسی طرح نقصان میں بھی زید ایک حصہ نقصان اُٹھائے اور بکر دو حصے، کیا یہ طریق معاملہ شرعاً درست ہے اس کا منافع سود ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورت مذکورہ میں عقد مضاربت صحیح ہے لیکن کل نقصان فقط روپیہ والے کے ذمہ ہوگا (مضارب) کام کرنے والے کے ذمہ اس میں سے کچھ نہ ہوگا۔

كما في الدّر: في الحلالية كل شرط يوجب جهالة في الربح او يقطع الشركة فيه يفسدها والا بطل الشرط وصح العقداعتباراً بالوكالة وفي رد المحتار (قوله بطل الشرط) كشرط الخسران على المضارب . (٤/٧٤٢) والله اعلم

مشترک جائیداد کی تقسیم کی ایک صورت کا حکم:

سوال: زمینداروں نے باخور باجائیدا تقسیم کرلی اور ہرایک بقدر اپنے حصہ کے قابض ہوگیا اس کو خانگی تقسیم کہتے ہیں، چند دنوں کے بعد سرکاری طور پر بٹوارہ کرنے کی کسی نے درخواست

دیدی جس کو سرکاری بٹوارہ کہتے ہیں اور امین بٹوارہ نے آکر تقسیم شروع کی اس میں بعض نے امین کو رشوت دے کر دوسرے شخص کی عمدہ زمین یا درخت یا آسامی اپنے نام لکھوالیا اور اپنی خراب زمین وغیرہ اسی قدر اس کے نام کروادیا، اب سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا کیا جائے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ مورث نے ایسا کیا ہو اور ورثاء کو اصلی مالک کا پتہ بھی نہ ہو؟

الجواب: ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں کیوں کہ تقسیم میں مساوات لازم ہے مقدار میں بھی، کیفیت میں بھی، اگر مورث نے ایسا کیا ہو تو وارث کو چاہئے کہ اپنی اصل زمین لے لے اور دوسرے کی واپس کردے باقی اس کے مورث نے جو گناہ کیا اس کا یہ ذمہ دار نہیں اور اگر دوسرا شخص کچھ رقم بطور تاوان کے لے کر اسی سرکاری بٹوارہ پر راضی ہو جائے تو اس کو اسی طرح یا کسی اور طرح راضی کرلیا جائے، الغرض دوسرے کی چیز پر بدون اس کی رضامندی کے قبضہ درست نہیں اور امین کی تبدیل قسمت پر طرفین اس شرط پر راضی تھے کہ اس کو رشوت دے کر فیصلہ نہ کرایا جائے جب اس کے خلاف کیا گیا تو تبدیل رضاء سے نہ ہوئی بلکہ غصباً ہوئی۔ واللہ اعلم

بھائیوں کی مشترکہ کمائی سے منتظم بھائی نے مشترکہ جائیداد خریدی تو کیا سب میں برابر تقسیم ہوگی؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین صورت ذیل میں، تین بھائی ہیں ان کے معاملات سب مشترک ہیں، جائیداد، مکانات، کھانا پینا اور سب اشیاء مشترک ہیں ان میں دو بھائی برسر روزگار ہیں اور ایک بیروزگار ہے اور گھر پر رہتا ہے اور گھر کا اور جائیداد کا انتظام سب اس کے ہاتھ میں ہے، باپ بھی ان کا اپنے روزگار سے روپیہ حاصل کرتا ہے اور یہ دونوں بھائی بھی حاصل کرتے ہیں، یہ سب روپیہ منتظم بھائی کے ہاتھ سے گھر کی ضروریات میں علی سبیل الاشتراک خرچ ہوتا ہے، اور اس مشترکہ آمدنی سے منتظم بھائی نے باپ سے مشورے کے بعد کچھ جائیداد خریدی کئی سال کے بعد اس منتظم بھائی کا لڑکا برسر روزگار ہو جاتا ہے اور اس کے روزگار سے اس کو زیادہ روپیہ حاصل ہوا وہ روپیہ بھی اسی طرح علی سبیل الاشتراک خانگی ضروریات میں خرچ ہوتا رہا اور اس سے بھی منتظم بھائی نے جائیداد علی سبیل الاشتراک خریدی، اس کے روزگار ملنے کے دو تین سال بعد باپ کا انتقال ہو گیا، انتقال کے بعد بھی ان تینوں بھائیوں کے معاملات مشترک رہے، باپ کے مرنے کے بعد بھی منتظم

بھائی نے کچھ جائیداد اور خریدی جس میں منتظم بھائی کے لڑکے کا روپیہ زیادہ خرچ ہوا اور باقی دونوں بھائیوں کا کم مگر یہ جائیداد بھی علی سبیل الاشتراک خریدی گئی، اجمالاً اتنا معلوم ہوا کہ ان دونوں بھائیوں کا روپیہ جائیداد کے خریدنے پر کم خرچ ہوا اور منتظم بھائی کے لڑکے کا حاصل کردہ روپیہ جائیداد پر زیادہ خرچ ہوا، تفصیل معلوم نہیں، اب یہ تینوں بھائی جائیداد کی تقسیم کرنا چاہتے ہیں، شریعت اور فقہ حنفی کے مطابق یہ جائیداد تینوں بھائیوں میں علی السویہ اور برابر تقسیم ہوگی یا منتظم بھائی کو زیادہ حصہ ملے گا؟ اور کتنا زیادہ؟ کیوں کہ اس کے لڑکے کا جائیداد خریدنے پر زیادہ روپیہ خرچ ہوا اور اگر کسی صورت سے معلوم ہو جائے کہ منتظم بھائی کے لڑکے کا روپیہ جائیداد کے خریدنے پر اتنا خرچ ہوا اور دونوں بھائیوں کا اتنا تو اس صورت میں یہ جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟ تینوں بھائیوں کو شرعاً مساوی حصہ ملے گا یا منتظم بھائی کو زیادہ؟ غرض دونوں صورتوں کا حکم مفصل تحریر فرمایا جائے یہاں لوگوں کا رواج تو یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں تقسیم علی السویہ ہوتی ہے، یہ نہیں کہ کسی کو زیادہ اور کسی کو کم حصہ ملے۔

الجواب: سئل فی اخوة خمسة تلقوا ترکة عن ابیھم فأخذوا فی الاکتساب والعمل فیھا جملةً کل علی قدر استطاعة فی مدّة معلومة فحصل الربح فی المدّة فھل تکون الشرکة وماحصلوا بالاکتساب بینھم سویة وان اختلفوا فی العمل والرأی کثرة وصواباً، الجواب نعم اذکل واحد یعمل لنفسه ولاخوته علی وجه الشرکة واجاب خیر الرملی بقوله ھو بینھم علی السویة حیث لا یمیز کسب ھذا من کسب ھذا ولا یختص احدھما به ولا بزیادة علی الآخر اذالتفاوت ساقط نملتقط السنامل، اذا خلطا ما التقطا الاخرما قال واطال الخ: وافادو اجاد . ۱/۹۲ من تنقیح الفتاویٰ الحامدیة .

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ صورت مسئولہ میں یہ جائیداد تینوں بھائیوں میں بحصہ مساوی تقسیم ہوگی جبکہ ہر بھائی نے اپنی کمائی کو دوسرے کے ساتھ مخلوط رکھا، ممتاز نہیں کیا اور سب کا خرچ وغیرہ مشترک ہی چلتا رہا ہے تو اب تفاوت کو ساقط کیا جائے گا اور سب کو بحصہ مساوی شریک سمجھا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

(ماخوذ از امداد الاحکام: جـ ۳)

ہر شریک کو شرکت ختم کرنے کا اختیار ہے:

سوال : زید نے چند دوسرے شرکاء کے ساتھ مل کر مشترک کاروبار کے لئے ایک دکان خریدی ان کے ساتھ عمرو نے بھی شرکت کی خواہش ظاہر کی تو اسے اس شرط پر شریک کرلیا گیا کہ وہ حسب معمول تعلیم قرآن کی خدمت میں مشغول رہے گا اور کاروبار میں کسی قسم کا دخل نہ رکھے گا، نیز یہ بھی طے پایا کہ زید کام زیادہ کرے گا، اس لئے منافع میں اس کا حصہ بھی زیادہ ہوگا یعنی چالیس فی صد نفع زید کے لئے اور ساٹھ فیصد بقیہ شرکاء کے لئے، کچھ عرصہ گزرنے کے بعد شرکاء زید کی خیانت پر مطلع ہوئے، اس لئے وہ اسے شرکت سے الگ کرنا چاہتے ہیں، کیا شرعاً وہ اس کے مجاز ہیں؟ نیز زید کا مطالبہ ہے کہ الگ ہونے کی صورت میں دکان کی موجودہ قیمت لگا کر اسے اس کا حصہ دیا جائے، اس لئے کہ دکان کی موجودہ قیمت پہلے سے زیادہ ہے، کیا زید کا یہ مطالبہ درست ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ہر شریک کو ہر وقت اختیار ہے کہ دوسرے شرکاء کی رضامندی کے بغیر جب چاہے شرکت کو ختم کردے، اس صورت میں اشیاء مشترکہ کی قیمت لگا کر اصل بقدر حصہ اور منافع حسب شرط تقسیم کرلیں۔

اگر کوئی چیز لینے میں ہر شریک خواہش مند ہو تو بصورت نیلام جو شریک زیادہ قیمت پر خریدنے کو آمادہ ہو اسے دیدی جائے۔

لہٰذا شرکاء کا زید کی شرکت کو ختم کردینا صحیح ہے خواہ اس کی کوئی معقول وجہ ہو یا نہ ہو، البتہ زید دکان کی موجودہ قیمت سے اپنے حصہ کا مستحق ہے اور اگر تمام شرکاء سے زیادہ قیمت دیکر دکان خود رکھنا چاہے تو زید کو اس کا بھی اختیار ہے جیسا کہ دوسرے ہر شریک کو بھی یہ اختیار ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : وفي البحر عن البزازية اشتركا واشتريا امتعة ثم قال احدهما لا اعمل معك بالشركة وغاب فباع الحاضر الامتعة فالحاصل للبائع وعليه قيمة المتاع لان قوله لا اعمل معك فسخ للشركة معه واحدهما يملك فسخها وان كان المال عروضا بخلاف المضاربة هو المختار اهـ . (ردالمحتار: ٣/ ٣٦٣)

بلااذن شریک تصرف جائز نہیں:

سوال : عنایت اللہ اور علی محمد دونوں نے پینتیس (۳۵) ہزار میں گاڑی خریدی جس میں سے سولہ (۱۶) ہزار روپے نقد ادا کئے اور انیس (۱۹) ہزار ایک مدت معینہ تک اُدھار رہے، دو تین مہینے کے بعد علی محمد ایران چلا گیا جب روپیہ دینے کا وقت مقرر آیا تو عنایت اللہ کے پاس پیسے نہیں تھے، قرض خواہ نے عنایت اللہ کو مجبور کیا کہ روپیہ اداء کرو ورنہ گاڑی پر قبضہ کرلوں گا، مجبور ہو کر عنایت اللہ نے گاڑی تیس (۳۰) ہزار میں فروخت کردی، چند دن کے بعد علی محمد بھی آگیا اور اعتراض کیا کہ تم نے پانچ ہزار کے نقصان پر گاڑی کیوں دی؟ عنایت اللہ نے اپنا مدعا عذر پیش کیا مالک نے بہت تنگ کیا آخر میں کیا کرتا؟ اب یہ بیع ہوئی یا نہیں اور نقصان کس پر آئے گا؟

بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

صرف عنایت اللہ کے حصہ کی بیع صحیح ہے، گاڑی علی محمد اور خریدار کے درمیان مشترک ہے، اگر خریدار اشتراک پر راضی نہیں تو وہ بیع کو فسخ کر کے گاڑی واپس کرسکتا ہے۔

قال فی شرح التنویر: نحو حمام وطاحون وعبد ودابة حیث یصح بیع حصته اتفاقاً اھ. (ردالمحتار: ۳/۳٤٦)

مشترک مکان کی بلااجازت مرمت:

سوال : زید کی تحویل میں اس کے مرحوم والد کا متروکہ ایک مکان ہے جو ہنوز ورثا میں تقسیم نہیں ہوا۔ مکان کے ایک حصہ سے جو کرایہ حاصل ہوا وہ زید نے تمام ورثا کا حق سمجھتے ہوئے بطور امانت رکھا تاوقتیکہ شرعی تقسیم ہوجائے، اسی اثناء میں مکان کا ایک حصہ بوسیدہ ہونے کی وجہ سے قابلِ مرمت ہوگیا، مکان کی شرعی تقسیم میں دفتری کارروائی کی وجہ سے تاخیر ہورہی ہے، زید کے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ وہ مکان کے اس حصہ کی مرمت وغیرہ کروالے۔

کیا اس صورت میں کرایہ سے حاصل شدہ رقم جو زید کے پاس امانت ہے اس سے مکان کی مرمت کروائی جاسکتی ہے؟ اگر مکان کی مرمت نہیں کروائی جاتی تو بوقتِ فروخت مکان کی پوری قیمت وصول نہ ہوگی۔

نیز یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ اگر اس رقم میں سے مرمت کروائی جاسکتی ہے تو دوسرے ورثہ سے

اس رقم کے خرچ کرنے کی اجازت لینی پڑے گی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اگر مکان ورثہ میں قابلِ تقسیم ہے تو کرایہ کی مشترک رقم خرچ کرنے کے لئے دوسرے شرکاء سے اجازت لینا ضروری نہیں۔

اور اگر مکان قابلِ تقسیم نہیں یعنی تقسیم کی صورت میں ناقابلِ انتفاع ہوجاتا ہے تو دوسرے شرکاء سے مرمت پر خرچ کرنے کی اجازت لینا ضروری ہے، اگر وہ اجازت نہ دیں تو حاکم کو درخواست دیکر انہیں مرمت پر مجبور کرسکتے ہیں، اگر حاکم سے اس کی اُمید نہ ہو تو بدون اجازت شرکاء بھی مرمت پر ان کی رقوم خرچ کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لانه صار مضطرا الى المرمة كالمشترك الذى يقبل القسمة .

قال العلائى رحمه الله تعالىٰ : والضابط ان كل من اجبران يفعل مع شريكه اذا فعله احدهما بلااذن فهو متطوع والا لا، ولا يجبر الشريك على العمارة الا فى ثلاث وصى وناظروضرورة تعذر قسمة ككرى نهر ومرمة وقناة وبئر ودولاب وسفينة معيبة وحائط لايقسم اساسه فان كان الحائط يحتمل القسمة ويبنى كل واحد فى نصيبه السترة لم يجبر والا اجبر وكذا كل مالا يقسم كحمام وخان وطاحون وتمامه فى متفرقات قضاء البحر والعينى والاشباه .

(ردالمحتار : ۳/۳٦٥ ، ماخوذ از احسن الفتاوىٰ : ٦/٤٠١)

مشترک زمین میں بلا اجازت شریک پودے لگادیئے:

سوال : دو آدمی ایک زمین میں شریک ہیں ایک شریک نے کھجور کے پودے مشترک زمین میں لگادیئے۔

چند سال بعد جب پودے پھل دینے لگے تو شریک نے کہا کہ چونکہ میں نے پودے لگائے ہیں اس لئے میں شریک ثانی کو حصہ نہیں دیتا۔

شریک ثانی کہتا ہے کہ چونکہ آپ نے زمین مشترک میں بلا اجازت پودے لگائے ہیں اس لئے یہ پودے بھی تقسیم کئے جائیں گے، اب اس صورت میں کیا فیصلہ ہوگا؟

واضح رہے کہ ہمارے دیار میں یہ عرف ہے کہ کھجور کے پودے لگانے والے کو نصف درخت ملا کرتا ہے لیکن یہ نصف اس وقت ملا کرتا ہے جب مالک زمین کی اجازت صراحۃً یا دلالۃً موجود ہو؟ بینوا توجروا

جواب: یہ زمین دونوں میں تقسیم کی جائے گی، پودے لگانے والے کے حصہ میں اس کے پودے برقرار رہیں گے، اور دوسرے شریک کے حصہ سے پودے لگانے والا اپنے پودے اکھاڑ لے اور پودے اکھاڑنے سے زمین میں جو نقص واقع ہو وہ اس کے مالک کو ادا کرے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: ارض بينهما زرع احدهما كلها تقسم الارض بينهما فما وقع فى نصيبه اقر وما وقع فى نصيب شريكه امر بقلعه وضمن نقصان الارض هذا اذا لم يدرك الزرع فلو ادرك او قرب يغرم الزارع لشريكه نقصان نصفه لو انتقصت لانه غاصب فى نصيب شريكه. (ردالمحتار: ٣/٣٤٦)

اگر پودے اکھاڑنے سے زمین کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہو تو زمین کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ اپنے حصے میں لگے ہوئے پودوں کی قیمت ادا کر کے ان کا مالک بن جائے قیمت ایسے پودوں کی لگائی جائے گی جو واجب ہوں اور جن کو اکھاڑنا لازم ہو۔

قال فى التنوير: ومن بنى او غرس فى ارض غيره بغير اذنه امر بالقلع والرد وللمالك ان يضمن له قيمة بناء او شجر امر بقعله ان نقصت الارض به.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: (قوله ان نقصت الارض به) اى نقصانا فاحشا بحيث يفسدها اما لو نقصها قليلا فيأخذ ارضه ويقلع الاشجار ويضمن النقصان سائحانى عن المقدسى. (ردالمحتار: ٥/١٣٧)

شرکت میں تعیینِ نفع کا اُصول:

سوال: دو شخصوں نے مل کر ایک کتاب چھاپی، ان میں سے ایک اس کتاب کو فروخت کرتا ہے اور جو کچھ نفع ہوتا ہے اس کو بحصہ مساوی یا کم وبیش جیسا کہ طے ہو جائے آپس میں تقسیم

کر لیتے ہیں، کیا اس قسم کی شرکت شرعاً جائز ہے؟ بینوا توجروا

جواب: جائز ہے، البتہ اگر عقد میں پورا یا اکثر کام ایک شریک کے ذمہ مشروط ہو تو دوسرے شریک کے لئے اس کے حصۂ رأس المال سے زیادہ نفع کی شرط جائز نہیں، اگر نفس عقد میں یہ شرط نہ ہو بلکہ تبرعاً کام کر رہا ہو تو کام نہ کرنے والے کیلئے بھی زیادہ نفع کی شرط جائز ہے۔

کمپنی کی شرعی حیثیت:

کمپنی کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کے لئے ایک مدلل مضمون مولانا عمران اشرف کی کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے چنانچہ مولانا لکھتے ہیں کہ:

جہاں تک پہلی بحث کا تعلق ہے تو اتنی بات تو گذشتہ صفحات میں شرکت اور کمپنی کی تعریفات واقسام اور ان کے درمیان فرق کے بیان میں واضح ہوتی ہے کہ کمپنی کی جو خصوصیات سامنے آئی ہیں ان کے لحاظ سے کمپنی شرکت کی معروف اقسام میں سے کسی میں داخل نہیں ہے، فقہاء کرام نے شرکت کی پانچ قسمیں ذکر فرمائی ہیں، اگر مضاربت کو اس میں شامل کر لیا جائے تو چھ قسمیں بن جاتی ہیں، کمپنی کا یہ نظام ان پانچوں میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں ہے، لہذا کمپنی کا کیا حکم ہے؟ آیا اسے شرکت کی روایتی اقسام میں بظاہر داخل نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیا جائے یا اسے شرکت کی کسی روایتی قسم میں شامل مان کر یا شرکت کی نئی قسم قرار دیکر جائز کہا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلے میں اگر تمام آراء کو جمع کیا جائے تو تین قسم کے نقطہ ہائے نظر بنتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ شرکت شرعاً صرف روایتی پانچ قسموں یعنی شرکت الاموال، شرکت الاعمال، شرکت الوجوہ، شرکت المفاوضہ، شرکت العنان میں منحصر ہے، اور اگر مضاربت کو بھی اس میں داخل مانا جائے تو چھ قسمیں ہو جاتی ہیں اور کمپنی ان مذکورہ اقسام میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں ہے لہذا یہ ناجائز ہے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ کمپنی ان قسموں میں داخل نہیں ہے اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ فقہاء کرام نے جو اقسام ذکر فرمائی ہیں وہ منصوص نہیں ہیں، بلکہ فقہائے کرام نے اپنے دور میں شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے اس کی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے،

اور پھر کسی نص میں یا فقہاء کے کلام میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ جو صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو وہ ناجائز ہوگی لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی۔

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کمپنی شرکت کی کسی ایک قسم میں داخل ہے، پھر اس میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ شرکتِ عنان میں داخل ہے اور بعض کا خیال ہے کہ یہ مضاربہ کی ایک شکل ہے۔

اب ذیل میں مذکورہ بالا تینوں نقطہ نظر علیحدہ علیحدہ دلائل کے ساتھ ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلا نقطہ نظر:

کمپنی کے عقد کے بارے میں پہلا نقطہ نظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ شرکت شرعی لحاظ سے صرف روایتی پانچ قسموں یعنی شرکت الاموال، شرکت الاعمال، شرکت الوجوہ، شرکت المفاوضہ، شرکت العنان، میں منحصر ہے، اور اگر مضاربت کو بھی اس میں شامل مانا جائے تو چھ قسمیں بن جاتی ہیں، جبکہ کمپنی کا عقد، مذکورہ بالا کسی قسم پر پورا نہیں اترتا، لہٰذا یہ ناجائز ہے، یہ نظریہ شیخ تقی الدین النبہانی کا ہے، ان کی رائے کے مطابق کمپنی کا عقد شرکت کی کسی بھی روایتی یا معروف اقسام میں داخل نہیں ہے، بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا پیدا کردہ ایک کاروباری طریقہ ہے، لہٰذا اسے اسلامی شرکت کے کسی طریقے پر منطبق کر کے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (۱)

ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ کی رائے بھی کسی حد تک ان کے مماثل ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

لا علم لنا بأن الفقه الاسلامی یعترف بهذا النوع من الشرکات.

یعنی ہمارے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ اسلامی فقہ شرکت (کمپنی) کی اس قسم کا اعتراف اور اعتبار کرتی ہو۔ (۲)

ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ نے اگرچہ صراحۃً اسے حرام تو نہیں کہا ہے البتہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اسلام میں کسی نے اسے حلال قرار دیا ہے، اور بعض وجوہ کی بناء پر یہ شرکت کی معروف اقسام پر منطبق بھی نہیں ہو سکتا۔ (۳)

---

(۱) النبهانی، الشیخ تقی الدین، الشرکات فی الفقه الاسلامی (۱۳۳) المرزوقی، صالح بن زابن، شرکة المساهمة فی النظام السعودی من علماء القرن الخامس عشر جامعة ام القری مکة المکرمة (۴۱۹)

(۲) الدکتور عیسی عبده، العقود الشرعیه (۱۸۔۱۹)

(۳) الدکتور عیسی عبده، العقود الشرعیه (۱۸۔۱۹)

گویا کہ شیخ تقی الدین النبہانی اور ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ دونوں اس بارے میں متفق ہیں کہ اسے شرکت کی کسی روایتی قسم پر منطبق نہیں کیا جاسکتا، ان کے دلائل ذیل میں ذکر کئے گئے ہیں

1- کمپنی میں دو یا زائد افراد کے درمیان اس قسم کا کوئی عقد نہیں پایا جاتا جو شرکت میں ضروری سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ عقد دو افراد کے درمیان ایجاب وقبول کا نام ہے، شرکت کے روایتی تصور میں یہ ہے کہ شرکاء کے درمیان ایجاب وقبول پایا جانا ضروری ہے، اس کے برعکس کمپنی میں جو شخص شرکت کرنا چاہتا ہے وہ محض اپنے ادارے سے جا کر شیئر خرید لیتا ہے خواہ بقیہ شرکاء (شیئر ہولڈرز) کی رضامندی اور قبول پایا جائے یا نہ پایا جائے۔[(۱)]

2- شرکت کے روایتی تصور میں دو یا زیادہ شرکاء اس بات پر اتفاق کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے مشترکہ سرمائے سے تجارت کریں گے، یہ بات کمپنی میں نہیں پائی جاتی کیوں کہ اس میں حصہ دار (Sheare Holder) صرف اپنا سرمایہ لگاتے ہیں، کاروبار کا عمل کمپنی یا اس کے ملازمین سر انجام دیتے ہیں، ہر شریک کو کاروبار میں دخل اندازی کا اختیار بھی نہیں ہوتا، یہ بات بھی شرکت کے روایتی تصور کے خلاف ہے۔[(۲)]

3- روایتی شرکت کے جواز کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ شرکت کے ذریعہ کاروبار کرنے والا کوئی ایسا بدن انسانی ہو جو قولی اور فعلی تصرفات کی اہلیت رکھتا ہو، اس کے برعکس کمپنی میں شرکاء کی طرف سے کاروبار کرنے والا ایک شخص قانونی یا شخص حکمی (Juristic Person) ہوتا ہے جو کاروبار کی تمام ذمہ داریاں ادا کرتا ہے، اس شخصِ قانونی کی کوئی نظیر فقہ کی قدیم کتابوں میں نہیں ملتی۔

4- کمپنی کی ایک خصوصیت محدود ذمہ داری (Limited Liability) ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حاملان حصص (Share Holders) کی ذمہ داریاں ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کی حد تک محدود ہوتی ہے، یعنی اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کا زیادہ نقصان یہ ہوگا

---

(۱) النبهاني، الشيخ تقي الدين، الشركات في الفقه الاسلامي (١٣٤) الخياط، عبدالعزيز عزت، الشركات في الشريعة الاسلامية والقانون الوضعي دار النهضة العربية بيروت، ١٤٠٧هـ (٢: ١٦١)

(۲) النبهاني، الشيخ تقي الدين، الشركات في الفقه الاسلامي (١٣٤) الخياط، عبدالعزيز عزت، الشركات في الشريعة الاسلامية والقانون الوضعي، دار النهضة العربية بيروت، ١٤٠٧هـ (٢: ١٦١)

النبهاني، الشيخ تقي الدين، الشركات في الفقه الاسلامي (١٣٤) الخياط عبدالعزيز، عزت، الشركات في الشريعة الاسلامية والقانون الوضعي دار النهضة العربية بيروت ١٤٠٧هـ (٢: ١٦٥)

کہ ان کا لگایا ہوا سرمایہ ڈوب جائے گا، اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہو گیا تو حاملان حصص سے ان کے لگائے ہوئے سرمایہ سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوگا، محدود ذمہ داری کے اس تصور کی روایتی فقہ اور شرکت میں نظیر دکھائی نہیں دیتی، یہ بات بھی شرکت کے جواز کے لئے مانع ہے۔

-5 روایتی شرکت میں یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی شریک مرجائے یا پاگل ہو جائے یا اسے زبانی اور عملی تصرفات سے روک دیا جائے (یعنی فقہی اصطلاح کے مطابق اسے کردیا جائے) یا کوئی شریک عقد شرکت فسخ کردے تو پوری عقد شرکت فسخ ہو جاتی ہے، اس کے برعکس کمپنی میں کسی بھی شریک کی طرف سے ان حالات میں کمپنی کا کاروبار فسخ یا ختم نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے، یہ بھی شرکت کے روایتی تصور کے خلاف ہے۔[۱]

دوسرا نقطہ نظر:

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ کمپنی شرکت کی روایتی اقسام میں داخل نہیں ہے اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ فقہاء کرام نے جو اقسام ذکر فرمائی ہیں وہ منصوص نہیں ہیں، بلکہ فقہاء کرام نے شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے اسکی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے، پھر کسی نص میں یا فقہاء کے کلام میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ جو صورت ان اقسام میں داخل نہیں ہے وہ ناجائز ہوگی، لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی یہ نقطہ نظر موجودہ علماء کی بھاری اکثریت کا ہے کیوں کہ وہ فرماتے ہیں کہ کمپنیوں اور شرکت کی تمام جدید صورتیں جائز ہیں، بشرطیکہ وہ سود سے پاک ہوں۔

تیسرا نقطہ نظر:

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کمپنی شرکت کی کسی قسم میں داخل ہے پھر اس میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ شرکتِ عنان میں داخل ہے، یہ رائے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ[۲] اور موجودہ دور کے اکثر علماء عرب اور عجم بشمول ڈاکٹر عبدالعزیز خیاط[۳] اور الاستاذ علی الخفیف[٤] اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم وغیرہ کی ہے۔[٥]

---

(۱) الخیاط، عبدالعزیز عزت الشرکات فی الشریعة الاسلامیة والقانون الوضعی، دار النهضة العربية بیروت ۱٤۰۷ (۱:۲۱۱)
(۲) تھانوی، مولانا اشرف علی، امداد الفتاویٰ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، (۳:٤۹٤)
(۳) الخیاط، عبدالعزیز عزت الشرکات فی الشریعة الاسلامیة والقانون الوضعی، دار النهضة العربية بیروت ۱٤۰۷ (۱:۲۸)
(٤) الخفیف، علی الشرکات (۹۷) بحوالہ الاستاذ سعید العالم مخطوطة اللمحات من احکام الشرکات، دارالعلوم کراچی (۲:۵۳)
(۵) عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، اسلام اور جدید تجارت ومعیشت، ادارة المعارف، کراچی (۷۹)

بعض حضرات کا خیال ہے کہ کمپنی کا عقد مضاربہ کی ایک شکل ہے یہ رائے شیخ عبدالوہاب کی ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ کمپنی مضاربہ کے عقد کی مانند ہے، جس میں ایک فریق کا سرمایہ ہوتا ہے جیسے رب المال اور دوسرے فریق کا عمل جسے مضارب یا عامل کہتے اور کمپنی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے، کہ ایک فریق کا سرمایہ اور دوسرے فریق کا عمل تجارت ہوتا ہے لہٰذا یہ مضاربت میں داخل ہے۔(۱)

قابل ترجیح رائے:

مذکورہ بالا تمام اقوال اور آراء میں سب سے زیادہ ترجیح حضرت تھانویؒ کی رائے کو ہونی چاہئے، کہ کمپنی کا عقد شرکت عنان میں داخل ہے، کیوں کہ اس میں کمپنی قائم کرنے والے افراد بھی دوسرے شرکاء (Share Holders) کی مانند کمپنی میں حصہ دار ہوتے ہیں، لہٰذا تمام افراد کمپنی میں شریک ہوجاتے ہیں، البتہ کمپنی قائم کرنے والے لوگ اپنے جامد اثاثوں اور عروض (اجناس) اور مال تجارت کو (قیمت لگا کر) نقد کی طرف محول کر لیتے ہیں، مثلاً ان لوگوں نے دس ہزار روپے کمپنی قائم کرنے کے لئے جامد اثاثوں مثلاً عمارتوں اور ساز وسامان پر صرف کیا تو اگر سو روپے کا ایک حصہ (Share) ہے تو وہ خود کو سو حصوں کا حصہ دار ظاہر کریں گے، البتہ اس صورت میں کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے شرکت صرف نقد سرمایہ سے نہیں ہوگی، بلکہ شرکت بالعروض ہوگی، جس کے بارے میں اسی باب کے پہلے عنوان "کیا سرمائے کا نقد ہونا ضروری ہے" کے تحت اختلاف مذاہب بیان ہو چکے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک اگر عروض ذوات الامثال میں سے ہوں تو جائز ہے ورنہ ناجائز ہے(۲) اور احناف کے نزدیک اگر تمام عروض ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کردیئے جائیں تو جائز ہیں(۳) حضرت تھانویؒ اور دیگر علماء کرام فرماتے ہیں کہ لوگوں کی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر مالکیہ کے قول پر فتویٰ دینے کی گنجائش ہے۔(۴)

خلاصہ یہ کہ اسے شرکتِ عنان قرار دیا جاسکتا ہے اور اس میں سرمایہ لگانے والے آپس میں

(۱) مجلة لواء الاسلام، العدد الثاني عشر ۱۹۵۱ء (ج: ۴) بحوالہ الخياط، عبد العزيز عزت الشركات في الشريعة الاسلامية والقانون الوضعي، دار النهضة العربية بيروت ۱۴۰۷ (۲: ۱۵۵، ۱۵۶)
(۲) ابن قدامة المقدسي (أبو محمد) عبد الله بن أحمد بن محمد، المغني، مكتبة الرياض السعودية (۵: ۱۲۴، ۱۲۵)
(۳) الكاساني، علاء الدين ابوبكر بن مسعود، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع للكاساني (۶: ۵۹)
(۴) تھانوی، مولانا اشرف علی تھانوی، امداد الفتاوی، مکتبہ دار العلوم کراچی (۳: ۴۹۵)

شرکاء ہیں اور اس میں شرکتِ عنان کی مانند بعض شرکاء کے حصص زیادہ اور بعض کے کم ہوتے ہیں، جو حضرات اسے یہ کہہ کر مضاربہ قرار دیتے ہیں کہ اس میں مضاربہ کی طرح ایک فریق کا سرمایہ اور دوسرے فریق کا عمل تجارت ہوتا ہے، اس وجہ سے یہ مضاربہ ہے، ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے، کیوں کہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں شرکت نہیں ہوتی، بلکہ حصہ داروں کی تعداد بعض اوقات ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے اور تمام حصہ داروں کا بذاتِ خود اس میں حصہ لینا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی سب اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں، بلکہ وہ تمام حصہ داران میں انتخاب کر کے ایک مجلس ادارات قائم کر لیتے ہیں، جس کی حیثیت ان شرکاء کے وکیل کی مانند ہوتی ہے، پھر مجلس ادارات سے منتخب کر کے ایک شخص کو ناظم یا مدیر (Managing Director) بنایا جاتا ہے، جو تمام تصرفات انجام دیتا ہے، لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ تصرفات انجام دینے میں بھی تمام شرکاء کی حصہ داری ہوتی ہے، لہٰذا یہ شرکتِ عنان ہے۔

کمپنی کو ناجائز قرار دینے والوں کے دلائل کا جائزہ:

اب ہم سب سے پہلے ذکر کردہ نقطہ نظر رکھنے والے حضرات کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جو کمپنی کے عقد کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں۔

1- مطلقاً ناجائز کہنے والوں کی سب سے پہلی دلیل یہ تھی کہ کمپنی میں دو یا زیادہ افراد کے درمیان شرکت کا عقد کرنے کے لئے ایجاب وقبول نہیں پایا جاتا، حالانکہ کوئی بھی عقد ایجاب وقبول کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ دلیل صحیح نہیں کیوں کہ کمپنی قائم کرنے کا ارادہ سب سے پہلے کسی ایک فرد کے ذہن میں آتا ہے، پھر وہ دوسروں کو اپنے ساتھ شرکت کی دعوت دیتا ہے، تو پہلے شخص کی طرف سے ایجاب پایا گیا، اور اس کے ساتھ اس کی دعوت پر شرکت قبول کرنے والوں کی طرف سے قبول پایا گیا اسی طرح کمپنی میں ایجاب وقبول کے ساتھ مالی منصوبہ میں عقد شرکت پایا گیا، اور شرکاء نے یہ طے کیا کہ وہ نفع نقصان میں شریک ہوں گے، اور اس عقد کو تحریری شکل میں لانے کے لئے وہ متعدد تحریریں تیار کرتے ہیں، مثلاً میمورنڈم، اور آرٹیکلز آف ایسوسی ایشن، نیز ایک منشور مرتب کرتے ہیں، جسے پراسپکٹس (Prospectus) کہا جاتا ہے، یہ تمام مسودات اس عقد کے ایک قسم کے تحریری ثبوت ہوتے ہیں، لہٰذا یہ بات صحیح نہیں، پھر جو لوگ کمپنی قائم ہونے کے بعد

بازار سے شیئرز خریدتے ہیں، وہ بیچنے والے کے ساتھ ایجاب وقبول کرتے ہیں کہ ایجاب وقبول پایا جاتا، کیونکہ کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے ایجاب ہوا اور بعد میں شریک ہونے والوں کی طرف سے قبول پایا گیا۔

-2 مطلقاً حرام کہنے والے حضرات کی دوسری دلیل یہ تھی کہ شرکت کے روایتی تصور میں یہ ہے کہ دو یا زیادہ شرکاء اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ وہ اپنے مشترک سرمایہ سے مل کر تجارت کریں گے، یہ بات کمپنی میں نہیں پائی جاتی، کیوں کہ اس میں حصہ دار (Share Holders) صرف اپنا سرمایہ لگاتے ہیں، کاروبار کا عمل کمپنی یا اس کے ملازمین سرانجام دیتے ہیں، ہر شریک کو کاروبار میں دخل اندازی کا اختیار نہیں ہوتا، یہ باتیں شرکت کے خلاف ہیں۔

ان حضرات کی یہ دلیل بھی صحیح نہیں کیوں کہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں شرکت نہیں ہوتی، بلکہ حصہ داروں کے عمل میں بھی اشتراک پایا جاتا ہے، اور وہ اس طرح کہ کمپنی میں حصہ داروں کی تعداد بعض اوقات ہزاروں تک پہونچ جاتی ہے، اور تمام حصہ داران کا بذاتِ خود کام میں حصہ لینا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی وہ تمام اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں، بلکہ وہ تمام حصہ دارن میں انتخاب کر کے ایک مجلس ادارت قائم کر دیتے ہیں، جس کی حیثیت ان شرکاء کے وکیل کی ہوتی ہے اور پھر مجلس ادارت سے منتخب کر کے ایک شخص کو مدیر بنایا جاتا ہے جو تمام تصرفات انجام دیتا ہے، لہٰذا امر واقعہ یہ ہے کہ تصرفات انجام دینے والا شخص تمام حصہ داران کا نمائندہ یا ملازم ہوتا ہے، لہٰذا اس کا ہر فعل حصہ داروں کا فعل ہے اور انہیں اسے ہر قسم کے اعتراض اور نگرانی کا اختیار ہوتا ہے، اور انتخاب میں رائے دہی کا حق ان کے حصص کے تناسب سے ہوتا ہے، یہ طریقہ شرکت یا کمپنی کی مصالح کے عین موافق ہے، اس لئے کہ کمپنی کا سب سے زیادہ خیر خواہ وہی ہوسکتا ہے، جس کا سرمایہ کمپنی میں زیادہ لگا ہوا ہو، لہٰذا کمپنی کو مطلقاً حرام کہنے والوں کا یہ دعویٰ بالکل بے جا ہے کہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں اشتراک پایا جاتا ہے، عمل میں اشتراک نہیں پایا جاتا، اور شرکاء کو کمپنی میں کسی قسم کے عمل دخل کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ (۱)

-3 جو حضرات کمپنی کے مطلقاً ناجائز ہونے کے قائل ہیں ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ روایتی شرکت کیلئے یہ ضروری ہے کہ شرکت کے ذریعہ کاروبار کرنے والا کوئی ایسا بدلِ انسانی ہو

(۱) الخیاط عبد العزیز عزت، الشرکات فی الشریعۃ الاسلامیۃ والقانون الوضعی، دار النہضۃ العربیۃ بیروت، ۷ ، ۱٤ (۲:۱۸۲)

جو تصرفات قولیہ اور تصرفات فعلیہ کی اہلیت رکھتا ہو، اس کے برعکس کمپنی میں شرکاء کی طرف سے کاروبار کرنے والا ایک شخص قانونی یا شخص حکمی ہوتا ہے، جو کاروبار کی تمام ذمہ داریاں ادا کرتا ہے، اس شخص قانونی کی فقہ میں کوئی نظیر نہیں۔

جیسا کہ ہم نے دوسری دلیل کے جواب میں ذکر کیا کہ تصرفاتِ قولیہ وفعلیہ کا اختیار مجلس ادارت کو ہوتا ہے جو شرکاء کی وکیل ہے، لہٰذا کاروبار درحقیقت تمام حصہ داران اپنے وکیل کے واسطے سے انجام دیتے ہیں، البتہ متعدد قانونی پیچیدگیوں کی بناء پر ان شرکاء کے مجموعے کو شخص قانونی (juristic Person) کی حیثیت دیدی گئی ہے، اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ "شخص قانونی" کا تصور اسلام میں موجود ہے یا نہیں؟ جائزہ لینے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں اگرچہ شخصِ قانونی کی اصطلاح موجود نہیں ہے، لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

شخص قانونی کی فقہی نظائر

(۱) وقف:

وقف کے لئے اگرچہ شخصِ قانونی (Juristic Person) کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی، مگر حقیقت میں یہ ایک شخص قانونی ہے، اس لئے وقف اشیاء کا مالک بن سکتا ہے، کیوں کہ جب کوئی شخص کسی چیز کو وقف کرتا ہے تو وقف کردہ چیز جمہور فقہاء کے نزدیک واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور جس کے اوپر وقف کیا گیا (جسے موقوف علیہ کہا جاتا ہے) اس کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی، لہٰذا وہ چیز نہ واقف (وقف کرنے والا) کی ملکیت ہوتی ہے اور نہ ہی موقوف علیہ کی ملک ہوتی ہے، بلکہ وقف خود ایک مستقل وجود رکھتا ہے، گویا کہ اب وہ ایک شخص قانونی کی شکل اختیار کر گیا ہے، لہٰذا اب وہ اشیاء کا مالک بھی بن سکتا ہے، دائن اور مدیون یا موجر اور مستاجر بھی بن سکتا ہے، چنانچہ وقف کا متولی اس کی طرف سے کوئی قرضہ لے سکتا ہے، یا کوئی چیز کرایہ پر لے سکتا ہے، اسی طرح اس کے لئے ضرورت کی کوئی چیز خرید سکتا ہے، اور اس قرضہ یا واجب الاداء کرایہ کی رقم یا قیمت کی ادائیگی کا وجوب درحقیقت وقف پر ہوگا، لہٰذا متولی وقف کی آمدنی سے ان کی ادائیگی کرے گا، اسی طرح وقف کی جائیدادیں کرایہ پر بھی دی جاسکتی ہیں اور اس کے کرایہ کا مستحق وقف ہوگا، اگر وقف کے متولی نے وقف کے لئے ادھار لیا پھر وہ معزول ہوگیا تو اس سے

عرض کا مطالبہ نہیں ہوگا، بلکہ نیا متولی وقف کی طرف سے اس کی آمدنی سے اس دین کی ادائیگی کرے گا، لڑائی جھگڑوں اور مقدمات کی صورت میں دراصل وقف ہی مدعی یا مدعی علیہ ہوگا، اور اس کی طرف سے متولی اس کے متعلقہ امور نمٹائے گا۔ (۱)

(۲) بیت المال:

بیت المال سے پوری قوم کا حق تو متعلق ہے مگر ہر شخص اس مال میں ملک کا دعویٰ نہیں کرسکتا اس مال کا مالک بیت المال ہی ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال بھی ایک شخص قانونی ہے، بلکہ فقہاء کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال کی ہر ایک مد ایک مستقل شخص قانونی ہے، بیت المال کے دو الگ الگ حصے ہیں، بیت مال الصدقہ، بیت مال الخراج، امام زیلعی رحمہ اللہ نے مسئلہ لکھا ہے، کہ اگر ایک حصہ میں مال نہ ہو تو بوقت ضرورت دوسرے حصہ سے قرض لیا جاسکتا ہے۔

(تبيين الحقائق كتاب السير قبيل باب المرتدين : ۲۸۳/۳)

اس صورت میں جس حصہ سے قرض لیا گیا وہ دائن اور جس حصہ کے لئے قرض لیا گیا وہ مدیون ہوگا، دائن یا مدیون تو شخص ہوا کرتا ہے، تو معلوم ہوا کہ بیت المال کو بھی شخص فرض کرلیا گیا ہے۔

(۳) ترکۂ مستغرقہ بالدین:

کسی میت کا سارا ترکہ دیون سے مستغرق ہو تو اس صورت میں دائنین کا مدیون نہ میت ہے، اس لئے کہ مرنے کے بعد کوئی شخص مدیون نہیں ہوتا اور نہ ورثہ مدیون ہیں، اس لئے کہ ان کو تو میراث ملی ہی نہیں، لہٰذا یہاں مدیون ترکہ ہوگا جو شخص قانونی ہے۔

(٤) خلطۃ الشیوع:

یہ نظیر حنفیہ کے مذہب کے مطابق نہیں، بلکہ ائمہ ثلاثہ کے مذہب کے مطابق ہے، ان کے ہاں مال زکوٰۃ کئی شخصوں میں مشاع طور پر مشترک ہو تو زکوٰۃ انفرادی حصوں پر نہیں، بلکہ مجموعے پر [illegible] ہے، معلوم ہوا کہ ائمہ ثلاثہ کے ہاں مجموعہ ایک شخص قانونی ہے، یہاں یہ بات یاد رکھنے کے

---

(۱) [illegible] شامی، محمد امین الشهير بابن عابدين الشامی تنقيح الحامدية، دار المعرفه بيروت، (۱/ ۲۱۳) [illegible] شامی، محمد امین الشهير بابن عابدين رد المحتار ايچ ايم سعيد كمپنی، مطبعة الحلبی مصر ۱۳۸٦ھ (۳/ ٦۱۹) شيخ زاده، [illegible] بن الشيخ محمد بن سليمان المعروف بداماد آفندی، مجمع الانهر شرح ملتقى الابحر، [illegible] ۱۹۷۷ (۱/ ۷٤۹) الحصكفی، محمد علاء الدين بن الشيخ على الامام بجامع بنی اميه، الدر المنتقى في شرح الملتقى (۱/ ۷٤۹) طبع دار السعادة استانبول (ماخوذ از عصر حاضر اور شرکت ومضاربت)

قابل ہے کہ خلطۃ الشیوع اور کمپنی کے نظام میں یہ فرق ہے کہ خلطۃ الشیوع میں ائمہ ثلاثہ کے ہاں مجموعے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، پھر ہر شریک کی انفرادی ملکیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اور کمپنی کے نظام میں کمپنی پر الگ ٹیکس ہوتا ہے اور شیئر ہولڈرز پر الگ ٹیکس ہوتا۔

ان نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ شخص قانونی کا تصور فی نفسہ کوئی ناجائز تصور نہیں ہے، اور نہ فقہ اسلامی کے لئے کوئی اجنبی تصور ہے، البتہ یہ اصطلاح نئی ضرور ہے۔

محدود ذمہ داری کی شرعی حیثیت

کمپنی کی دوسری خصوصیت جو شرعی اعتبار سے قابل غور ہے وہ (Limited Liability) یعنی "محدود ذمہ داری" ہے جس کی تشریح پیچھے کی جا چکی ہے، اس میں جہاں تک شیئرز ہولڈرز کی محدود ذمہ داری کا تعلق ہے، اس کی تو شرعی نقطہ نظر سے ایک نظیر موجود ہے، اس لئے کہ جب تک رب المال مضارب کو دوسروں سے قرض لینے کی اجازت نہ دے، مضاربت میں رب المال کی ذمہ داری اس کے سرمائے تک محدود ہوتی ہے، چنانچہ اگر رب المال نے مضارب کو سرمایہ دیا اور مزید قرض لینے کی اجازت نہیں دی، پھر کاروبار کے نتیجہ میں مضارب پر دیون واجب ہو گئے تو ایسی صورت میں رب المال کا زیادہ سے زیادہ اس کے سرمائے کی حد تک نقصان ہوگا اس سے زیادہ کا رب المال سے مطالبہ نہیں ہوگا بلکہ اس سے زیادہ کا ذمہ دار مضارب ہوگا کیوں کہ اس نے رب المال کی اجازت کے بغیر قرضے لئے ہیں، اس لئے وہی ان کا ذمہ دار ہے، ایسے ہی شیئر ہولڈرز جو خود عمل نہ کر رہا ہو تو اس کی ذمہ داری محدود ہونے کی شرط مضاربت کے اصول پر صحیح معلوم ہوتی ہے، البتہ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ تقریباً تمام کمپنیوں کے پراسپکٹس میں یہ بات درج ہے کہ کمپنی ضرورت کے مواقع پر بینکوں وغیرہ سے قرض لے سکے گی، اور جو لوگ کمپنی کے شیئر ہولڈرز بنتے ہیں ان کو یہ بات معلوم ہوتی ہے، لہٰذا جب وہ پراسپکٹس کو دیکھ کر کمپنی کے حصہ دار بنتے ہیں، تو ان کی طرف سے گویا معنوی اجازت ہے کہ کاروبار کے لئے قرض لیا جا سکتا ہے، اور جب رب المال مضارب کو قرض کی اجازت دیدے تو اس کی ذمہ داری محدود نہیں رہتی، لیکن اس شبہ کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ پراسپکٹس ہی میں یہ بات بھی درج ہوتی ہے کہ شیئر ہولڈرز کی ذمہ داری محدود ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ حصہ داروں کی طرف سے کمپنی کو قرض لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہم پر ان قرضوں کی ذمہ داری لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ نہ ہو، لہٰذا اس کی صحیح نظیر

یہ ہے کہ رب المال مضارب کو اس شرط کے ساتھ قرض لینے کی اجازت دے کہ اس کی ذمہ داری وہ خود برداشت کرے۔

لیکن یہاں شرعی نقطۂ نظر سے اصل اشکال یہ ہے کہ مضاربت میں رب المال کی ذمہ داری تو محدود ہوتی ہے، مگر مضارب کی ذمہ داری تو محدود نہیں ہوتی، لہٰذا دائنین رب المال کے سرمائے سے زائد دیون مضارب سے وصول کر سکتے ہیں، چنانچہ دائنین کا ذمہ خراب نہیں ہوتا، لیکن کمپنی میں ڈائریکٹران کی ذمہ داری بھی محدود ہے اور خود کمپنی جو شخصِ قانونی ہے اس کی ذمہ داری بھی محدود ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کمپنی کے اثاثوں سے زائد دائنین کا جو دین ہوگا اس کی وصولیابی کی کوئی صورت نہیں رہے گی، دائنین کا ذمہ خراب ہو جائے گا ''خراب الذمۃ'' فقہاء کی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دائن کا دین ادا ہونے کی کوئی صورت نہ رہے۔

اسی اشکال کی بناء پر بعض علماء عصر کی رائے یہ ہے کہ محدود ذمہ داری کا تصور شرعاً صحیح نہیں، اس لئے کہ اس سے لوگوں کے حقوق ضائع ہو جاتے ہیں، کم از کم ڈائریکٹران کی ذمہ داری غیر محدود ہونی چاہئے، لیکن اس مسئلے کو اگر ایک دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کمپنی کی محدود ذمہ داری کے تصور کی بنیاد دراصل شخص قانونی کے تصور پر ہے، شخص قانونی کو حقیقت ماننے کے بعد محدود ذمہ داری کو ماننا مشکل نہیں رہتا، شخص حقیقی مفلس (دیوالیہ) ہو جائے تو دائنین صرف اس کے اثاثوں سے دین وصول کر سکتے ہیں، اس سے مزید کا مطالبہ نہیں کر سکتے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی تفلیس فرمانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے دائنین کو فرمایا تھا ''خذوا ما وجدتم، ليس لكم الا ذلك''[1] البتہ اگر وہ دوبارہ غنی ہو جائے تو اب پھر مطالبہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر مفلس ہونے کی حالت میں اس کی موت واقع ہو جائے تو ''خراب الذمۃ'' ہو جاتا ہے، ان کے دیون ادا ہونے کی کوئی صورت نہیں رہتی، معلوم ہوا کہ شخصِ حقیقی اگر مفلس ہو کر مر جائے تو اس کی ذمہ داری اثاثوں تک محدود ہوتی ہے اور دائنین کا ذمہ خراب ہو جاتا ہے، جب کمپنی کو بھی شخص مان لیا گیا ہے تو یہ بھی اگر دیوالیہ ہو کر تحلیل ہو جائے تو اس کی ذمہ داری بھی اثاثوں تک محدود ہونی چاہئے، اس لئے کہ کمپنی کا تحلیل ہو جانا ہی اس شخص قانونی کی موت ہے۔

خصوصاً جب کہ کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے والا یہ دیکھ کر معاملہ کرتا ہے کہ یہ کمپنی لمیٹڈ ہے،

---

(۱) صحیح مسلم: ۲/ ۱۹، ادارۃ القرآن، کتاب، باب وضع الجوائح

میرا حق صرف اثاثوں کی حد تک محدود ہوگا، یہی وجہ ہے کہ لمیٹڈ کمپنی کے ساتھ لمیٹڈ لکھنا ضروری ہوتا ہے، پھر کمپنی کی بیلنس شیٹ بھی شائع ہوتی رہتی ہے، قرض دینے والا بیلنس شیٹ کے ذریعے سے کمپنی کا مالی استحکام دیکھ کر قرض دیتا ہے، غرضیکہ جو شخص بھی لمیٹڈ کمپنی سے معاملہ کرتا ہے وہ علی بصیرۃ کرتا ہے اسمیں کسی قسم کا دھوکہ یا فراڈ نہیں ہوتا، اس لئے اکثر علماء عصر کی رائے یہی ہے کہ محدود ذمہ داری کے تصور کی وجہ سے شرکت کو فاسد نہیں کہا جا سکتا ہے۔

لمیٹڈ کمپنی کی فقہی نظیر:

فقہ میں لمیٹڈ کمپنی کی ایک نہایت دلچسپ نظیر موجود ہے، جو لمیٹڈ کمپنی سے بہت ہی قریب ہے، وہ ''عبد ماذون فی التجارۃ'' ہے، یہ اپنے آقا کا مملوک ہوتا ہے اور اس کو آقا کی طرف سے تجارت کی اجازت ہوتی ہے، جو تجارت وہ کرتا ہے وہ بھی مولی کی مملوک ہوتی ہے، اس پر اگر دیون واجب ہوں تو وہ اس غلام کی قیمت کی حد تک محدود ہوں گے، اس سے زیادہ کا نہ غلام سے مطالبہ ہو سکتا ہے اور نہ مولی سے، یہاں بھی دائنین کا ذمہ خراب ہوگیا، یہ نظیر لمیٹڈ کمپنی سے زیادہ قریب اس لئے ہے کہ جیسے کمپنی میں شیئر ہولڈرز کے زندہ ہوتے ہوئے ذمہ خراب ہوجاتا ہے، ایسے ہی یہاں بھی مولی کے زندہ ہوتے ہوئے دائنین کا ذمہ خراب ہوجاتا ہے۔

(ماخوز از جدید معیشت و تجارت)

مضاربۂ فاسدہ کا حکم:

اگر کسی شرط فاسد سے عقد مضاربہ فاسد ہوجائے تو معاملہ ختم کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ، اس عقد سے حاصل ہونے والا کل منافع رب المال (یعنی صاحب مال) کا ہوگا، مضارب (کام کرنے والے) کو اجرت مثل ملے گی، البتہ اس کی مقدار طے شدہ منافع سے زیادہ نہیں ہونی ہونا چاہئے، نیز اگر اس عقد میں نفع نہ بھی ہو تب بھی مضارب کو اجرت کا حقدار ہوگا۔

واجارۃ فاسدۃ إن فسدت فلاربح للمضارب حینئذٍ بل له اجر مثل عمله مطلقاً ربح اولا بلازیادۃ علی المشروط.

(ردالمختار: ٤/٥٣٩)

مضاربہ میں نقصان کی تفصیل:

زید بکر دو آدمی اس طرح کاروبار کریں کہ مثلاً زید بکر کو بیس ہزار دیتا ہے اور بکر اپنی طرف سے

پانچ ہزار ملا کر کاروبار کرتا ہے، اب اگر اس تجارت میں نقصان ہو جائے تو یہ ذمہ دار کون ہوگا؟

اس کا حکم یہ ہے کہ اس تجارت میں کل پچیس ہزار رأس المال ہے، اس سے جو زائد رقم حاصل ہو وہ منافع ہے اب اگر نقصان ہو جائے تو اس نقصان کو پہلے منافع سے ادا کیا جائے گا، اگر منافع سے نقصان کی تلافی نہ ہو سکے تو رأس المال سے بقدر حصص (یعنی نقصان کے پانچ حصے کر کے چار حصے زید اور ایک حصہ بکر) ادا کرے گا۔

قال الامام الحصكفي رحمه الله تعالیٰ: وما هلك من مال المضاربة يصرف الى الربح لانه تبع فان زاد الهالك على الربح لم يضمن ولو فاسدة من عمله لانه أمين. (رد المحتار: ٥٤٦/٤)

مضارب کا شرط کی خلاف ورزی کرنے کا حکم:

اگر عقد مضاربہ طے ہو جانے کے بعد مضارب نے شرط کی خلاف ورزی کی مثلاً، شرط یہ طے پائی تھی کہ باٹا کمپنی سے چپل خرید کر فروخت کئے جائیں گے لیکن مضارب نے رب المال کو بتائے بغیر کسی اور کمپنی سے مال خرید اس طرح تجارت کرتا رہا، تو یہ مضارب کی طرف سے خیانت ہوئی اب خریداری عقد مضاربہ کے بجائے خود مضارب کے لئے ہوئی، لہٰذا اگر غیر معیاری کمپنی سے خریدنے کی وجہ سے نقصان ہو گیا تو نقصان مضارب کے ذمہ ہوگا، اگر نفع ہوا تو منافع بوجہ خبث کے واجب التصدق ہے۔

البتہ حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس چیز میں حق غیر کی وجہ سے خبث آ گیا ہو اسے صدقہ کرنے کی بجائے صاحب مالک پر رد کرنا واجب ہے، لہٰذا کل منافع رب المال کو ملنا چاہئے۔

قال الامام المرغيناني رحمه الله تعالیٰ: فيكون سبيله التصدق في رواية ويرد عليه في رواية لان الخبث لحقه وهذا اصح.

(هداية: ١٢٣/٣، كتاب الكفالة)

مگر رب المال کو منافع میں سے عقد میں طے شدہ حصہ نفع کے بقدر ملے گا اس سے زائد نہیں ملے گا، کیوں کہ وہ نفع کا حصہ متعین کر کے زائد حصہ کے اسقاط پر راضی ہو چکا ہے۔

كما قالوا في الاجارة الفاسدة. (ماخوذ از احسن الفتاوىٰ: ٢٤٧/٧)

کتاب القسمة

مشترک ملک کی تقسیم شرعاً جائز ہے، البتہ جو چیزیں تقسیم کے بعد قابل انتفاع نہ رہیں اس کی تقسیم کے لئے شرکاء کی رضامندی ضروری ہے محض ایک شریک کی چاہت ومطالبہ پر قاضی تقسیم نہیں کرے گا، ہاں دونوں ہی تقسیم کے خواہشمند ہوں تو تقسیم کردی جائے گی یا یہ کہ تقسیم کے بجائے اپنے شریک کے ہاتھ فروخت کردے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالىٰ: القسمة في الاعيان المشتركة مشروعة لان النبي عليه الصلاة والسلام باشرها في المغانم والمواريث وجرى التوارث بها من غير نكير. (هداية: ٤/ ٤١١)

وشرطها عدم فوت المنفعة بالقسمة وكذا لا يقسم نحو حائط وحمام (درمختار) وقال الشارح تحت قوله المنفعة اى المعهودة وهى ماكانت قبل القسمة اذا الحمام بعدها ينتفع به كنحو ربط الدواب وسيذكره الشارح عن المجتبىٰ، وقوله ولذا لا يقسم نحو حائط، يعنى عند عدم الرضاء من الجميع اما اذا رضى الجميع صحت كما سيأتى متنا اهـ. (ردالمحتار: ٦/ ٢٥١، كتاب القسمة)

بوقت تقسیم شرکاء کے موجود ہونے کی تفصیل:

مشترک اشیاء کی تقسم کے وقت تمام شرکاء کا موجود ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر شئی مشترک ذوات الامثال میں سے ہو تو تمام شرکاء کا موجود ہونا ضرروی نہیں، خواہ یہ چیز وراثت سے حاصل ہوئی ہو یا مشترک خریداری وغیرہ سے۔

البتہ شریک غائب کا حصہ اس تک پہنچنے سے پہلے اگر ضائع ہو جائے تو نقصان حاضر وغائب دونوں کو برداشت کرنا ہوگا پھر حاضر کو ملا ہوا حصہ دونوں میں مشترک ہوگا۔

اور اگر شئی مشترک ذوات القیم میں سے ہے تو سب شرکاء کا موجود ہونا ضروری ہے، کوئی شریک غائب ہو تو تقسیم صحیح نہیں، بلکہ غائب کی اجازت پر موقوف ہے، البتہ صرف ترکہ تقسیم باذن قاضی جائز ہے، قاضی غائب شریک کی طرف سے اس کا حصہ قبضہ کرنے کے لئے نائب مقرر

کرے۔

قال فی التنویر وشرحه : (وتشتمل) مطلقا (علی) معنی (الافراز) وهو اخذ عین حقه (و) علی معنی (المبادلة) وهو اخذ حقه (و) الافراز (هو الغالب فی المثلی) ومافی حکمه وهو العددی المتقارب فان معنی الافراز غالب فیه ایضاً ابن کما ل عن الکافی (والمبادلة) غالبة (فی غیره) ای غیر المثلی وهو القیمی اذا تقررهذا الاصل (فیأخذ الشریك حصة بغیبة صاحبه فی الاول) ای المثلی لعدم التفاوت (لاالثانی) ای القیمی لتفاوته .

وقال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه تعالیٰ : (قوله والافراز هو الغالب فی المثلی) لان مایأخذ ه احدهما نصفه ملکه حقیقة ونصفه الآخر بدل النصف الذی بید الآخرفبا عتبار الاول افراز وباعتبار الثانی مبادلة الاان المثلی اذا اخذبعضه بدل بعض کان المأخوذ عین المأخوذ عنه حکما لوجود المماثلة بخلاف القیمی .

(قوله ومافی حکمه) ای حکم المثلی اقول نقل فی جامع الفصولین عن شرح الطحاوی کل کیلی ووزنی غیر مسوغ وعددی متقارب کفلوس وبیض وجوزونحوها مثلیات والحیوانات والزرعیات والعددی المتفاوت کرمان وسفر جل والوزنی الذی فی تبعیضه ضرر وهو السبوغ قیمیات ۔ اھ ۔ ثم نقل عن الجامع العددی المتقارب کله مثلی کیلا وعدا ووزنا وعند زفررحمه اللّٰه تعالیٰ قیمی وما تتفاوت احاده فی القیمة فعددی متفاوت لیس بمثلی الخ فتأمل . (رد المحتار : ۱۷۸/۵)

قال فی شرح التنویر : فی الخانیة مکیل او موزون بین حاضر وغائب او بالغ وصغیر فاخذ الحاضر او البالغ نصیبه نفذت القسمة ان سلم حظ الآخرین والا لا .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ : (قوله فى الخانية الخ) اراد به بيان فائدة هى انه اذا قسم ذو اليد حصته بغيبة صاحبه كما قال فى المتن لا تنفذ القسمة مالم تسلم حصة الأخر (قوله ان سلم حظ الأخرين) اى الغائب و الصغير مفهومه ان سلامة مااخذه لا تشترط كما سيظهر (قوله والا لا) اى وان لم يسلم بأن هلك قبل وصوله اليهما لا تنفذ القسمة بل تنتقض ويكون الهالك على الكل ويشاركه الأخران فيما اخذ لما فى هذه القسمة من معنى المبادلة .

(ردالمحتار : ١٧٨/٥)

قال فى شرح التنوير : وصحت برضاء الشركاء الا اذا كان فيهم صغيراو مجنون لانائب عنه او غائب لا وكيل عنه لعدم لزومهما حينئذ الا باجازة القاضى او الغائب او الصبى اذا بلغ او وليه هذالو ورثة ولو شركاء بطلت منية المفتى وغيرها. (ردالمحتار : ١٨٠/٥)

وفيه ايضا بعد صفحتين : (ولوبرهنا على الموت وعدد الورثة وهو) اى العقار قلت قال شيخنا و كذا المنقول بالاولىٰ (معهما وفيهم صغير او غائب قسم بينهم ونصب قابض لهما) نظر اللغائب والصغير ولابد من البينة على اصل الميراث عنده ايضا خلافا لهما كما مر (فان برهن) وارث (واحد) لايقسم اذلابدمن حضوراثنين ولو احدهما صغيراوموصى له (او كانوا) اى الشركاء (مشترين) اى شركاء بغير الارث (وغاب احدهم) لان فى الشراء لا يصلح الحاضر خصما عن الغائب بخلاف الارث .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ : (قوله قسم بينهم) افاد ان القاضى فعل ذلك قال فى المحيط فلو قسم بغير قضاء لم تجز الا ان يحضر او يبلغ فيجيز طورى وهذا ما قدمه الشارح (قوله بخلاف الارث) قال فى الدررفان ملك الوارث ملك الخلافة حتى

یرد بالعیب علی بائع المورث ویرد علیه ویصیر مغرورا بشراء المورث حتی لو وطی امة اشتراها مورثه فولدت فاستحقت رجع الوارث علی البائع بثمنها وقیمة الولد للغرور من جهته فانتصب احدهم خصما عن المیت فیمافی یده والأخر عن نفسه فصارت القسمة قضاء بحضرة المتقاسمین واما الملك الثابت بالشراء فملك جدید بسبب باشره فی نصیبه ولهذا لا یرد بالعیب علی بائع فلا ینتصب الحاضر خصما عن الغائب فتکون البینة فی حق الغائب قائمة بلا خصم فلا تقبل. اهـ (ردالمحتار: ۱۵۲/۵)

نابالغ کے ساتھ تقسیم ترکہ کا حکم:

مثلاً کسی شخص کا انتقال ہوجائے اور ورثہ میں کوئی نابالغ لڑکا بھی ہو اب اگر میراث تقسیم ہوجائے تو بلوغ کے بعد صغیر کو تقسیم فسخ کرنے کا اختیار ہوگا یا نہیں؟ اس میں تفصیل ہے، اگر یہ تقسیم صغیر کے ولی کی اجازت کے بغیر ہو تو بلوغ کے بعد اس کو تقسیم فسخ کرنے کا اختیار ہوگا اور اگر صغیر کے ولی کی اجازت سے تقسیم ہوئی ہو تو بلوغ کے بعد تقسیم فسخ کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

اگر یہ مال مشترک میراث نہ ہو بلکہ شرکت ہو تو بلوغ کے بعد تقسیم فسخ کرنے کا صغیر کو مطلقاً حق حاصل ہوگا۔

وصحت برضاء الشرکاء الا اذا کان فیهم صغیرا ومجنون لانائب عنه أو غائب لا وکیل عنه لعدم لزومها حینئذ الا باجازة القاضی أو الغائب او الصبی اذابلغ أو ولیه هذا لورثة ولو شرکاء بطلت منیة المفتی وغیرها. (ردالمحتار: ۲۵۷/۶، کتاب القسمة)

مشترک مکانات کے منافع تقسیم کرنے کا حکم:

اگر شرکاء کے درمیان مکانات مشترک ہیں اب ملکیت کو مشترک رکھتے ہوئے ان کے منافع کو تقسیم کرنا ہو تو تقسیم منافع کی جائز صورت کیا ہوگی؟

عبارات فقہاء پر غور کرنے سے اس کے جواز کی دو صورتیں سامنے آئی ہیں۔

1- دونوں مکانوں کے منافع کے مجموعہ کو بقدر حصہ ملک آپس میں تقسیم کیا جائے۔

-2 باہم مکانوں کی تعیین کرلیں ایک مکان ایک شریک کے لئے دوسرا دوسرے شریک کے لئے، پھر ہر شریک کو اختیار ہے کہ اپنے متعین مکان میں خود رہے یا اسکو کرایہ وغیرہ پر دے کر منافع حاصل کرے اس صورت میں ہر ایک اسی مکان کے منافع کا مستحق ہوگا جو اس کو تقسیم میں ملا ہے، خواہ اس کا منافع دوسرے سے کم ہو یا زیادہ۔

قال الامام التمرتاشی رحمه اللّٰه تعالیٰ : ولو تها يؤافي سكنى دار او دارين (الى قوله) أوفى غلة دار أو دارين صح .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالیٰ : تنبيه : فى الهداية لكل واحد أن يستغل ما اصابه بالمهاياة وان لم يشترط ذلك لحدوث المنافع على ملكه .

قوله كذلك أى يأخذ هذا شهرًا والاخر شهرًا او يأخذ هذا غلة هذه والاخر غلة الاخرىٰ. (ردالمحتار : ٦/٢٦٩ آخر كتاب القسمة)

وکالت کے احکام

وکالت کا معنیٰ لغت میں:

التفويض والاعتماد على الغير .

یعنی لغت میں وکالت کا معنیٰ ہے، سپرد کرنا، دوسرے پر اعتماد کرنا، کسی کو اپنے کاموں کے انجام دہی کے لئے نائب مقرر کرنا.

قال اللّٰه تعالیٰ : ﴿ انی توکلت علی اللّٰه ربی وربکم ﴾

(سورة هود : ٥٥)

الوكالة فى الشرع:

انابة الشخص لاخر فيما يقبل النيابة وتفويض امره اليه بما يحقق الخير والمصلحة وباختصار تفويض شخص امره لاخر فيما يقبل النيابة .

یعنی شرعاً وکالت کا معنیٰ یہ ہے کہ جس میں نیابت چل سکتی ہو اور وہ کام دوسرے کے سپرد

کرنے میں خیر و مصلحت ہو ایسے کام انجام دینے کے لئے کسی کو اپنا نائب مقرر کرنا۔

وکالت کی مشروعیت:

چونکہ ہر انسان اپنا ہر کام خود انجام دینے پر قادر نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے ذریعے کام کروانے پر مجبور ہوتا ہے، اس لئے شرعاً وکالت جائز کاموں کو انجام دینے کے لئے جائز ہے، دوسروں کے کام انجام دینا یہ نیکی کے کام میں تعاون ہے۔

لقوله تعالیٰ: ﴿ تعاونوا علی البر و التقویٰ، ولا تعاونوا علی الاثم و العدوان ﴾ (سورة المائدة: ۲)

یعنی نیکی وتقویٰ کے کام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، گناہ اور ظلم کے کام میں ایک دوسرے کی مددمت کرو۔

لقوله علیه السلام: "والله فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیه." (طرق من حدیث اخرجه البخاری ومسلم)

یعنی جب کوئی آدمی کسی کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس آدمی کی مدد کرتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ حکیم بن حزام کو قربانی کا جانور خریدنے کے لئے وکیل مقرر فرمایا تھا، اسی طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حج کے موسم میں تبلیغ سورت کے لئے اپنا نائب مقرر فرمایا تھا، اسی طرح بعض صحابۂ کرام کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے اپنا نائب مقرر کر کے مختلف علاقوں کی طرف بھیجنا ثابت ہے، اسی طرح اقامت حدود کے لئے بعض صحابہ کو مقرر فرمانا بھی احادیث سے ثابت ہے۔

والاصل فیه قوله سبحانه تعالیٰ: ﴿ وان خفتم شقاق بینهما فابعثوا حکما من اهله و حکما من أهلها ان یریدا اصلاحا یوفق الله بینهما ﴾ (سورة النساء: ۳۵)

اگر تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بیوی میں (ایسی کشائش کا) اندیشہ ہو تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی عورت کے خاندان سے بھیجو اگر ان دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہو گی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی میں اتفاق فرمادیں گے۔ (نساء)

اس آیت سے بھی وکالت کی مشروعیت ثابت ہے۔

مؤکل کی شرائط:

مؤکل کے اندر ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، کہ وہ عاقل بالغ ہو اور جس کام کے لئے دوسرے کو وکیل مقرر کر رہا ہے، اس کام کو خود انجام دینے کی اہلیت رکھتا ہو یعنی شرعاً اس کے لئے ممنوع نہ ہو۔

وکیل کی شرائط:

مؤکل کی طرح وکیل کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ عاقل و بالغ ہو اور جس کام کے لئے وکیل مقرر کیا جا رہا ہے اس کام کو انجام دینے کی اہلیت رکھتا ہو۔

صحت وکالت کا ضابطہ:

فقہاء کرام نے صحتِ وکالت کے لئے ضابطہ مقرر فرمایا ہے۔

کل عقد جاز أن يعقده الانسان لنفسه جاز له أن يو كل فيه غيره، واما مالا تجوز فيه الو كالة فهو كل عمل لاتدخله النيابة .

(فقه المعاملات)

یعنی ہر وہ عقد جو انسان خود منعقد کر سکتا ہے، اس کے لئے کسی دوسرے کو وکیل مقرر کرنا بھی جائز ہے اور جس کام کے لئے شرعاً نیابت درست نہیں اس کے لئے وکیل مقرر کرنا بھی جائز نہیں۔

عبادات بدنیہ کے لئے وکیل مقرر کرنے کا حکم:

عبادات بدنیہ جو انسان کے ذمہ فرض ہیں، جیسے نماز، روزہ وضوء، طہارت، اللہ کی ذات کی قسم، ان امور کے لئے کسی غیر کو وکیل مقرر کرنا جائز نہیں، کیوں کہ یہ ایسی عبادات ہیں جن کی ادائیگی انسان کے ذمہ خود لازم ہے، ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بندوں کا امتحان فرماتے ہیں: تا کہ مطیع اور عاصی (گناہ گار) میں فرق معلوم ہو جائے۔

كقوله تعالىٰ : ﴿ ونبلو كم بالشرو الخير فتنة، واليناترجعون ﴾

(سورة الأنبياء : ٣٥)

عبادات مالیہ کے لئے وکیل مقرر کرنے کا حکم:

عبادات مالیہ، جیسے زکوٰۃ، صدقہ، قربانی، کفارات مالیہ اور دیگر تمام نفل کاموں کے لئے وکیل

مقرر کرنا جائز ہے، جیسے کسی کو زکوۃ ادائیگی یا تقسیم کے لئے وکیل مقرر کرے۔

فقد وکل اباهريرة بأن يحفظ اموال الصدقة ووكل بعض اصحابه بان يجمعواله مال الزكاة، ووكل عليا بأن ينحرعنه بقية الهدى، من الابل التى ساقها فى حجة الوداع وكانت مائة ناقة نحر منها بنفسه ثلاثا وستين ووكل عليا بنحر الباقى فدل ذلك على جواز التوكيل بالامور الماليه. (فقه المعاملات)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو صدقات کے مال کی حفاظت کے لئے وکیل فرمایا اور بعض صحابہ کو اموال زکوۃ وصول کرنے کا وکیل بنایا، اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے سو اونٹ کی قربانی کی، ۶۳ خود ذبح فرمایا اور باقی کے ذبح کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وکیل مقرر فرمایا۔

عدالت میں وکالت کا پیشہ اختیار کرنے والوں کے لئے تنبیہ:

عدالت میں اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے یا مدعی کے غلط دعویٰ کی مدافعت کرنے کیلئے کسی کو وکیل مقرر کرنا یا کسی کا وکیل مقرر ہونا شرعاً جائز ہے، مؤکل مرد ہو یا عورت، نیز اس پر فریق مخالف راضی ہو یا ناراض، بہر حال شریعت کی طرف سے اجازت ہے، کوئی بطور وکالت اس کام کو انجام دے۔

البتہ کسی جھوٹے مدعی کی حمایت کرنا یا کسی ظالم کی طرف سے مدافعت کرنا، اس کی خاطر جھوٹ بولنا اور اس کو دوسروں سے بذریعہ عدالت مال لوٹ کر دینا یہ بہت بڑا گناہ ہے، ایسے لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہئے، وکالت کا ایسا پیشہ جس میں ظالم کی حمایت مظلوم پر مزید ظلم ڈھایا جائے یہ ملعون پیشہ ہے اس پر اجرت لینا بھی حرام ہے جیسا کہ ہم نے کتاب الاجارہ میں تفصیل سے بیان کیا، ایسے لوگوں کو سوچنا چاہئے کہ ان کی چرب زبانی کب تک ان کے کام آئے گی۔

قوله تعالىٰ : ﴿ هَاَنتم هؤلآء جادلتم عنهم فى الحيوٰة الدنيا فمن يجادل الله عنهم يوم القيامة امّن يكون عليهم وكيلا ﴾

(سورة النساء : ۱۰۹)

یعنی سنتے ہو تم لوگ جھگڑا کرتے ہو ان کی طرف سے دنیوی زندگی میں، پھر کون جھگڑا کرے گا ان کے بدلے اللہ سے قیامت کے روز یا کون ہوگا اس کا کارساز۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو ان کی طرف سے مدافعت کررہے ہو ذرا سوچو قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری ہوگی، اس وقت کون کس طرف سے جواب دہی کرے گا، اس لئے جھوٹے دعویٰ کرنے والے اور جھوٹے مقدمے کی پیروی کرنے والے دونوں کو اپنا انجام سوچنا چاہئے۔

سمع رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ذات يوم ، ارتفاع أصوات متخاصمين جائا يتحاكمان عنده في ارض وقد ارتفعت اصواتهما امام احد حجرات بيوت ازواج النبي صلى اللّٰه عليه وسلم ، فخرج النبي عليه الصلاة والسلام ، وقد اجتمع بعض الناس حولهما ، فقال صلى اللّٰه عليه وسلم : ايها الناس أنما انابشر ، وانكم تختصمون الى أن تتحاكموا عندى ، ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض أى اقوى في الحجة من الاخر ،فاقضى له على نحوماا اسمع ، فمن قضيت له من اخيه شيئاً فلايأخذ ه ، فانما هى قطعه من النار، اقطعها له، فمن شاء فليأخذ ومن شاء فليدع .

(اخرجه البخارى فى المظالم : ٢/٦٨ ، ومسلم : ١٧١٣)

وفى تتمه الخبرأن كلا من المتخاصمين بكىٰ وقال كل واحد منهما : جعلت حقى من الارض لاخى فامرهما صلى اللّٰه عليه وسلم أن يقتسماالارض بينهما ويضرباعليها قرعة ويتسامحا .

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ایک دن کچھ آوازیں بلند ہوتی ہوئی سنیں آپ ﷺ نے توجہ فرمائی تو فیصلہ کے لئے آنے والے دو افراد تھے بعض ازواج مطہرات کے حجرہ کے سامنے بلند آواز سے باتیں کررہے تھے، آپ علیہ السلام حجرہ مبارک سے نکل کر ان کے پاس تشریف لائے اور کچھ دوسرے لوگ بھی جمع ہوئے، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو: میں ایک انسان ہوں، تم میرے پاس فیصلہ کے لئے مقدمہ لے کر آتے ہو، یہ بہت ممکن ہے تم میں بعض دوسرے

کے مقابلہ میں چرب زبان ہوں اپنی بات کو زیادہ اچھے انداز میں پیش کریں اور مقدمہ جیت لیں حالانکہ وہ ناحق پر ہے اب میں نے دلائل کی بنیاد پر جس کے حق میں فیصلہ کر دیا اور اس کو باطل طور پر زمین کا کچھ حصہ مل گیا تو وہ سمجھ لے کہ وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے جو میں نے اسکو دیدیا، لہذا جو چاہے آگ پر صبر کرے جو چاہے چھوڑ دے۔ (بخاری)

آگے روایت میں ہے دونوں صحابہ یہ تقریر سن کر بہت روئے اور ہر ایک نے کہا کہ یہ زمین دوسرے کی ہے مجھے نہیں چاہئے اسی کو دیدی جائے تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا ایسا کرلو کہ آپس میں برابر تقسیم کرلو۔

وقوله تعالىٰ : ﴿ واتقوا يوماً ترجعون فيه الى الله ثم توفى كل نفس ماكسبت وهم لا يظلمون ﴾ (سورة البقرة : ٢٨١)

یعنی اس دن کے عذاب سے ڈرو جس دن تم اللہ کے پاس حاضر کیے جاؤ گے، پھر ہر نفس کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا، ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔

دنیا میں جیسے اعمال ہوں گے اسی کے مطابق جزاوسزا ہوگی اس لئے دنیا میں کسی پر ظلم کرتے وقت یا کسی ظلم کی حمایت کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کو ضرور یاد رکھنا چاہئے، جس دل میں خوف خدا ہوگا وہ کبھی گناہ سے لذت نہیں حاصل کرسکتا۔

(رزقنا الله التقوىٰ)

وکیل کے ضامن ہونے کا حکم:

جب بیع وشراء وغیرہ عقود ومعاملات کے لئے کسی کو وکیل مقرر کیا جائے اور شرائط وکالت پوری ہونے کے ساتھ عقد وکالت مکمل ہوجائے گا، اب وکیل کے ہاتھ میں مؤکل کا جو مال آئے گا وہ امانت کا مال ہوگا، لہذا اگر وہ مال وکیل کی تعدی یا کسی سستی وغفلت کے بغیر ہلاک ہوجائے تو وکیل کے ذمہ اس کا ضمان لازم نہ ہوگا ہاں البتہ اگر وکیل کی تعدی سے یا حفاظت میں غفلت سے ہلاک ہوجائے تو ضمان لازم ہوگا، تعدی کی صورتوں میں سے یہ بھی ہے کہ سامان فروخت کرنے کے بعد قیمت وصول کرنے سے پہلے مال اس کے حوالہ کردے بعد میں قیمت وصول نہ ہوسکے یا مؤکل کے لئے جو مال خریدا اس کو خود ہی استعمال کرنا شروع کردے یا یہ کہ غیر محفوظ جگہ پر چھوڑ دے وغیرہ۔ واللہ اعلم

وکالت ختم ہونے کی صورتیں:

(۱) اگر وکیل یا مؤکل میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو وکالت کا معاملہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

(۲) یا مؤکل نے وکیل کو وکالت سے معزول کر دیا۔

(۳) یا وکیل نے خود اپنے کو معزول کر لیا یعنی مؤکل سے کہہ دیا کہ میں آئندہ آپ کی طرف سے وکالت نہیں کر سکتا۔

(٤) یا مؤکل نے جس کام کے لئے وکیل کیا تھا پھر وہ کام کو خود ہی انجام دیدے۔

(٥) یا جس مال کو فروخت کرنے کے لئے وکیل مقرر کیا تھا وہ مال ہی ہلاک ہو گیا یا مکان تھا منہدم ہو گیا وغیرہ۔

(٦) یا مؤکل خود مفلس ہو گیا، ان تمام صورتوں میں وکالت ختم ہو جائے گی اس کے بعد وکیل کا تصرف نافذ نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

کفالت کے احکام

لغوی معنی:

الضم ، كقوله تعالىٰ : ﴿ و كفلها زكريا ﴾

یعنی مریم کی حفاظت کو اپنے ذمہ لازم کر لیا۔

وقوله عليه السلام : "انا و كا فل اليتيم كهاتين فى الجنة . "

(اخرجه البخاری و مسلم)

یعنی ارشاد فرمایا میں اور وہ شخص جو کسی یتیم کی پرورش کو اپنے ذمہ لازم کرے جنت میں قریب قریب ہوں گے۔

شرعی معنی:

ضم ذمة الكفيل ، الى ذمة الاصيل فى المطالبة لا فى الدين .

یعنی اصطلاح شرع میں کفالت کا معنی یہ ہے کہ کفیل اپنے ذمہ کو اصیل کے ذمہ کے ساتھ دین کے مطالبہ میں ملاتا ہے، نہ کہ دین کی ادئیگی میں۔

کفالہ کی خاص اصطلاحیں:

کفیل: دوسرے کی طرف ذمہ داری اٹھانے والا۔

مکفول عنہ: وہ شخص جس کی طرف سے کفیل ذمہ دار بنا۔

مکفول لہ: وہ حقدار جس کے حق کی وصولی کے لئے کفیل ضامن بنا۔

مکفول بہ: وہ مال جس کا کفیل ذمہ دار بنا۔

کفالہ کی مشروعیت:

کفالت یہ ایک بڑی ذمہ داری ہے کہ بلا کسی معاوضہ کے دوسرے کی طرف اس کے مال وحقوق کی ادائیگی کا ذمہ دار بننا۔

لیکن لوگوں کی حاجات اور ضرورتوں کے پیش نظر شریعت مطہرہ نے اس کی اجازت دی ہے۔

کما فی قولہ تعالی : ﴿ ولمن جاء به حمل بعير وانا به زعيم ﴾

(يوسف : ٧٢)

یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ جب پیالہ گم ہوگیا تو تلاش کرتے وقت انعام کا اعلان ہوا حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے، کہ جو پیالہ لاکر دے گا اس کو انعام میں ایک اونٹ کا بوجھ غلہ دیا جائے گا، میں اس کا ضامن ہوں۔

و كما روى : أن النبى صلى الله عليه وسلم أتى بجنازة رجل ليصلى عليه : فقال هل ترك شيئاً ؟ قالوا لا، قال هل عليه دين ؟قالوا نعم،ديناران، فقال صلوا على صاحبكم ، قال ابو قتادة : هما على يا رسول الله اى انا ضامن لوفاء دينه ، فصلى عليه النبى صلى الله عليه وسلم . (اخرجه البخارى فى كتاب الكفالة)

یعنی ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک جنازہ میں حاضر ہوئے نماز پڑھانے سے پہلے آپ نے پوچھا کہ میت نے دین کی ادائیگی کے لئے کچھ مال چھوڑا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں دو دینار ان کے ذمہ لازم ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ، پھر آپ لوگ خود اس میت پر نماز پڑھ لیں، (یعنی جنازہ کی نماز نہیں پڑھاؤں گا) چنانچہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کی ادائیگی کو اپنے ذمہ لازم لیا اس کے بعد آپ ﷺ نے جنازہ پڑھایا۔

فلما فتح الله عليه الفتوح ، اى فتحت عليه البلاد قال صلى الله عليه وسلم ، انا اولى بالمؤمنين من انفسهم ، فمن ترك دينا فعلى قضاء ه ومن ترك مالا فلورثته .

(اخرجه البخارى ايضا فى الكفالة : ٢ / ٤٠ / باب الدين)

یعنی جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا، اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں مؤمنین کا ان کی جان سے زیادہ قریب ہوں لہٰذا آئندہ کوئی شخص مقروض ہونے کی حالت میں انتقال کر جائے تو اس کے قرض کی ادئیگی میرے ذمہ ہے۔

کفالہ کی اقسام:

کفالہ کی دو قسمیں:

(۱) کفالہ بالنفس

(۲) کفالہ بالمال

(۱) کفالہ بالنفس کے معنی یہی ہیں کہ کوئی شخص اس بات کی ضمانت لے کر میں مکفول کو مکفول لہ کے پاس یا حاکم کے پاس حاضر کردوں گا جس کو آج کے دور میں شخصی ضمانت کہا جاتا ہے، اب ضمانت کے بعد اگر وقت مقررہ پر حاضر نہ کرے تو اسی ضامن کو قید کیا جائے گا، تاکہ اس کو حاضر کردے، البتہ کفیل بالنفس سے وہ حق وصول نہیں کیا جائے جو مکفول کے ذمہ واجب ہوا الا یہ کہ کفیل مال کا بھی ضامن ہے۔

(۲) اور کفالہ بالمال میں اگر مکفول عنہ مال ادا نہ کرے تو کفیل کے ذمہ مال کی ادائیگی لازم ہوگی، بشرطیکہ دین صحیح ہو اور دین کی مقدار معلوم ہو یا کفالہ بالعین یعنی کسی متعین چیز کی کفالت اٹھائی مثلاً مبیع کے بارے میں کہا کہ اگر بائع نے ادا نہ کیا تو میرے ذمہ ہے یا مال مغصوب غاصب نے فلاں وقت تک واپس نہ کیا تو میں ذمہ دار ہوں۔

کفالہ کے مسائل:

(1) کفالہ مکفول لہ کی اجازت اور رضاء کے بغیر درست نہیں کیوں کہ یہ اس کا حق ہے، اسی طرح دوسرے عقود کی طرح کفالہ میں بھی ایجاب وقبول ضروری ہے۔

(2) کفالہ کو کسی مناسب شرط کے ساتھ معلق کرنا جائز ہے، مثلاً اگر آپ نے فلاں

سے سودا کرلیا اور وہ ادا نہ کرے تو مبیع حوالہ کرنا میری ذمہ داری ہوگی یا اس کا غصب ثابت ہو جائے تو مال آپ کے حوالہ کرنا میرے ذمہ ہے۔

(3) کفالہ ثابت ہونے کے بعد مکفول لہ کو اختیار ہوگا چاہے تو اصل مدیون سے اپنے حق کا مطالبہ کرے یا کفیل سے مطالبہ کرے الا یہ کہ اصیل نے شرط لگائی تھی کہ آج سے میں بری ہوں کفیل ہی اصل ذمہ دار ہے اس صورت میں یہ کفالہ حوالہ بن جائے گا اور اصیل بری ہوگا لیکن اگر کسی وجہ سے کفیل سے مال وصول نہ ہو سکے تو اصیل کے ذمہ پھر لوٹ آئے گا۔

(4) کفالۃ بالنفس میں مکفول بہ مر جائے تو کفیل بالنفس بری ہو جائے گا جبکہ کفالت بالمال میں مکفول عنہ کی موت سے کفیل بری نہ ہوگا۔

(5) مکفول لہ کو حق حاصل ہے کہ عقد کفالہ فسخ کر دے اگر چہ اس پر مکفول عنہ اور کفیل راضی نہ ہو لیکن کفیل یا اصیل کو مکفول لہ کی رضامندی کے بغیر عقد کفالہ فسخ کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

(6) کفیل کو حق نہیں کہ قرض ادا کرنے سے پہلے مکفول عنہ سے مال کا مطالبہ کرے، اگر حقدار مقروض کو معاف کردے یا حق اس سے وصول کرلے تو کفیل بھی بری ہو جائے گا، اگر حقدار کفیل کو بری کردے تو مقروض بری نہ ہوگا، اس کے ذمہ قرض برقرار رہے گا۔

(7) نفس حدود و قصاص کے لئے کفیل بننا جائز نہیں کیوں کہ حدود و قصاص میں نیابت نہیں چل سکتی، البتہ مکفول کو حاضر کرنے کی کفالت درست ہے۔

(8) جو قرض مؤجل ہو اس کا حالاً کفیل بننا اسی طرح جو قرض حالی ہو اس کا مؤجلاً کفیل بننا دونوں جائز ہیں۔

کفالہ کا ایک عجیب واقعہ:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک عجیب واقعہ نقل فرمایا کہ ''رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ ''بنی اسرائیل میں ایک شخص دوسرے کے پاس قرض مانگنے کے لئے گیا، مالدار شخص نے کہا کہ گواہ لاؤ تاکہ میں ان کے سامنے قرض دوں، تاکہ وہ گواہ رہے، اس شخص نے کہا کہ گواہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات کافی ہے، پھر مالدار نے کہا کہ کوئی ضامن لاؤ (تاکہ وہ تمہارا ضامن بنے) اس شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ میرے

ضامن بننے کے لئے کافی ہے، تو مالدار نے کہا تو نے سچ کہا ہے، اس کے بعد ایک ہزار دینار دیئے ایک متعین مدت کے لئے، جب وہ مدت پوری ہوگئی مقروض شخص ایک ہزار دینار لے کر روانہ ہوا، (اس کے اور مالدار کے گاؤں کے درمیان دریا حائل تھا) اور کشتی کے انتظار میں دریا کے کنارہ کھڑا رہا لیکن کوئی کشتی نہ مل سکی، دن پورا ہو رہا تھا، اس لئے اس نے یہ ترکیب کی کہ ایک لکڑی لی اس میں سوراخ کر کے ہزار دینار بھر دیئے پھر اس کو اچھی طرح بند کر دیا ایک پرچی بھی اس میں رکھ دی اس کے بعد دریا کے کنارے کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ میں نے آپ کو اپنے معاملہ کا گواہ اور ضامن بنایا تھا اب میں نے قرض ادا کرنے کے لئے مقدور بھر کوشش کی لیکن میری قدرت میں نہیں ہے اب یہ دینار تیرے پاس امانت ہیں، یوں کہہ کر سمندر میں پھینکا وہ سمندر کے تہہ میں چلا گیا، پھر سواری تلاش کرتا رہا، دوسری طرف مالدار شخص بھی دریا کے کنارہ میں کھڑے انتظار کر رہا تھا کہ مقروض شخص آج میرا مال لے کر آئے گا لیکن کوئی کشتی نظر نہیں آئی اتنے میں دیکھا کہ ایک لکڑی بہہ رہی ہے جلانے کی نیت سے اس کو اٹھایا اور گھر لے جا کر اس کو چیرا تو اس میں سے دینار اور پرچی ملی، اگلے دن وہ مقروض شخص بھی پہنچ گیا اور اس سے معذرت کی کہ وقت مقررہ پر میں آپ کا قرض سواری نہ ملنے کی مجبوری سے ادا نہ کر سکا اور واقعہ سنایا، تو مالدار شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امانت میرے پاس پہنچا دی ہے، پھر ہزار دینار اسی کو دوبارہ ہدیہ کر دیا اور کہا کہ اللہ آپ کا بھلا کرے یہ ہزار دینار لے کر گھر جائیں۔

(بخاری شریف باب الكفالة فی القرض: ۳۹/۲)

یہ ہے اخلاص وفاداری، امانت داری، اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد کی برکت، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس کی توفیق دے۔ آمین

احکام حوالہ

حوالہ کے احکام:

حوالہ لغت میں نقل وتحویل کو کہا جاتا ہے۔

"يقال تحول حاله من الفقر الى الغناء ."

یعنی اس کی حالت فقر سے مالداری کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔

اصطلاحی معنی:

" نقل الدين من ذمة الى ذمة شخص آخر ."

یعنی اصطلاح فقہاء میں حوالہ کہا جاتا ہے قرض کو ایک شخص کی ذمہ سے دوسرے کی ذمہ داری کی طرف پھیر دینا۔

حوالہ کی اصطلاحات:

محیل: مدیون جو اپنے ذمہ واجب الاداء قرض کو دوسرے کے حوالہ کر رہا ہے۔

محال علیہ: جو دوسرے شخص کے قرض کی ادائیگی کو اپنے ذمہ میں قبول کر رہا ہے، دائن (محتال لہ) وہ قرض خواہ جس کا قرض محیل کے ذمہ لازم ہے۔

حوالہ کی مشروعیت:

حوالہ کی مشروعیت حدیث و اجماع سے ثابت ہے۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال "مطل الغنى ظلم و اذا اتبع احدكم على ملئ فليتبع . "

(اخرجه البخاری فی كتاب الحوالة : ٣٧/٢ ، ومسلم : رقم ١٥٦٤)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مالدار کا قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لینا ظلم ہے۔

جب تم میں سے کسی کو (قرض کے مطالبہ میں) مالدار کے حوالے کیا جائے تو اسی کا پیچھا کرے، یعنی محتال علیہ (مالدار) سے مطالبہ کرے، (بخاری و مسلم)

وقال فی اللباب : الحوالة جائزة بالديون دیون الاعيان وتصح برضاء المحيل وهو المديون ، والمحتال وهو الدائن، لان فيه انتقال حقه الى ذمه اخرىٰ ، والذمم متفاوتة والمحال عليه وهو يقبل الحوالة، لان فيها الزام الدين ولا الزام بلا التزام .

(اللباب فی شرح كتاب القدوری : ١١٠/٢)

حوالہ کے احکام:

(۱) دائن، مدیون محتال علیہ، کی رضا مندی سے عقد حوالہ مکمل ہونے کے بعد مدیون

کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔

(۲) اس کے بعد دائن کو حق ہوگا کہ اپنے قرض کا محتال علیہ سے مطالبہ کرے۔

(۳) اگر قرض کی ادائیگی سے پہلے محتال علیہ انتقال کر جائے یا غریب ہو جائے یا قرض ادا کرنے سے انکار کر دے، تو دائن کو حق ہوگا کہ دوبارہ مدیون سے اپنے قرض کا مطالبہ کرے، کیوں کہ مدیون سے مطالبہ کا حق اس وقت ساقط ہوتا ہے جب اسکا قرض محتال علیہ سے وصول ہو، وصول نہ ہونے کی صورت میں اس کا حق باقی رہے گا۔ (ملتقی الابحر : ۲/۲٦٦)

(٤) اگر محتال علیہ قرض ادا کر دے تو اب اس کو مدیون سے وصول کرنے کا حق حاصل ہوگا، دو شرطوں کیساتھ، ۱۔ اس نے مدیون کے حکم سے ذمہ داری اٹھائی ہو، ۲۔ اس کے ذمہ مدیون کا کوئی قرض نہ ہو، اگر قرض ہو تو مطالبہ کا حق نہ ہوگا، کیوں کہ اس نے اپنا حق تو پہلے وصول کر لیا۔

''احکام الجعالۃ'' یعنی انعامات کے احکام:

کسی کام کے انجام دینے والے کے لئے انعام مقرر کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے، مثلاً جو امتحان میں اول آئے گا اس کے لئے اتنا انعام ہوگا یا کسی کی کوئی چیز گم ہوگئی اس کے لئے اعلان کرے جو تلاش کر کے لا کر دے گا اس کو اتنا انعام دیا جائے گا یا گھوڑ دوڑ یا کشتی وغیرہ میں انعام کا اعلان کیا جائے اس طرح کا انعام مقرر کرنا بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

ہم گھوڑ دوڑ کے سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کا ایک فتویٰ نقل کرتے ہیں جس کے ضمن میں انعام مقرر کرنے کے جواز کی تفصیل شرائط وغیرہ تمام باتیں واضح ہو جائیں گی۔

گھوڑ دوڑ کے شرعی احکام:

آج کل مسلمانوں کی معاشرت، معاملات، اخلاق اسلام سے جس قدر بیگانہ ہو گئے ہیں وہ کسی پر مخفی نہیں، سود، قمار، رشوت، جو قرآن وحدیث کی بے شمار تصریحات سے باجماع امت حرام ہیں، آج مسلمانوں کا کوئی بازار، کوئی سوسائٹی، کوئی گھر ان سے خالی نہ رہا، الا ماشاء اللہ۔

ان بلاؤں کا شکار ایک تو وہ طبقہ ہے جس کو حلال وحرام اور شریعت کی موافقت ومخالفت کی طرف کوئی التفات ہی نہیں ان کے سامنے تو ان کے احکام پیش کرنا ایک درجہ میں بے سود ہے، لیکن ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو کچھ نہ کچھ اس کی فکر رکھتا ہے، مگر ناواقفیت یا غفلت کی وجہ سے ان میں مبتلا ہے، ایسے لوگوں کے لئے ضرورت ہے کہ ان کو صحیح احکام سے آگاہ کیا جائے، انہیں مسائل میں

سے آج کل ایک مسئلہ ریس (گھوڑ دوڑ) کا ہے جس میں ابتلا عام ہے شریعت اسلام کے عادلانہ اور معتدلانہ نظام میں نہ ہر کھیل سے مطلقاً روکا گیا ہے اور نہ اس کو غیر محدود وسعت دی گئی ہے، بلکہ جن کھیلوں کے ذریعہ قوت جہاد اور قوت جسمانی پیدا ہوتی ہے ان کو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن قرار دیا گیا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے اس کے استحسان کو ثابت فرمایا آپ ﷺ نے خود گھوڑ دوڑ کرائی، پیادہ دوڑ پر انعام دیا، تیر اندازی اور پیراکی سیکھنے کی ہدایت فرمائی، حبشیوں کی نیزہ بازی کی مشق کا خود کھڑے ہوکر معائنہ فرمایا اور عائشہ صدیقہؓ کو دکھلایا وغیرہ، اس کے مقابل ایسے کھیل جن میں کوئی دنیاوی فائدہ نہیں یا جن میں انفرادی یا اجتماعی مضرتیں ہیں ان کو سختی سے منع فرمایا انہیں مضر صورتوں میں وہ کھیل ہیں جن میں قمار (جوا) ہو۔

گھوڑ دوڑ جیسا کہ اوپر معلوم ہوا ایک مفید کھیل ہے اور رسول اللہ ﷺ نے قولاً وعملاً اس کی اجازت دی ہے اور اس میں بازی لگانے اور بازی لے جانے والے کے لئے مشروط انعام ومعاوضہ کی بھی خاص شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے لیکن افسوس ہے کہ آج کل گھر کے جواہرات چھوڑ کر دوسروں کے دروازوں پر دریوزہ گری کو مایہ ناز سمجھنے لگے، یہاں تک کہ عام کھیلوں میں بھی غیروں کی نقالی ہی رہ گئی اس نقالی میں کوئی دوسری مضرت نہ ہوتی جب بھی ایک غیرت مند قوم کے لئے نازیبا تھی خصوصاً جب کہ غیر مسلموں نے قمار جیسی حرام چیزوں کو ان میں شامل کردیا تو مسلمان پر لازم ہوگیا کہ ان سے یکسر اجتناب کرے۔

ہماری گھوڑ دوڑ بھی اسی مشق ستم کا نشانہ بن گئی جو چیز اسباب جہاد میں داخل اور ذریعۂ عبادت تھی وہ اب محض ایک قمار اور لہو ولعب بن کر رہ گئی اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ہمارے محترم عزت مآب الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل پاکستان کو کہ انہوں نے گھوڑ دوڑ کے متعلق علماء سے استفسار کرنے کی ضرورت محسوس فرما کر بعض علماء سے فتویٰ حاصل فرمایا پھر علماء پاکستان سے استفسار کیا کہ اس سوال کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک مفید مجموعہ ہوگیا، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ عام فائدہ کیلئے اس کو بصورت رسالہ شائع کردیا جائے جس میں گھوڑ دوڑ کی جائز اور ناجائز قسمیں اور جائز قسم کیلئے ضروری شرائط کی تفصیل درج ہے۔ واللہ الموافق والمعین

بہت سے کام ایسے ہیں کہ ان کی صورت کھیل تماشہ ہے مگر ان کے ذریعہ قوتِ جہاد، صحت جسمانی وغیرہ کے اہم فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں ایسے کھیلوں کو شریعت اسلام نے نہ صرف جائز

بلکہ خاص شرائط کے ساتھ ایک درجہ مستحسن سمجھا ہے اور ان میں بازی لگانے اور مسابقت کرنے کی بھی اجازت دی ہے بشرطیکہ اس میں قمار کی صورت نہ ہو۔ جس طرح ایسے کھیلوں سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے جن میں قمار بازی ہو یا جن کے سبب میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہیں یا جن میں انفرادی یا اجتماعی مضرتیں ہیں۔

گھوڑ دوڑ:

حدیث میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑ دوڑ کرائی (جصاص: ۱/۸۸) اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا

" لاسبق الا فی خُفّ او حافر او نصل ."

(جامع الصغیر، مسند احمد عن ابی هریرة رضي الله عنه)

حدیث میں لفظ سبق وارد ہوا ہے، جس کے معنی اس معاوضہ یا انعام کے ہیں جو کسی بازی میں آگے بڑھنے والے کو دیا جاتا ہے (صرح بہ فی شرح الجامع الصغیر) اس لئے معنی حدیث کے یہ ہیں کہ کسی مسابقت بازی میں معاوضہ یا انعام مقرر کرنا جائز نہیں بجز اونٹوں کی دوڑ یا گھوڑ دوڑ یا تیر اندازی (نشانہ بازی) کی احادیث مذکورہ سے معلوم ہوا کہ خاص صورتوں میں بازی و مسابقت اور اس پر معاوضہ یا انعام مقرر کرنا صرف مذکورہ تین چیزوں میں جائز ہے اور بعض حضرات فقہاء نے پیادہ دوڑ میں بازی لگانے کو بھی مذکورہ تین قسموں میں شامل کر کے چار قسمیں کر دی ہیں، کیوں کہ پیادہ دوڑ بھی قوتِ جہاد کے اسباب میں سے ہے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک حدیث اس کی مؤید ہے۔ (شامی: ۵/۳۵۵، کتاب الکراهیة)

پھر گھوڑ دوڑ وغیرہ میں بازی اور اس پر معاوضہ یا انعام کی چند صورتیں ہیں جن میں حسب تشریح قرآن وحدیث بعض جائز ہیں بعض ناجائز ہیں۔

گھوڑ دوڑ کی جائز صورتیں:

مندرجہ ذیل تمام صورتوں میں جواز کے لئے دو صورتیں لازمی ہیں اول یہ کہ اس کا مقصد محض کھیل تماشہ نہ ہو بلکہ قوتِ جہاد یا ورزش جسمانی ہو، دوسرے یہ کہ جو انعام مقرر کیا جائے وہ معلوم متعین ہو، مجہول یا غیر معین نہ ہو۔ (شامی وغیرہ)

(1) مشروط معاوضہ گھوڑ دوڑ کی جائز صورت ایک یہ ہے کہ فریقین جو اپنے اپنے

گھوڑے دوڑا کر بازی لگا رہے ہیں آپس میں کسی کو کسی سے کچھ لینا دینا نہ ہو، بلکہ حکومت وقت یا کسی تیسرے شخص یا جماعت کی طرف سے بطور انعام کوئی رقم آگے بڑھنے والے کے لئے مقرر ہو، بدائع الصنائع میں ہے:

کذلك مايفعله السلاطين وهو ان يقول السلطان لرجلين من سبق كما فله كذا فهو جائز لما بيّنا ان ذلك من باب التحريض على استعداد اسباب الجهاد خصوصا من السلطان .

(بدائع : ٦/ ٢٠٦ و شامی : ٥/ ٣٥٤)

(2) دوسری صورت یہ ہے کہ آگے بڑھنے والے کیلئے معاوضہ یا انعام فریقین ہی میں سے ہو مگر صرف ایک طرف سے ہو دوطرفہ شرط نہ ہو، مثلاً زید وعمر گھوڑوں کی دوڑ میں بازی لگا رہے ہیں، زید یہ کہے کہ اگر عمر آگے بڑھ گیا تو میں اس کو ایک ہزار انعام دوں گا، دوسری طرف سے یہ نہ ہو کہ اگر زید بڑھ گیا تو عمر ایک ہزار دے گا دوطرفہ شرط کی صورت قمار حرام ہے۔

(3) فریقین میں دوطرفہ شرط بھی حنفیہ کے نزدیک ایک خاص صورت میں جائز ہے وہ یہ کہ فریقین ایک تیسرے گھوڑے سوار مثلاً خالد کو اپنے ساتھ شریک کرلیں پھر اس کی دوصورتیں ہیں:

(الف) شرط کی صورت یہ ٹھہرے کہ زید آگے بڑھے تو عمر ایک ہزار روپیہ اس کو دے اور عمر آگے بڑھے تو زید اتنی ہی رقم اس کو ادا کرے اور اگر خالد بڑھ جائے تو اس کو کچھ دینا کسی کے ذمہ نہیں۔

(ب) شرط اس طرح ہو کہ خالد آگے بڑھ جائے تو زید وعمر دونوں اس کو ایک ایک ہزار روپیہ دیں اور زید وعمر دونوں یا ان میں سے کوئی ایک آگے بڑھے تو خالد کے ذمہ کچھ نہیں، لیکن زید وعمر میں باہم جو آگے بڑھے دوسرے پر اس کو ایک ہزار ادا کرنا لازم آئے گا۔

ان دونوں صورتوں میں جو تیسرا آدمی شریک کیا گیا ہے اس کو حدیث کی اصطلاح میں مُحَلِّل کہا گیا ہے اور دونوں صورتوں میں یہ امر مشترک ہے کہ تیسرے آدمی کا معاملہ نفع وضرر میں دائر نہیں بلکہ ایک صورت میں اسکا نفع متعین ہے، دوسری میں اس کا کچھ نقصان نہیں۔

شرط اس تیسری صورت کے لئے حسب تصریح حدیث یہ ضروری شرط ہے کہ یہ تیسرا گھوڑا

زید وعمر کے گھوڑوں کیساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہو جس کی وجہ سے اس کے آگے بڑھنے اور پیچھے رہ جانے کے دونوں احتمال مساوی ہوں، ایسا نہ ہو کہ کمزوری یا عیب کی وجہ سے اس کا پیچھے رہنا عادۃً یقینی ہو یا زیادہ قوی اور چالاک ہونے کی وجہ سے اس کا آگے بڑھ جانا یقینی ہو، حدیث میں ہے:

من ادخل فرسا بین فرسین وھو لا یأمن ان یسبق فلا بأس به ومن ادخل فرسا بین فرسین وھو آمن ان یسبق فھو قمار.

(ابو داؤد ومسند احمد)

بدائع الصنائع میں شرائط جواز بیان کرتے ہوئے مذکور الصدر پوری تفصیل لکھی ہے۔

(بدائع الصنائع: ٦/٢٠٦ نیز عالمگیری کتاب الخطر والاباحة باب ٦، شامی: ٥/٢٥٤)

میں بھی یہ تفصیل موجود ہے۔

گھوڑ دوڑ کی ناجائز صورتیں:

(1) گھوڑ دوڑ کی بازی محض کھیل تماشہ یا روپیہ کی طمع کے لئے ہو اور استعداد قوتِ جہاد کی نیت نہ ہو۔ شامی

(2) معاوضہ یا انعام کی شرط فریقین میں دوطرفہ ہو اور کسی تیسرے کو اپنے ساتھ بتفصیل مذکورہ بالا نہ ملایا جائے تو یہ قمار اور حرام ہے۔ (بدائع، شامی، عالمگیری)

(3) ریس کی مروجہ شکل کہ گھوڑوں کی دوڑ کسی کمپنی کی طرف سے ہوتی ہے گھوڑے کمپنی کی ملک اور سوار اس کمپنی کے ملازم اور دوسرے لوگ گھوڑوں کے نمبر پر اپنا داؤ لگاتے ہیں جس کی فیس ان کو داخل کرنا ہوتی ہے۔ جس نمبر کا گھوڑا آگے بڑھ جائے اُس نمبر پر داؤ لگانے والے کو انعامی رقم مل جاتی ہے، باقی سب لوگوں کی فیس ضبط ہو جاتی ہے۔

یہ صورت مطلقاً حرام ہے، اول تو اس ریس کو قوتِ جہاد پیدا کرنے سے کوئی واسطہ نہیں، کیوں کہ بازی لگانے والے نہ گھوڑے رکھتے ہیں نہ سواری کی مشق سے ان کو کچھ کام ہے، ثانیاً جو صورت معاوضہ کی رکھی گئی ہے کہ ایک شق میں داؤ لگانے والے کو انعامی رقم ملتی ہے اور دوسری شق میں اس کو اپنی دی ہوئی فیس سے دست بردار ہونا پڑتا ہے یہ عین قمار ہے جو بنص قرآن حرام ہے۔

مروجہ ریس کی جو صورت معلوم ومعروف تھی اس کا حکم لکھا گیا ہے اگر اس میں کچھ مزید تفصیلات ہوں تو وہ تفصیلات لکھ کر ان کے متعلق دوبارہ سوال کیا جا سکتا ہے۔

تنبیہ:

جو احکام اور جائز و ناجائز کی تفصیل گھوڑوں کی دوڑ میں لکھی گئی ہے یہی حکم اونٹوں کی دوڑ اور پیادہ دوڑ اور نشانہ بازی لگانے کا ہے۔ (کما مرّ من الحدیث)

دوسرے کھیلوں میں بازی لگانے کے احکام:

مذکور الصدر اقسام چہار گانہ یعنی گھوڑ دوڑ، اونٹوں کی دوڑ، پیادہ دوڑ، نشانہ بازی کے علاوہ دوسرے کھیلوں میں کچھ تفصیل ہے۔

مُفید کھیل:

جن کھیلوں سے کچھ دینی یا دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ جائز ہیں بشرطیکہ اُنہیں فوائد کی نیت سے ان کو کھیلا جائے، محض لہو ولعب کی نیت نہ ہو، لیکن اس کی بازی پر کوئی معاوضہ یا انعام مشروط مقرر کرنا جائز نہیں۔

مثلاً گیند کا کھیل اس سے جسمانی ورزش ہوتی ہے یا لاٹھی وغیرہ کے کھیل یا پہلوانوں کی کشتی وغیرہ جو قوتِ جہاد میں معین ہو سکتے ہیں، اسی طرح معمہ بازی، شعر بازی، تعلیمی تاش، وغیرہ ہار جیت کی بازی لگانا جائز ہے مگر اس پر کوئی رقم معاوضہ کی مقرر کرنا جائز نہیں، بلکہ حرام ہے۔

ولا یجوز الاستباق فی غیر هذه الاربعة كالبغل بالجعل واما بلا جعل فيجوز فی کل شئی وقال بعد ذلك لان جواز الجعل فيما مر انما ثبت بالحديث على خلاف القياس فيجوز ما عداها بدون الجعل وفی القهستانی من الملتقط من لعب بالصولجان يريد الفروسية يجوز وعن الجواهر قد جاء الاثر فی رخصة المصارعة لتحصيل القدرة على المقاتلة دون التلهی فانه مکروه .

(شامی : ۳۵۵/۵)

بے فائدہ کھیل تماشے:

ایسے کھیل تماشے جن کے تحت کوئی معتد بہا فائدہ دین ودنیا کا نہیں ہے وہ سب ممنوع اور ناجائز ہیں خواہ ان پر بازی لگائی جائے یا انفرادی طور پر کھیلا جائے پھر بازی پر کوئی رقم لگائی جائے یا نہیں، اور رقم بھی دو طرفہ ہو یا ایک طرفہ بہر حال ایسے لغو کھیل شرعاً مطلقاً ناجائز ہیں،

حدیث میں ہے:

" کل لهو المسلم حرام الاثلاثة ملاعبة اهله و تاديبه لفرسه ومناضلة بقرسه ." (شامی : ٥/٢٥٣)

کبوتر بازی، پتنگ بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، چوسر، شطرنج، تاش، کتوں کی ریس وغیرہ سب اسی ناجائز صورت کے افراد ہیں۔ (ماخوذ از جواهر الفقه : ٢/٣٥٢)

ان کھیلوں کے احکام کی مزید تفصیلات جلد اول میں گذر چکی ہے۔

احکام الھبۃ

''ہبہ لغت میں بلاعوض عطیہ واحسان کو کہا جاتا ہے۔''

كمافي قوله تعالیٰ : ﴿ يهب لمن يشاء اناثا و يهب لمن يشاء الذكور ﴾ (شوری : ٤٩)

شرعاً : تمليك عين بلاعوض، على وجه الاخوة و المحبة، كما قال صلى الله عليه وسلم ، تهادوا تحابوا . (بخاری ادب المفرد)

شرعاً ہبہ کہا جاتا ہے کسی چیز کو بلاعوض محض اخوت ومحبت کی بنیاد پر دوسرے کو مالک بنانا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک دوسرے کو ہدیہ دو اس اس سے آپس میں محبت پیدا ہوگی۔

آپ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے اور بدلہ بھی عطا فرماتے تھے۔

وقال صلى الله عليه وسلم : " لو اهدى الى كراع قدم شاة لقبلت ولو دعيت عليه لاجبت ."

(اخرجه احمد ، ترمذی ، بخاری : ٢/٨٧)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مجھے بکری کی ایک ٹانگ بھی ہدیہ کیجائے تو میں اس کو قبول کروں گا، اگر اس کی دعوت کی جائے تو اس کے لئے حاضر ہوں گا۔

ہبہ کی مشروعیت کی حکمت:

شریعت مطہرہ نے ہدیہ دینے کو مشروع فرمایا اس کی ترغیب دی کیوں کہ اس میں ایک مسلمان بھائی کی دلجوئی ہے اور محبت کے تعلق کو جوڑتا ہے، ہدیہ دلوں سے عداوت ونفرت کا خاتمہ کرتا ہے،

محبت وتعلق کا بیج بوتا ہے، ایک دوسرے کے لئے بھلائی وخیر کی طرف راغب کرتا ہے۔

احسن الی الناس تستعبد قلوبهم

فطالما استعبد الانسان احسان

یعنی لوگوں پر احسان کر، اور ان کے دلوں کو خرید لے

کیوں کہ عام طور پر احسان انسان کو غلام بنا لیتا ہے

یعنی اس کی تابعداری کو خرید لیتا ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ ہدیہ کو رد نہیں فرماتے تھے، تا کہ ہدیہ کرنے والے کا دل نہ ٹوٹے، اور ہدیہ لانے والے کو بدلہ میں ہدیہ سے افضل وبہتر چیز عنایت فرماتے، آپ علیہ السلام خواتین کو تعلیم فرماتے:

"یا نساء المسلمات ، لاتحقرن جارة لجارتها ولو فرسن شاة ."

(بخاری کتاب الھبہ : ۲/۸۷)

''اے مسلمان خواتین، کوئی خاتون اپنی پڑوسن کو معمولی چیز ہدیہ کرنے کو حقیر نہ سمجھے، اگر چہ بکری کا ایک کھر ہی ہو'' اسی طرح بخاری شریف میں روایت ہے کہ صحابہ کرام کو آپ ﷺ کا حضرت عائشہؓ سے محبت فرمانا معلوم تھا اس لئے جوکوئی آپ ﷺ کو ہدیہ کرنا چاہتا تو انتظار کرتے یہاں تک کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری ہوتی تو حضرت عائشہؓ کے گھر آپ ﷺ کے لئے ہدیہ بھیجتے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے لوگوں کے اس عمل کے متعلق آپ ﷺ سے گفتگو کی ،تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے عائشہ کے بارے میں ایذاء مت پہنچاؤ، کیوں کہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ کسی اور بیوی کے بستر پر مجھ پر وحی نہیں اترتی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) میں اس خیال سے توبہ کرتی ہوں۔ (اخرجه البخاری : ۲/۸۷)

حاصل یہ ہے کہ ہدیہ کا عمل صحابہ میں جاری تھا اور آپ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے اور استعمال فرماتے، صدقہ اگر کوئی لاتا تو وہ استعمال نہیں فرماتے بلکہ غریب صحابہ کو کھلا دیتے تھے۔

ہبہ کے ارکان اور شرائط:

کسی کو کوئی چیز ہدیہ کرنا شرعاً ایک تبرع محض ہے، اس لئے بیع وشرا کی طرح مستقل ایجاب وقبول کی تو ضرورت نہیں، لیکن ہبہ کیلئے ایسے الفاظ کا ہونا ضروری ہے، جو بلا عوض کسی کو مالک

بنانے پر دلالت کرے، عربی میں الفاظ "وھبت" ہبہ کردیا "نحلت" عطیہ دیا "اعطیت" آپ کو مالک بنا کر دیدیا، جب کسی ایسے لفظ جو مالک بنانے پر دلالت کرے کسی کو مالک بنادے، تو ہبہ مکمل ہوجائے گا، البتہ ہبہ تام ہونے کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ وہ مال ہبہ کرنے والے کا مملوک ہواور تقسیم شدہ ہو، جدگانہ طور پر ہبہ کرکے، مالک بنادے، تو موھوب لہ کے قبضہ کرنے سے ہبہ تام ہوجائے گا، گویا کہ واھب کی طرف سے تملیک موھوب لہ کی طرف سے قبضہ ضروری ہوا، اس کے بغیر ہبہ تام نہ ہوگا، اس کو ایجاب وقبول سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اسی طرح واھب عاقل بالغ ہونا، شئی موھوب کا مالک ہونا اور شرعاً تصرفات کے بارے میں اس پر کسی قسم کی پابندی نہ ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح موھوب کا قیمت والا مال ہونا ضروری ہے، لہٰذا شراب، مردار، خنزیر، وغیرہ ہبہ کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح شئی موھوب پر قبضہ کرنا ممکن ہونا ضروری ہے، لہٰذا جو دودھ ابھی تک تھن میں ہے یا جو اون جانور کی پشت پر ہے ان کا ہبہ کرنا جائز نہیں، ہاں البتہ ہبہ کے بعد دودھ نکال کر یا اون کاٹ کرکے دیدے تو صحیح ہوجائے گا۔

مرض الموت میں ہبہ کرنے کا حکم:

مرض الموت کی تعریف: کسی انسان کو ایسی بیماری لاحق ہوجائے کہ اس سے موت واقع ہونا یقینی ہو اور اس سے موت واقع ہوجائے تو اس کو مرض الموت کہا جاتا ہے۔

مرض الموت میں مریض اگر کوئی چیز ہبہ کرے، تو یہ ہبہ وصیت کے حکم میں ہوگا، اب اگر موھوب لہ ایسا قریبی رشتہ دار ہے کہ موت کے بعد وارث بنے گا، چوں کہ اس کے حق میں وصیت کرنا شرعاً باطل ہے اس لئے یہ ہبہ باطل ہوگا، اور مال بدستور واھب کی ملک میں برقرار رہے گا۔

لقوله عليه السلام : " ان الله قد اعطىٰ كل ذى حق حقه الا لا وصية لوارث ."

(ترمذی رقم ۲۱۲۰، باب ماجاء لا وصية لوارث)

اگر موھوب لہ اجنبی شخص یا رشتہ دار غیر وارث ہو تو یہ ہبہ ترکہ کے تہائی حصہ تک نافذ ہوگا اس سے زائد نہیں الا یہ کہ تمام ورثاء بالغ ہوں اور وہ زائد کی اجازت دیدیں۔

لقوله عليه السلام : " ان الله تصدق عليكم في اخر اعمار كم بثلث اموالكم ، تضعونها حيث شئتم ."

(ابن ماجه في الوصايا واحمد في المسند : ٦/ ٤٤١)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر انعام فرمایا کہ تہائی مال کی حد تک تمہیں تصرف کرنے کی اجازت یدی جہاں چاہو کار خیر میں خرچ کرو۔

اگر مرض الموت میں ہبہ کرنے کے بعد مریض پھر تندرست ہوگیا، تو اگر موھوب لہ نے مال ہبہ پر قبضہ کرلیا تھا تو ہبہ تام ہوگیا، اس ہبہ کا حکم مرض الموت کے ہبہ کا نہ ہوگا۔

ہبہ مشاع کا حکم:

جو چیز قابل تقسیم ہو (یعنی تقسیم کے بعد بھی ان سے اسی طرح فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے جس طرح سے تقسیم سے پہلے) ان کو اگر غیر منقسم ہبہ کردیا جائے تو یہ ہبہ فاسد ہے، کیوں کہ اصل مذہب یہی ہے کہ ہبۃ المشاع مفسد ہے، البتہ ایک روایت یہ ہے کہ فسادِ ہبہ اس وقت ہے جب کہ اجنبی کو ہبہ کیا جائے، اور جو شریک جائیداد کا ہو اس کو غیر منقسم ہبہ کرنا بھی صحیح ہے، اور بعض فقہاء نے اس کو مختار بھی کہا ہے۔

قال في الدر وفي الصير فيه عن العتابي ، وقيل يجوز شريكه، وهو المختار اهـ . (٤/ ٧٨٠)

مگر یہ قول ظاہر مذہب کے خلاف ہے اس لئے بدون مجبوری اس پر عمل کرنا درست نہیں، اور غالباً آج کل تقسیم جائیداد میں جس قدر خرچ اور پریشانی ہوتی ہے، وہ مجبوری اور دشواری کی حد میں داخل ہے، اس لئے اس صورت میں اگر اس روایت پر عمل کر کے شریک کے لئے ہبہ بدون تقسیم کے صحیح کہا جائے تو گنجائش ہے اور قبضہ کے بعد اس کو مفید ملک کہا جائے گا، لیکن بہتر صورت یہی ہے کہ آئندہ کے لئے یا تو جائیداد تقسیم کرلی جائے یا اس کا بیع نامہ کرلیا جائے اور بیع زبانی بھی کافی ہے، تحریر کی ضرورت نہیں۔ (امداد الاحکام : ٤/ ٣٨)

مطلب یہ ہے کہ شریک کو غیر منقسم چیز ہبہ کرنے کے لئے ایک حیلہ یہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اس کو اپنا حصہ فروخت کردے پھر قیمت اسے ہدیہ کردے دوسری صورت یہ ہے کہ انتہائی کم قیمت پر فروخت کردے جس کی ادائیگی موہوب لہ پر دشوار نہ ہو۔

اپنی زندگی میں ورثہ میں مال تقسیم کرنے کا حکم:

اس سلسلہ میں ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے جس کے ضمن میں یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

سوال: میں ایک بیمار عمر رسیدہ شخص ہوں میری کوئی اولاد نہیں، صرف بوڑھی بیوی ہے، جبکہ میرے دو بھتیجے ہیں، میں اپنی زندگی میں اپنا سرمایہ ان میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں، تو شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

الجواب: اگر آپ اپنا سرمایہ اپنی زندگی میں ہی ان میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو شرعاً آپ کو اختیار ہے کہ جس وارث کو جتنا چاہیں دیدیں، لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ، آپ اپنے کل مال کا ۱/۴ حصہ اپنی بیوی کے نام کردیں، باقی مال کے دو برابر حصے کرکے ہر ایک بھتیجے کو ایک ایک حصہ دیدیں، اگر اس مال سے اپنے لئے بھی کچھ رکھنا چاہتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس بات کا خیال رہے کہ دونوں بھتیجوں کا حصہ ان کے قبضہ میں دینا ضروری ہے ورنہ ہبہ تام نہ ہوگا۔

لما قال العلامة ابراهيم الحلبي: هى تمليك عين بلاعوض وتصح بايجاب وقبول وتتم بالقبض فان قبض فى المجلس بلا اذن صح، وبعده لا بد من الاذن.

(ملتقى الابحر على صدر مجمع الانهر: ۴۸۹/۳، كتاب الهبة)

حصول منافع کا ہبہ:

السوال: ایک شخص نے ٹیکسی خرید کر اس شرط پر بیٹے کو دی کہ اس سے کما کر بیوی، بچوں کا خرچہ برداشت کرو، گاڑی کی ملکیت میری ہوگی، اس معاہدہ پر گواہ بھی موجود ہے، اب اس شخص کا انتقال ہو گیا، بیٹے نے گاڑی پر قبضہ کرلیا اور ملکیت کا دعویدار ہے، اس کو ترکہ میں شامل کرنے کے لئے تیار نہیں، اب شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب: شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ باپ نے اس بیٹے کو صرف منافع کا مالک بنایا ہے، تو منافع کے ہبہ سے اصل چیز کا ہبہ لازم نہیں آتا اس لئے گاڑی باپ کی ملکیت میں ہونے کی وجہ سے ترکہ میں شامل ہوگی، اور دیگر ورثاء کا بھی اس میں حق ہوگا، اس بیٹے کا اکیلے اس پر قبضہ کرنا

ملکیت کا دعویٰ کرنا شرعاً درست نہ ہوگا۔

بیوی کا حق مہر ہبہ کرنے کا حکم:

نکاح ہونے کے بعد حق مہر کا مالک بیوی خود ہے، وہ اگر کل حق مہر یا اس کا بعض حصہ بلا کسی جبر و اکراہ کے شوہر کو ہبہ کر دے تو شوہر اُس کا مالک ہو جائے گا، بعد میں اگر دونوں میں کسی وجہ سے نااتفاقی ہو جائے اس کی وجہ سے بیوی اپنے ہبہ سے رجوع کرنا چاہے اور مہر کا دوبارہ مطالبہ کرے تو شرعاً یہ درست نہیں۔

وكذا ما وهب احد الزوجين الاخر لان المقصود فيها الصلة كما في القرابة . (هداية : ٣/٢٧٤)

لیکن بعض علاقوں میں دستور ہے کہ شادی کے بعد زبردستی بیوی سے حق مہر معاف کرواتے ہیں اور اس کو بیوی کی طرف سے ہبہ سمجھتے ہیں، شرعاً یہ ہبہ معتبر نہیں، شوہر کے ذمہ بیوی کا حق مہر بدستور لازم ہے۔

قال العلامة محمد خالد اتاسي : يلزم في الهبة رضاء الواهب فلا تصح الهبة التي وقعت بالجبر والاكراه .

(مجلة الاحكام مادہ : ص ٨٦٠ ، ٤٧٢ ، الباب الثاني شرائط الهبه)

ایک سنگین غلطی:

بعض لوگ اپنی زندگی میں مکان یا دیگر کوئی جائیداد ورثاء کو ہبہ کرنا چاہتے ہیں، اس بارے میں عموماً دو طرح کی غلطیاں ہوتی ہیں۔

(۱) مشترک چیز ہبہ کر دیتے ہیں، مثلاً مکان میں نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کو دیدیا، جبکہ شرعاً مشترک چیز کا ہبہ جائز نہیں، جب تک تقسیم کر کے دونوں کو اپنے اپنے حصے کا مالک نہ بنا دے، ہبہ تام نہ ہوگا، اسی حالت میں باپ کا انتقال ہو جائے تو یہ مکان ترکہ میں داخل ہو کر تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

(۲) ہبہ میں موہوب لہ کا قبضہ ضروری ہے کہ بعض کہہ دیتے ہیں بلکہ اسٹامپ میں لکھ دیتے ہیں کہ میں نے یہ مکان/ دکان فلاں بیٹے کو دیدیا، اس کے بعد تا حیات اسی مکان میں رہائش پذیر رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے بیٹے کو دیدیا اور بیٹا مالک بن گیا، حالانکہ مکان باپ کے

سامان کے ساتھ مشغول ہونے کی وجہ سے بیٹے کا قبضہ تام نہیں ہوا ہے جس کی وجہ سے ہبہ تام نہیں ہوا، صحیح طریقہ اس کا یہ ہے کہ آپ اپنا سامان نکال کر مکان خالی کر کے بیٹے کے حوالے کریں یا یہ کہ بمع سامان کے مکان ہبہ کریں۔

مشترکہ طور پر ہبہ کرنے کا حکم:

سوال: چند شرکاء نے اپنی کوئی مشترک چیز کسی ایک شخص کو ہبہ کردی ایک عالم فرماتے ہیں کہ یہ ہبہ صحیح نہیں، رہنمائی فرمائیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ہبۃ المشاع کی یہ صورت صحیح ہے، صحت ہبہ سے مانع وہ شیوع ہے جو موہوب لہ کے پاس ہو۔

ولا تصح الهبة للشريك لانه لم يوجد الافراز المشروط لتمام القبض. (أحسن الفتاوىٰ: ٧/٢٥٥)

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخارى رحمه الله: وفى الاصل ومن شرائطها اى الهبة الا فراز حتى لايجوز هبة المشاع فيما يحتمل القسمة كالبيت والدار والارض ونحوها وان كان لا يحتمل القسمة يجوز كالبئر والحمام والرحى. (خلاصة الفتاوىٰ: ٤/٣٩٠) كتاب الهبة، الفصل الثالث فيما يكون خطباء وفيما لا يكون.

نا قابل تقسیم اشیاء کا ہبہ:

جو چیزیں نا قابل تقسیم ہوں ان کے ہبہ کا کیا طریقہ ہے، مثلاً ایک شخص نے اپنے جانور کو اس طرح ہبہ کیا کہ ایک حصہ اپنے لئے رکھا، اور تین حصے بیوی کو ہبہ کئے اور تین حصے بھائی کو، اب اس شخص کا یہ ہبہ صحیح ہوا یا نہیں؟

اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ جو اشیاء قابل تقسیم ہوں ان کا ہبہ تو قبل التقسیم صحیح نہیں جیسا کہ اوپر کے مسائل میں تفصیل سے معلوم ہوا، البتہ جن اشیاء کی تقسیم ممکن نہ ہو مثلاً جانور ان کا ہبہ تقسیم سے پہلے صحیح ہے، لہٰذا اس شخص کا ہبہ کرنا صحیح ہوا۔

قال العلامة الخوارزمى رحمه الله: هبة المشاع فيما لا يقسم جائزة يعنى به مالا يحتمل القسمة اى لا يبقىٰ منتفعا بعد القسمة

اصلا کعبد واحد او دابة واحدة .

(الکفایة فی فتح القدیر : ٤٨٨/٧ کتاب الهبة)

قال العلامة قاضی خانؒ : وفیما لا یقسم کالعبد والدابة والثوب والحمام یجوز هبة المشاع من الشریك وغیره فی قولهم .

(الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة : ٢٦٧/٣ کتاب الهبة ،

فصلفی هبة المشاع ومثلهٗ فی الهدایة : ٢٨٥/٣ کتاب الهبة)

قال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه : وذکر قبله هبة المشاع فیما یقسم لا تفید الملك عند ابی حنیفة وفی القهسانی لا تفید الملك وهو المختار کما فی المضمرات .

(رد المحتار : ٦٩٢/٥ ،کتاب الهبة ومثلهٗ فی بدائع الصنائع : ١٢٣/٦ کتاب الهبة)

اولاد کو ھبہ کرنے میں کم یا زیادہ دینا:

سوال : اولاد کو ہبہ دینے میں تفاضل کا کیا حکم ہے؟ بالتفصیل تحریر فرمائیں؟

جواب : (١) اگر دوسروں کا اضرار مقصود ہو تو مکروہ تحریمی ہے، قضاءً نافذ ہے دیانۃً واجب الرد ہے۔

(٢) اضرار مقصود نہ ہو اور کوئی وجہ ترجیح نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے، ذکور واناث میں تسویہ مستحب ہے۔

(٣) دینداری، خدمت گزاری، خدمات دینیہ کا شغل یا احتیاج وغیرہ وجوہ کی بناء پر تفاضل مستحب ہے۔

(٤) بے دین اولاد کو بقدر قوت سے زائد نہیں دینا چاہئے، ان کو محروم کرنا اور زائد مال امور دینیہ میں صرف کرنا مستحب ہے۔

قال الامام الحصکفی رحمه اللّٰه تعالیٰ : وفی الخانیة لا بأس بتفضیل بعض الاولاد فی المحبة لانها عمل القلب وکذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار وان قصده یسوی بینهم ویعطی البنت کالابن عند الثانی وعلیه الفتویٰ ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز

واثم .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ : (قوله وعليه الفتوىٰ) اى علىٰ قول ابى يوسف رحمه اللّٰه تعالىٰ من ان التنصيف بين الذكر والانثىٰ افضل من التثليث الذى هو قول محمد رحمه اللّٰه تعالى رملى . (ردالمحتار : ٤ /٥٧٣)

وقال الامام طاهر بن عبد الرشيد رحمه اللّٰه تعالىٰ : وفى الفتاوىٰ رجل له ابن وبنت اراد ان يهب لهما شيئا فالافضل ان يجعل للذكر مثل حظ الانثيين عند محمد رحمه اللّٰه تعالىٰ وعند ابى يوسف رحمه اللّٰه تعالىٰ بينهما سواء هو المختار لورود الآثار .

ولو وهب جميع ماله لابنه جاز فى القضاء وهو اثم نص عن محمد رحمه اللّٰه تعالىٰ هكذا فى العيون .

ولو اعطى بعض ولده شيئا دون البعض لزيادة رشده لابأس به وان كانا سواء لاينبغى ان يفضل .

ولو كان ولده فاسقا فاراد ان يصرف ماله الى وجوه الخير ويحرمه عن الميراث هذا خير من تركه لان فيه اعانة على المعصية ، ولو كان ولده فاسقا لا يعطى له اكثر من قوته .

(خلاصة الفتاوىٰ : ٤ /٤٠٠)

وكذا نقله عنه العلامة ابن نجيم رحمه اللّٰه تعالىٰ وقرره .

ونقل ايضا عن المحيط : يكره تفضيل بعض الاولاد على البعض فى الهبة حالة الصحة الالزيادة فضل له فى الدين وان وهب ماله كله لواحد جاز قضاءً وهو اثم . (البحر الرائق : ٧ /٢٨٨)

وقال العلامة الطحطاوى رحمه اللّٰه تعالى : (قوله وكذا فى العطايا) ويكره ذلك عند تساويهم فى الدرجة كما فى المنح والهندية اما عند عدم التساوى كما اذا كان احدهم مشتغلا بالعلم

لا بالكسب لابأس ان يفضله على غيره كما فى الملتقط اى ولا يكره وفى المنح روى عن الامام انه لابأس به اذا كان التفضيل لزيادة فضل له فى الدين وفى خزانة المفتين ان كان فى ولده فاسق لا ينبغى ان يعطيه اكثر من قوته كيلا يصير معينا له فى المعصية انتهى وفى الخلاصة ولو كان ولده فاسقا فاراد ان يصرف ماله الى وجوه الخير ويحرمه عن الميراث هذا خير من تركه انتهى اى للولد وعلله فى البزازية بالعلة السابقة (قوله يسوى بينهم) قال فى البزازية الافضل فى هبة البنت والابن التثليث كالميراث وعند الشافعى رحمه الله تعالىٰ التنصيف وهو المختار ولووهب جميع ماله من ابنه جاز قضاء وهو اثم نص عليه محمد رحمه الله تعالىٰ اه فانت ترى نص البزازية خاليا عن قصد الاضرار وقال فى الخانية ولووهب رجل شيئا لاولاده فى الصحة واراد تفضيل البعض على البعض فى ذلك لارواية لهذا فى الاصل عن اصحابنا وروى عن الامام رحمه الله تعالىٰ انه لابأس به اذا كان التفضيل لزيادة فضل له فى الدين وان كانا سواء يكره وروى المعلى عن ابى يوسف رحمه الله تعالىٰ انه لابأس به اذا لم يقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوى بينهم يعطى الابنة ما يعطى الابن وقال محمد رحمه الله تعالىٰ يعطى للذكر ضعف ما يعطى للانثىٰ و الفتوى على قول ابى يوسف رحمه الله تعالىٰ.

(طحطاوى على الدر : ۳۹۹/۳ ، ماخوذ از احسن الفتاوىٰ : ۲۵۶/۷)

ہبہ سے رجوع کرنے کا حکم:

کسی کو کوئی چیز ہبہ کرنے کے بعد واپس لینے میں کئی قباحتیں ہیں، اس سے آپس میں بغض ونفرت پیدا ہوتی ہے اس لئے یہ ایک مکروہ ناپسندیدہ فعل ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی شناعت وقباحت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ

" مثل الذى يعطى العطية ثم يرجع فيها كمثل الكلب يأكل فاذا

شبع قاء ثم عاد فی قیئه ."

(اخرجه اصحاب السنن ، وقال الترمذی ، حسن صحیح)

یعنی جو شخص کسی کو کوئی چیز عطیہ دینے کے بعد دوبارہ واپس لے لے وہ اس کتے کی طرح ہے جو پیٹ بھر کر کھائے پھر قئی کر دے، اس کے بعد اپنے قئے کو دوبارہ چاٹ لے۔

اب اگر کوئی شخص ہبہ کر کے واپس لینا چاہے تو شرعاً کیا حکم ہوگا اس بارے میں تفصیل ہے۔

1- موھوب لہ کی رضاء سے بہر حال رجوع جائز ہے۔

2- قضاء قاضی سے رجوع صحیح ہے۔

3- ہبہ قبول کرنے کے بعد اسکا عوض دیدیا ہو تو بھی بذریعہ قضاء رجوع کر سکتا ہے۔

ہبہ کے بعد رجوع ممنوع ہونے کی صورتیں:

مندرجہ ذیل باتیں ہبہ کے بعد رجوع کرنے سے مانع ہیں:

(۱) قرابت داری۔

(۲) میاں بیوی کا رشتہ۔

(۳) ہبہ قبول کرنے کے بعد مالی معاوضہ لینا۔

(۴) موھوب بہ چیز کا موھوب لہ کی ملک سے نکل جانا۔

(۵) ہبہ دینے اور لینے والوں میں سے کسی ایک کا انتقال کر جانا۔

(۶) شئی موھوب کا ہلاک ہو جانا مثلاً مکان تھا گر گیا۔

(۷) موھوب بہ چیز میں کوئی زیادتی کر لی گئی، مثلاً کپڑا تھا اس کو رنگ لیا، گندم تھا اس کو پیس لیا۔

قال صاحب الاختیار : ویجوز لرجوع فیما وھبه للاجنبی ویکره، ای تحریما ، فان عوضه ، أوزادت زیادة متصلة، او مات احدھما او خرجت علی ملك الموھوب له، فلارجوع والمعانی المانعة من الرجوع فی الھبة ھی ، المحرمیة من القرابة، والزوجیة والمعاوضة وخروجھا من ملك الموھوب له ، وموت الواھب او الموھوب . (کتاب الاختیار للموصلی : ۵۱/۳)

وقد نظم بعضهم هذه الموانع السبعة بقوله، ومانع من الرجوع في الهبة: يا صاحبي حروف، دمع خذقة. (فقه المعاملات)

معتوہ (بے وقوف) کا ہبہ:

معتوہ شخص اگر کسی شخص کو کوئی چیز ہبہ کردے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا، اس بارے میں حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

معتوہ کا ہبہ صحیح نہیں، اس کے تصرفات میں یہ تفصیل ہے:

جن تصرفات میں اس کا نفع ہے وہ بلا اذن ولی بھی معتبر ہیں، جیسے ہبہ قبول کرنا، جن میں اس کا نقصان ہے، وہ اذن ولی سے بھی معتبر نہیں، جیسے ہبہ دینا۔

جن میں نفع وضرر دونوں کا احتمال ہے، ان میں اذن ولی ضروری ہے، جیسے بیع وشراء۔

ولی سے مراد باپ یا اس کا وصی یا دادا ہے، چچا کا اذن کافی نہیں، باپ دادا نہ ہوں تو حاکم مسلم یا اس کا نائب ولی ہوگا، اگر حاکم مسلم نہ ہو یا اس طرف توجہ نہ دے تو مقامی لوگوں میں سے دیندار بااثر لوگ جسے متعین کردیں اس کا اذن ضروری ہے۔

قال الامام الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: وتصرف الصبي والمعتوه الذي يعقل البيع والشراء ان كان نافعا محضا كالاسلام والاتهاب صح بلا اذن وان ضارا كالطلاق والعتاق والصدقة والقرض لاوان اذن به وليهما وماتردد من العقود بين نفع وضرر كالبيع والشراء توقف على الاذن حتى لوبلغ فاجازه نفذفان اذن لهما الولي فهما في شراء وبيع كعبد مأذون في كل احكامه.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: (قوله ووليه ابوه) اي الصبي وفي الهندية المعتوه الذي يعقل البيع يأذن له الاب والوصي والجد دون الاخ والعم وحكمه حكم الصبي.

(ردالمحتار: ٥/ ١٢١)

نابالغ کو ہبہ کیا تو والد کا قبضہ کافی ہے:

اگر والد نے اپنی نابالغ اولاد کو ہبہ کیا تو نیت کرلینا کافی ہے، اسی طرح اگر کسی غیر نے ہبہ کیا

تو والد کے قبضہ سے ہبہ تام ہو جائے گا۔

قال الامام الحصكفي رحمه الله تعالىٰ : وهبة من له الولاية على الطفل في الجملة وهو كل من يعوله فدخل الاخ والعم عند عدم الاب لو في عيالهم تتم بالعقد .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله بالعقد) اى الايجاب فقط كما يشير اليه الشارح كذا في الهامش وهذا اذا اعمله او اشهد وللتحرز عن الجحود بعد موته والا علام لازم .

(ردالمحتار : ٢/٤/).

نابالغ پر زکوۃ اور قربانی واجب نہیں:

قال في التنوير : وشرط افتراضها عقل وبلوغ واسلام وحرية .

(ردالمحتار : ٢/٥٧١)

وفي الشرح : صححه في الكافي (الى قوله) وهو المعتمد .

(ردالمحتار : ٢/٢٢٣)

ہبہ میں شرط لگانے کا حکم:

اگر کوئی شخص مشروط طور پر ہبہ کرے تو ہبہ صحیح ہوگا یا نہیں؟ اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ اگر کوئی مناسب شرط عائد کرے تو ہبہ اور شرط دونوں صحیح ہیں اور اگر کوئی غیر مناسب شرط عائد کرے تو ہبہ صحیح ہوگا اور شرط باطل ہوگی۔

قال في التنوير : ومالايبطل بالشرط الفاسد القرض والهبة والصدقة الخ .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : كوهبتك هذه المائة او تصدقت عليك بها على ان تخدمنى سنة نهر فتضح ويبطل الشرط لانه فاسد وفي جامع الفصولين ويصح تعليق الهبة بشرط ملائم كو هبتك على ان تعوضنى كذا ولو تخالفا تصح الهبة لا الشرط .

(ردالمحتار : ٤/٢٥٢)

عمریٰ کے طریقہ پر ہبہ کرنے کا حکم:

ہبہ کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ "اعمرتك هذه الدار" وغیرہ الفاظ استعمال کر کے ہبہ کرے، جس کا معنی ہے کہ یہ گھر میں نے عمر بھر کے لئے تمہیں دیدیا، اب شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس کی تین صورتیں ہیں:

(۱) دینے والا تصریح کرے کہ " اذا متَّ فهی راجعة الیَّ او الیٰ ورثته " اس صورت میں بالاتفاق اس کا حکم عاریت کا ہے۔

(۲) ہبہ کے وقت تصریح کردے کہ " اذا متَّ فهی لورثتك بالعصبك " اس صورت میں بھی اتفاق ہے کہ یہ ہبہ کے حکم میں ہے۔

(۳) ہبہ کے وقت صرف ''اعمرتك'' کہے یہ تصریح نہ کرے کہ ''معمرله'' کے مرنے کے بعد کیا صورت ہوگی، اس صورت میں اختلاف ہے، امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس صورت میں اس کو عاریت سمجھا جائے گا، امام شافعی رحمہ اللہ کا قول قدیم بھی یہی ہے، امام ابوحنیفہؒ وامام احمدؒ فرماتے ہیں اس کو ہبہ قرار دیا جائے گا اور یہی امام شافعیؒ کا قول جدید ہے۔

لقوله عليه السلام : " العمرىٰ جائزة " . (بخاری : ۲/۹۲)

وفی ملتقی الابحر قال : والعمرىٰ جائزة للمعمر حال حياته ولورثته بعده، وهی أن يجعل داره له مدة عمره فاذا مات ردت عليه فالهبة صحيحة،وشرط الرجوع الىٰ الواهب شرط باطل ، لقوله صلى الله عليه وسلم : العمرىٰ لمن وهبت له . (ملتقی الابحر : ۲/۱۵۵)

حکم الرقبیٰ:

الرقبى هی أن يقول شخص لآخر،جعلت داری لك رقبىٰ ، ان مت قبلی فهی لی، وان مت قبلك فهی لك، و كان كل واحد منهما ، يرتقب وينتظر موت الآخر ولذا سميت " رقبىٰ " .

یعنی رقبیٰ کے معنی یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ میں نے اپنا مکان تمہارے لئے رقبیٰ کے طور پر دیدیا، اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے تو یہ مکان واپس میرا ہو جائے گا، اور اگر میرا تجھ سے پہلے

انتقال ہو جائے تو یہ مکان ہمیشہ سے آپ کا ہوگا، اب اس کے بعد گویا کہ ہر شخص دوسرے کی موت کا منتظر ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ امام شافعی، امام احمد اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا حکم بعینہ وہی ہے جو عمریٰ کا ہے البتہ اتنا فرق ہے کہ اگر عمریٰ میں مطلق چھوڑ دے تو وہ ہبہ سمجھا جاتا ہے، اور رقبیٰ میں یہ تفصیل ہے کہ، اگر وہ شخص پہلے مرجائے تو گھر رقبیٰ دینے کے پاس واپس لوٹ آتا ہے، اور اگر رقبیٰ دینے والے کا انتقال پہلے ہو جائے تو وہ مکان ہمیشہ کے لئے مرقب لہ کا ہو جاتا ہے، ان کا استدلال رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

" الرقبی جائزہ لاھلھا . "

اور رقبیٰ کا مفہوم اس زمانہ میں یہی تھا، یہ رقب سے مشتق ہے اور ہر ایک دوسرے کی موت کا منتظر ہوتا تھا۔

لیکن امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام محمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں اس معنی کے لحاظ سے رقبیٰ باطل ہے کیوں کہ یہ شرط فاسد ہے اور فساد کی وجہ جہالت ہے، باقی حدیث میں جس رقبیٰ کو جائز قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ " ملکتك رقبة هذه الدار" لہٰذا وہ ہبہ کے حکم میں ہے، لہٰذا اب جو کوئی شخص رقبہ کرے گا وہ اسی معنی پر محمول ہوگا اور ہبہ سمجھا جائے گا۔

(ماخوذ از تقریر ترمذی شیخ تقی عثمانی زید مجد ھم)

ہبہ اور ہدیہ کو واپس کرنے کا حکم:

ہبہ اور ہدیہ کو رد کرنے کا حکم یہ ہے کہ اگر یہ یقین یا ظن غالب ہو کہ حرام مال سے ہدیہ کر رہا ہے، تو اس کو قبول کرنا جائز نہیں بلکہ واپس کرنا لازم ہے، اور اگر حلال مال سے ہدیہ کر رہا ہے، لیکن رشوت کے طور پر ہو تب بھی قبول کرنا جائز نہیں، اس کے علاوہ ہو تو قبول کر لینا چاہئے، اور بدلہ میں ہدیہ کرنے والے کو بھی کوئی چیز ہبہ کرنی چاہئے۔

كما روت عائشة رضى الله عنها حيث قالت : " كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقبل الهدية، ويثيب عليها ".

(اخرجه البخارى : ۲/ ۹۰ ، باب المكافاة فى الهدية)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے اور اس پر بدلہ بھی دیتے

تھے۔

اگر ہدیہ دینے کے لئے کچھ نہ ہو تو " جزاك الله خيراً " کہہ دے یہ اس کے حق میں دعا اور اس کے لئے بہترین ہدیہ ہے۔

فقد قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم : " من اسدى اليكم معروفا فكافئوه فان لم تجد واما تكافئو نه به، فادعوا له ".

(الترغيب والترهيب للمنذری)

وقوله عليه السلام : " من صنع اليه معروفا فقال لفاعله ، جزاك اللّٰه خيرًا ، فقد ابلغ في الثناء ". (ترمذی بسند جيد)

تین چیزوں کا ہدیہ رد نہ کرنا:

تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی چیز کسی کو ہدیہ کی جائے تو رد نہیں کرنا چاہئے۔

(۱) دودھ (۲) خوشبو (۳) تکیہ

لقوله عليه السلام : " من عرض عليه ريحان فلايرده لانه خفيف المحمل، طيب الريح ". (مسلم : رقم ۲۲۵۳) ۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو ریحان ہدیہ میں ملے تو چاہئے کہ اس کو رد نہ کرے کیوں کہ اس کو اٹھانا آسان ہے اور اس کی خوشبو عمدہ ہے۔

وقوله عليه السلام : " ثلاثة لاترد، الوسائد، والدهن، يعنى الطيب، واللبن ". (اخرجه الترمذی وقال حديث غريب)

وقال انس : " كان النبی صلى اللّٰه عليه وسلم لايرد الطيب ."

(اخرجه البخاری : ۲/ ۹۰)

احکام الودائع

امانت کی حفاظت عاریت وغیرہ کے احکام:

هی مايوضع عند غير صاحبه ، من مال ومتاع للحفظ وللرعاية

وقال صاحب ملتقى الابحر : الايداع، تسليط المالك غيره، على

حفظ ماله، والودیعة، مایترك عند الامین للحفظ .

(ملتقی الابحر : ۲/۱۴۳)

یعنی امانت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا مال کسی دوسرے شخص کے پاس بنیت حفاظت رکھوائے۔

امین اور مودِع کے لئے شرائط:

امانت رکھوانے والے اور جس کے پاس رکھوایا گیا دونوں کا عاقل، بالغ اور تصرف کا اہل ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح ایجاب وقبول بھی ضروری ہے، یعنی امانت رکھوانے والا کوئی ایسا لفظ کہے جو امانت پر دلالت کرے، مثلاً عربی میں "او دعتك هذا المال ، یا احفظ هذا الشئ لی " یعنی یہ مال میں نے آپ کے پاس بطور امانت رکھا ہے یا میری اس چیز کی حفاظت کریں دوسرا شخص زبان سے ہاں کہے، یا خاموشی سے حفاظت پر راضی ہونے کو ظاہر کرے دونوں صورتوں میں امانت کا معاملہ مکمل ہوجائے گا۔

امانت کی حفاظت کا حکم:

امانت قبول کرنے کے بعد اس کی حفاظت کرنا شرعاً واجب ہے جس طرح اپنے ذاتی مال کی حفاظت کرنا، کہ خود حفاظت کرے یا بیوی بچے یا گھر کے کسی معتبر شخص کے ذریعہ حفاظت کرے، حفاظت کرنے کی پوری کوشش کے باوجود اگر ناگہانی آفت سے ہلاک ہوجائے یا چوری ہوجائے تو امین پر تاوان لازم نہ ہوگا اور اگر ان کی تعدی یا حفاظت میں کوتاہی کی وجہ سے ایسا ہوا تو تاوان لازم ہوگا۔

قال فی الاختیار هو عقد مشروع امانة لا غرامة لحدیث لیس علی المستودع غیر المغل، ای الخائن ضمان، ولا علی المستعیر غیر المغل ضمان ، (دار قطنی) فهی امانة اذا هلکت من غیر تعد لم یضمن، لانه لو وجب الضمان ، لا متنع الناس عن قبولها، وفیه من الفساد مالا یخفیٰ . (الاختیار لتعلیل المختار للموصلی : ۳/۶۵)

امانت میں تصرف کا حکم:

امانت میں امین کے لئے تصرف کا حکم یہ ہے کہ چونکہ امین کے ذمہ امانت کی حفاظت لازم

ہے، لہٰذا حفاظت کے لئے جو تدبیر اختیار کرنا پڑے وہ تصرف کرسکتا ہے، اس کے علاوہ کسی قسم کا تصرف جائز نہیں۔

وفی الهندیه قال : الودیعة لاتودع ولاتعار ولاتوجر ولاترهن وان فعل شیئا منهن ضمن کذا فی البحر الرائق .

(الفتاوى الهندية : ٣٣٨/٤ ، کتاب الودیعة)

امانت پراجرت لینے کا حکم:

امانت کی حفاظت کو امین پر لازم کر کے اجرت مقرر کرنا شرعاً جائز ہے، البتہ اس صورت میں امین کے ہاتھ سے امانت کسی ایسے عمل سے ضائع ہو جائے جس سے بچنا ممکن تھا تو امین ضامن ہوگا ورنہ نہیں۔

وفی مجلة الاحکام : الودیعة امانة فی ید المودَع ، فاذا هلکت بلا تعد منه وبدون صنعه وتقصیره فی الحفظ لا یضمن ولکن اذا کان الایداع باجرة فهلکت اوضاعت بسبب یمکن التحرزعنه لزم المستودع ضمانها .

(شرح المجلة مادة : ٧٧٧ ، احکام الودیعة)

امانت رکھوا کر واپس نہ آئے:

اگر کوئی شخص امانت رکھوا کر واپس نہ آئے تو کچھ وقت انتظار کرنا ضروری ہے، اس میں اس کو تلاش کیا جائے اگر وہ مل جائے تو اس تک یا موت کی صورت میں ان کے ورثاء تک پہنچانا ضروری ہے، لیکن اگر بالکل پتہ نہ چلے تو اس مال کو امانت رکھوانے والے کی طرف سے صدقہ کر دے، امین اگر فقیر ہو تو خود بھی کھا سکتا ہے، صدقہ یا استعمال کے بعد مالک واپس آ جائے تو مالک کو اختیار ہوگا کہ اس صدقہ پر راضی رہے یا یہ کہ امین سے اپنے مال کا مطالبہ کرے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله : فینتفع بها لو فقیراً والا تصدق بها علی فقیر ولوعلی اصله وفرعه وحرسه ، فان جاء مالکها بعد التصدق خیر بین اجازة فعله ولو بعد هلاکها وله ثوابها او تضمینه . (رد المحتار : ٧٩/٤ـ ٨٠ ، کتاب اللقطة)

جوتے، کپڑے وغیرہ تبدیل ہو جانا:

اگر کسی شخص کی مسجد سے چپل، جوتے، تبدیل ہو گئے یا جہاز یا بس میں بیگ وغیرہ تبدیل ہو گیا غلطی سے کسی دوسرے کا بیگ آ گیا تو کیا اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اس کا استعمال جائز نہیں کیوں کہ اولاً اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ یقین نہیں کہ جس نے جوتا لیا ہے یہ جوتا اسی کا ہے یا جو بیگ لے گیا ہے آپ کو ملا ہوا بیگ اسی کا ہے اور اگر ایسا ہو بھی تو بھی چونکہ باہمی مبادلہ کا کوئی معاملہ نہیں ہوا، اس لئے جو جوتا یا کپڑا ملا ہے اس کا حکم لقطہ کا ہوگا، یعنی پہلے یہ کوشش کی جائے گی کہ اس کا مالک مل جائے، اور اس کو واپس کر دیا جائے، اور مالک کے ملنے سے مایوسی ہو جائے تو مالک کی طرف سے صدقہ کر دے، ہاں البتہ مالک ملنے سے مایوسی کی صورت میں اگر یہ شخص خود بھی مستحق زکوٰۃ ہو تو اس کو خود بھی استعمال کر سکتا ہے۔

كما في العالمگيرية قال : امرأة وضعت ملائتها فجاء ت امرأة اخرىٰ وضعت ملأتها ثم جاء ت الاولىٰ وأخذت ملاء ة الثانية وذهبت لا يسع لـلثانية أن ينتفع ملأتها ، والحيلة أن يتصدق الثانية بهذه الملأة على بنتها، ان كانت فقيرة على نية أن يكون الثواب لصاحبها ان رضيت ثم تهب البنت الملأة منها فيسعها الانتفاع بها كاللقطة ، وكذا لو سرق مكعبا وترك عوضاً .

(ماخوذ از امداد المفتين بتغير : صـ ٨٧٦)

سفر کے لئے روانگی کے وقت ہدایا کا وکیل بنانا:

جب کوئی سفر سے وطن واپس آ رہا ہوتا ہے، تو دوسرے جاننے والے اپنے عزیز و اقارب کے لئے مختلف قسم کی چیزیں ان کے ہاتھ بھیجتے ہیں اب اس شخص کو اختیار ہے کہ یا تو شروع سے انکار کر دے کہ میں ساتھ لیکر نہیں جا سکتا اور اگر انکار نہیں کرتا بلکہ اپنے ساتھ لے جانے کی حامی بھر لیتا ہے اور چیزیں قبول کر لیتا ہے تو اس صورت میں بعینہ وہی چیزیں جن کے لئے بھیجے ان تک پہنچانا ضروری ہے اس میں کسی قسم کا ردوبدل کرنا حرام ہے، اگر ردوبدل کیا اس کے بعد وہ چیز ہلاک ہوئی تو تاوان ادا کرنا لازم ہوگا۔

عاریت کی چیزیں امانت ہیں:

اگر کسی نے کوئی چیز بطور عاریت لی، مثلاً مہمان آئے اور پڑوس سے برتن مانگ لئے یا کہیں جانا ہے کسی سے بیگ یا کوئی اور چیز بطور عاریت لی، یہ امانت ہے، جس مقصد کے لئے لی ہو وہ مقصد پورا ہوتے ہی فوراً واپس کرنا ضروری ہے۔

پڑوس کے سالن کا برتن:

اگر پڑوس نے برتن میں سالن وغیرہ کوئی چیز بطور ہدیہ پیش کی تو چیز کو استعمال کرنے کے بعد برتن کو کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں کیوں کہ یہ برتن امانت ہے اور ان کو واپس کر دینا ضروری ہے۔

مستعار کتب کا حکم:

مدرسہ سے یا کسی سے کتاب عاریۃً حاصل کی، اب اس کتاب پر لکھنا یا حاشیہ چڑھانا یا کوئی اور تصرف کرنا جائز نہیں، بلکہ پڑھائی اور مطالعہ مکمل ہونے کے بعد واپس کرنا ضروری ہے۔

احکام الرھن

رہن کے احکام:

" الرهن فى اللغة معناه الحبس ."

رہن کے معنی لغت میں روکنا ہے۔

وشرعاً " ما يجعله الشخص وثيقة للدين الذى فى ذمته لاخر ، مثاله اذا اشترى متاعاً ، او سيارة ، ولم يكن لديه قيمتها ، فيترك عند البائع بعض الحلى رهينة ، حتى يدماعليه من دين أو يرهن ، داره مقابل الدين الذى استقرضه من اخر ."

یعنی شرعاً رہن اس مال کو کہا جاتا ہے، جو آدمی اپنے ذمہ واجب الاداء دین کے مقابلہ میں دائن کے پاس رکھواتا ہے تا کہ دین کی ادائیگی کا یقین حاصل ہو جائے، مثلاً کوئی سامان، یا گاڑی خریدی لیکن قیمت کے لئے رقم اپنے پاس نہیں تو رقم کا بندوبست ہونے تک اپنی کوئی قیمتی چیز مثلاً، سونا، چاندی کے زیورات وغیرہ بائع کے پاس رھن رکھواتا ہے یا قرض حاصل کیا اس کی ادائیگی

تک اپنا گھر یا کوئی دیگر جائیداددائن کے پاس رکھواتا ہے۔

رہن کی مشروعیت:

والرهن مشروع بالكتاب، والسنة، واجماع الامة لم يخالف في جوازه احد.

قوله تعالى: ﴿وان كنتم على سفر ولم تجدوا كاتبا فرهن مقبوضة﴾ (سورة البقرة: ٢٨٣)

وروى البخاري عن عائشة رضي الله عنها انها قالت: "اشترى رسول الله صلى الله عليه وسلم من يهودي طعاماً، ورهنه درعه، ومات رسول الله صلى الله عليه وسلم ودرعه مرهونة عنده".

(بخاري كتاب الرهن: ٧٣/٣، مسلم: ١٢٢٦/٣)

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے گندم خریدی اور اپنی زرہ مبارک اس کے پاس رھن رکھی اور رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے پردہ فرما گئے اس وقت بھی آپ کی زرہ مرھون تھی۔ (بخاری)

رہن کی اصطلاحات:

راہن: مقروض شخص جو رہن رکھواتا ہے۔

مرتھن: قرض خواہ، جو اپنے قرض کے عوض میں کسی کا مال اپنے پاس رہن رکھتا ہے۔

مرہون: وہ مال جو قرض کے عوض مرتھن کے قبضہ میں دیا جاتا ہے۔

منافع رہن کا مالک راہن ہے:

شئی مرہون اگر چہ مرتھن کے قبضہ میں ہوتا ہے، لیکن وہ راہن ہی کی ملک میں باقی رہتا ہے، اس کی حفاظت پر اگر کچھ خرچہ آئے، یا وہ کوئی جانور ہو تو چارہ وغیرہ کا خرچہ مالک (یعنی راہن) کے ذمہ ہوگا، اسی طرح اس کے منافع، پھل، دودھ، غلہ وغیرہ وہ بھی راہن کا ہوگا۔

لقوله عليه السلام: "الرهن من راهنه له غنمه وعليه غرمه."

(اخرجه الحاكم في المستدرك: صـ ٥٧٢، دارقطني: ٣٣/٣)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رہن پر راہن کی ملک باقی ہے، منافع کا وہ خود مالک

ہے اور خرچہ بھی اسی کے ذمہ ہے۔

اگر راہن موجود نہ ہو اور مرتھن عدالت کے حکم سے مرہون پر کچھ خرچہ کرے تو یہ راہن کے ذمہ قرض ہوگا اور اگر اپنی طرف سے خرچہ کرے تو اس کی طرف سے تبرع و احسان ہوگا۔

مرہون کے ضمان کا حکم:

احناف کے نزدیک شئی مرہون مرتھن کے قبضہ میں مضمون ہے، یعنی دین کے بقدر پر مرتھن کا قبضہ، قبضۂ ضمانت ہے اور اس سے زائد اگر ہو تو اس پر مرتھن کا قبضہ، قبضۂ امانت ہے، لہٰذا اگر مرہون مرتھن کے ہاتھ میں ہلاک ہوا تو گویا مرتھن نے اپنا دین وصول کرلیا وہ راہن سے قرض کے مطالبہ کا حقدار نہ ہوگا۔

مثلاً ہزار روپے قرض کے بدلہ میں بارہ سو کی چیز رہن رکھا بعد میں مرہون ہلاک ہوگیا تو گویا کہ ہزار روپے کا قرض وصول ہوگیا اور اگر مرہون کی قیمت آٹھ سو روپے تھی تو اب مرتھن دو سو روپے راہن سے مطالبہ کرسکتا ہے۔

لقوله عليه السلام : " في رجل رهن فرسا ، فنفق عند المرتهن اى هلك عنده ، فجاء الى النبى صلى الله عليه وسلم فاخبره بذلك فقال له الرسول الله صلى الله عليه وسلم ذهب حقك ".

(اخرجه البيهقي في السنن الكبرىٰ : ٦/٤١)

ایک شخص کے پاس گھوڑا بطور رہن رکھا گیا اور مرتھن کے پاس گھوڑا ہلاک ہوگیا پس رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی تو آپ نے مرتہن سے فرمایا تمہارا حق ختم ہوگیا۔

رہن کی زمین سے فائدہ حاصل کرنے کا حکم:

رہن سے فائدہ حاصل کرنا شرعاً ناجائز ہے اگر زمین رہن رکھی جائے تو اس سے مرتھن کے لئے انتفاع ناجائز ہونے کے متعلق ایک تفصیلی سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال : زمین رہن رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو زمین مرتھن کے قبضہ میں رہیگی کہ راہن کے قبضہ میں رہے گی؟ اگر مرتھن کے قبضہ میں رہی تو مرتھن اس زمین کو کونسی صورت میں رکھے گا، آیا کہ زمین میں مرتھن خود تصرف کریگا یا کہ بیکار چھوڑ دے گا؟ اب دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ کونسی صورت پر رکھنے سے شرعاً حلال ہوسکتا ہے، بیان فرما کر بندہ کو مطمئن فرمائیں۔

الجواب: زمین رہن رکھنا جائز ہے اور دیگر اشیاء رہینہ کی طرح زمین بھی مرتھن کے قبضہ میں رہے گی اور مرتھن کو کسی تصرف کا حق نہیں ہے فقط امانت کے طور پر قبضہ میں رکھے نہ خود زراعت کرے نہ کسی کو کرایہ وغیرہ پر دے، اگر کرایہ پر زمین وغیرہ دیدی تو دیکھا جائے کہ مالک کی اجازت سے دی گئی ہے یا بدون اجازت دی ہے اگر اجازت سے دی ہے؟ تو کرایہ مالک کا حق ہے اور رہن باطل ہوگیا اور مرتھن کو یہ حق نہیں رہا کہ اس کو بطور رہن روک رکھے اور اگر مرتھن نے بدون اذن مالک کرایہ پر دی ہے تو کرایہ (۱) لینے کا حق تو مرتھن کو ہے، لیکن یہ کرایہ اس کے لئے حلال نہیں ہے، بلکہ واجب التصدق ہے (۲) اور رہن باقی ہے، اور اگر مرتھن نے خود زراعت کی ہے، تو اگر اجازت راہن سے کی ہے تو اس پر ضمان کچھ نہیں لیکن یہ انتفاع ناجائز ہے، اور اگر بدون اجازت ہے تو نقصان کا ضمان لازم ہے۔

فی العالمگیریة (٦/٢٨٣) مایجوز بیعه یجوز رهنه .

وایضاً فی (صـ ٢٩٩) اعلم بان عین الرهن أمانة فی ید المرتهن بمنزلة الودیعة الخ .

وایضاً فی الصفحة المذکورة : وان اجر المرتهن من أجنبی بأمر الراهن یخرج من الرهن ، وتکون الأجرة للراهن ، وان کانت الاجارة بغیر اذن الراهن الأجر للمرتهن یتصدق به ، وللمرتهن أن یعید ها فی الرهن ، وقال ایضاً بعد السطر ولو حبسه عن الراهن بعد ما انقضت مدة الاجازة صار غاصباً ، هکذا فی شرح الطحطاوی وفی الدرالمختار مع الشامی (٥/٥١٧) ثم نقل عن التهذیب أنه یکره للمرتهن أن ینتفع بالراهن وان اذن له الرهن .

قال المصنف رحمه الله : وعلیه یحمل ما عن محمد بن أسلم من أنه لایحل للمرتهن ذلك ولو بالاذن ، لانه رباً، قلت : وتعلیله یفید أنها تحریمیة ، فتأمله .

(۱) البتہ اگر زمین میں کچھ نقصان آ گیا ہو تو ضمان دینا پڑے گا۔
(۲) اور اگر یہ کرایہ مالک زمین کو دیدیا جائے تو مالک کے لئے ح [illegible] ۔ منہ

وفی الصفحة المذکورة ایضا: وفیھا (ای الجواھر) زرع المرتھن أرض الراھن، ان ابیح له الانتفاع لا یجب شئی وان لم یُبح لزمه نقصان الأرض وضمان الماء لو من قناة مملوکة فلیحفظ.

وقال الشامی تحت (قوله: لو من قناة مملوکة) ھذا خلاف المفتی به من أنه لا یضمن الا ماملکه بالاحراز کمامر فی کتاب الشرب وماء القناة غیر محرز.

پس مرتھن کو چاہئے کہ زمین وغیرہ کو بیکار رکھے۔

اور ایک صورت انتفاع کی یہ ہے کہ مرتھن ہی زمین کو راہن سے کرایہ پرلیکر خود زراعت کرے، اس میں یہ تفصیل ہے، کہ اگر وہی قبضہ جو رہن کے وقت ہوا تھا اجارہ کے وقت رہے، تو اجارہ صحیح نہیں ہوا اور اگر واپس کر کے دوبارہ قبضہ کیا تو اجارہ صحیح ہو گیا، مگر رہن باطل ہو جائے گا۔

کما فی العالمگیریة (٢٩٩/٦) وکذلك لو استأجره المرتھن صحت الاجارة وبطل الرھن اذا جدد القبض.

وفی الشامی (٥٠٧/٥) ویشترط فی الاجارة (ای لصحة الاجارة وبطلان الرھن جمیعاً، وعلل فی البدائع بأن قبض الرھن وقبض الاجارة متغائر، فلا بد من قبض جدید للاجارة، تجدید القبض کما علمت انفاانتھی. (ماخوذ از امداد الاحکام: ٤٩٦/٣)

رہن سے فائدہ حاصل کرنے کا حکم:

رہن سے فائدہ حاصل کرنے کے متعلق چند سوالات وجوابات جن سے جزئیات کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں:

(١) زمین یا زیور یا مکان وغیرہ رہن یعنی گروی اپنے پاس رکھ کر اس سے فائدہ اُٹھانا اور زمین گروی وغیرہ کی پیداوار کھانا حرام ہے یا نہیں؟

(٢) گروی چیز سے نفع حاصل کرنا سود ہے یا نہیں؟ اگر سود ہے تو اس سود کو حلال جاننے والے شخص کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

(۳) اور سود کو حلال جاننے والے کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

(٤) گروی چیز کے منافع حرام ہونے اور سود ہونے میں علماء احناف میں اختلاف بھی ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس کا؟ بینوا توجروا

الجواب: (۱) حرام ہے، اگر رہن اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مرتھن نفع حاصل کرے گا یا مشروط نہ ہو مگر معروف ہو، جیسا کہ اس زمانہ میں ہے، یا بدون اجازت راہن کے نفع حاصل کرے۔

(۲) ہاں مرھون سے نفع اٹھانا سود ہے اور اسکو حلال سمجھنے والا فاسق ہے جبکہ انتفاع مشروط ہو یا بلا اذن ہو۔

(۳) اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔

(٤) اگر انتفاع مشروط فی الرہن ہو تو اتفاقاً حرام ہے، اور معروف بھی بحکم مشروط ہے اگر معروف و مشروط نہ ہو اور بلا شرط و بلا عرف کے راہن اجازت دیدے تو جواز میں اختلاف ہے اور اگر بلا اذن انتفاع ہو تو وہ بھی اتفاقاً حرام ہے۔ (ماخوذ از امداد الاحکام)

رہن کی ایک خاص صورت کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید و عمرو کے پاس ایک حصہ معینہ زمین کے مثلاً دوسو روپیہ کے مقابل میں رُہن رکھا، اس شرط پر کہ مرتھن عمرو اس زمین مرھونہ سے نفع اٹھائے اور فی سال روپیہ مذکورہ سے پانچ روپیہ گھٹ جائے جس وقت راہن چاہے کہ زمین مذکورہ کو خلاص کرے زمین تو مابقیہ روپیہ دیکر خلاص کرسکتا ہے، مثلاً دو سال کے بعد اگر راہن زمین مذکورہ کو خلاص کرنا چاہے تو ایک سو نوے 190 روپے دے کر خلاص کرے۔

خلاصہ:

راہن اور مرتھن نے زمین مرھونہ کے خلاص کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی تو یہ صورت رہن میں شرعاً جائز ہوگی یا نہیں؟ بر تقدیر ثانی سود ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب: یہ صورت جائز نہیں۔

ولا بتأويل انه خمس الرباء قيمةً لمنافع السنة كلها لكونه بيع مالم يوجد.

اور اگر کسی نے سود کا حیلہ بنانے کی نیت سے یہ صورت اختیار کی تو اس کی اس نیت کا بھی گناہ ہوگا۔ (حوالہ بالا)

مرھون کے اجارہ کا حکم:

اگر راہن مرہونہ زمین مرتھن کو کرایہ پر دیدے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس مسئلہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ اجارہ ایک جائز معاملہ ہے، مالک اپنی زمین، اجارہ کی تمام شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے کرایہ پر دے سکتا ہے، چاہے مرتھن کو دے یا کسی غیر کو، لیکن جب مالک اور مستاجر کے درمیان پہلے رہن کا معاملہ ہو چکا، اب مرتھن کو کرایہ پر دینے کی وجہ سے عقد رہن کا معاملہ ختم ہو جائے گا، لہٰذا اجارہ کا معاملہ ختم ہونے پر قرض ادا کئے بغیر زمین اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے، مرتھن کے لئے انکار کی گنجائش نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ : اما الاجارة فالمستاجر ان كان هو الراهن فهى باطلة ، وان هو المرتهن وجد د القبض للاجارة بطل الرهن والاجرة للراهن .

(ردالمحتار : ٦/ ٥١١ ، كتاب الرهن)

رہن کو فروخت کرنے کا حکم:

اگر قرض ادا کرنے کی مدت پوری ہو جائے تو راہن پر لازم ہے کہ قرض کا ادا کر دے اور اپنا رہن چھڑا لے، اگر قرض ادا نہ کرے تو حاکم اس کو قرض ادا کرنے پر مجبور کرے گا اگر قرض ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو رہن کو فروخت کر دیا جائے گا، اگر رہن کی قیمت قرض سے زائد ملے تو زائد حصہ مالک (راہن) کو دیدیا جائے گا اور اگر قیمت کم ملے تو وہ بعد میں راہن سے وصول کیا جائے گا۔

غلق الرہن کا حکم:

عرب میں اسلام سے پہلے دستور تھا کہ قرض کی مدت پوری ہونے پر راہن اپنا رہن نہ چھڑائے تو مرتھن اس پر قبضہ کر لیتا اور اپنی مرضی سے تصرف کرنا چاہے اس کی قیمت مقدار قرض سے کتنا ہی زیادہ ہو، تو اسلام نے اس دستور کو مٹایا اور باطل طریقہ پر لوگوں کے مال کھانے سے منع فرمایا:

كما في الحديث : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : " لا يغلق الرهن لصاحبه غنمه وعليه غرمه " .

(اخرجه ابن ماجه : ۲ / ۸۱٦)

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ راہن رہن چھڑانے سے عاجز ہونے کی صورت میں مرتھن کو رہن پر قبضہ کر لینے کا حق نہ ہوگا، بلکہ راہن ہی اس کا مالک رہے گا البتہ اس کو رہن فروخت کر کے قرضہ چکانے پر مجبور کیا جائے گا۔

احکام الغصب

غصب کے احکام:

الغصب لغة : اخذ الشئی ظلما مجاهرة على وجه القهر.

کسی کے مال کو زبردستی ظلماً چھین لینا۔

كما في قوله تعالىٰ : ﴿ وكان وراء هم ملك يأخذ كل سفينة غصبا ﴾ (سورة الكهف : ۷۹)

اصطلاحاً : اخذ مال متقوم، محترم مملوك للغير بطريق التعدى. (كتاب الاختيار للموصلى : ۳/۵۸)

غصب کرنا بہت بڑا گناہ ہے:

کسی کا مال ناحق کھانا بہت بڑا ظلم اور گناہ ہے۔

قوله : ﴿ لاتأكلوا اموالكم بينكم بالباطل الاأن تكون تجارة عن تراض منكم ﴾ (سورة النساء : ۲۹)

اے ایمان والو: آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

وقوله عليه السلام : "من اخذ شبرًا من الارض ظلما طوقه الله من سبع ارضٍ". (اخرجه البخارى : ۲/۶۸)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ناحق کسی کی ایک بالشت زمین غصب کر لی

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ساتوں زمینوں کو طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالے گا۔

وفی خطبة حجة الوداع : یاأیها الناس ان دماء کم واموالکم واعراضکم حرام علیکم کحرمة یومکم هذا فی شهر کم هذا فی بلدکم هذا الاهل بلغت اللهم فاشهد .

(طرف من حدیث اخرجه الشیخان ، فی خطبة حجة الوداع)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ ”اے لوگو! تمہارا آپس میں خون ریزی کرنا یا ایک دوسرے کا مال غصب کرنا، یا عزت کو نقصان پہنچانا ایسا ہی حرام ہے، جیسا کہ آج کے دن کی حرمت ہے اس مقدس دن میں اس مقدس شہر میں۔ اس کے بعد صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا، کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے؟ سب نے اقرار کیا ہاں، پھر ارشاد فرمایا کہ یا اللہ اس گواہی پر آپ کو گواہ بناتا ہوں۔

وقوله علیه السلام : " کل مسلم علی المسلم حرام ، دمه وماله وعرضه " .

(مسلم رقم : ٢٥٦٤ ، ترمذی : ١٩٢٨ وقال هذا حدیث حسن)

یعنی جناب نبی کریم ﷺ نے دوسری روایت میں ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون بہانا، مال اور عزت کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔ (ترمذی شریف)

مال مغصوب کا ضمان واجب ہے:

جو کسی کا مال غصب کرے ایسے غاصب ڈاکو پر شرعاً واجب ہے کہ جو مال غصب کیا اس کو واپس لوٹا دے اگر اس نے مال خرچ کر دیا تو اس کا ضمان واجب ہے، یعنی اگر شئی مغصوب مثلی ہے تو اس کا مثل واجب ہے اور اگر مثل بازار سے منقطع ہو گیا ہے تو یوم انقطاع کی قیمت لگائی جائے گی اور اگر مغصوب قیمی ہے تو یوم غصب کی قیمت واجب ہے۔

قال فی التنویر وشرحه : او یجب رد مثله ان هلك وهو مثلی وان انقطع المثل بأن لا یوجد فی السوق الذی یباع فیه وان کان یوجد فی البیوت ابن کمال فقیمته یوم الخصومة ای وقت القضاء وعند ابی یوسف رحمه الله تعالیٰ یوم الغصب وعند محمد رحمه

اللہ تعالیٰ یوم الانقطاع ورجحهما قهستانی وتجب القمية فی القیمی یوم غصبه اجماعاً .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله رجحهما) ای قول ابی یوسف وقول محمد رحمهما الله تعالىٰ وكان الاولى ان يقول ايضاً ای كما رجح قول الامام محمد رحمه الله تعالىٰ ضمناً لمشی المتون عليه وصريحاً قال القهستانی وهو الاصح كما فی الخزانة وهو الصحيح كمافی التحفة وعند ابی یوسف یوم الغصب وهو اعدل الاقوال كما قال المصنف وهو المختار علی ما قال صاحب النهاية وعند محمد یوم الانقطاع وعليه الفتوىٰ كمافی ذخيرة الفتاوی وبه افتى كثير من المشائخ . (رد المحتار : ۱۲۸/۵)

بلا اجازت بیوی کی زمین میں تصرف کرنے کا حکم:

اس بارے میں ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے تاکہ مسئلہ کی وضاحت ہو جائے۔

سوال : زوجہ کی زمین میں اگر شوہر مکان بنالے تو یہ کس کا ہوگا؟ آیا بیوی کا یا شوہر کا؟ بینوا توجروا

جواب : اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) بیوی کے لئے اس کے اذن سے مکان بنایا تو مکان بیوی کا ہوگا اور جو مصارف آئے وہ بیوی پر قرض ہوں گے۔

(۲) بیوی کے لئے بلا اذن بنایا تو تبرع شمار ہوگا۔

(۳) شوہر نے اپنے لئے بیوی کی اجازت سے بنایا تو زمین بیوی کی رہے گی اور مکان شوہر کا۔

(٤) بیوی کی اجازت کے بغیر اپنے لئے بنایا تو مکان شوہر کا ہوگا مگر بیوی اس کو گرا کر اپنی زمین خالی کرانے کا مطالبہ کر سکتی ہے، اگر مکان گرانے میں زمین کا ضرر ہو تو بیوی مکان کی قیمت دیکر مکان کی مالک بن سکتی ہے، قیمت ایسے مکان کی لگائی جائے گی جس کے گرانے کا فیصلہ کیا جا چکا ہو جو ملبہ کی قیمت سے شاید کچھ زیادہ متفاوت نہ ہوگی۔

قال فی التنویر و شرحه : عمّر دارزوجته بماله باذنها فالعمارة لها والنفقة دین علیها لصحة امرها ولو عمّر لنفسه بلا اذنها فالعمارة له ویکون غاصبا للعرصة فیؤمر بالتفریغ بطلبها ذلك ولو لها بلا اذنها فالعمارة لها وهو متطوع فی البناء فلا رجوع له .

وقال العلامة ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ : (قوله عمر دار زوجته الخ) علی هذا التفصیل عمارة کرمها وسائر املا کها جامع الفصولین وفیه عن العدة کل من بنی فی دار غیره بامره فالبناء لأمره ولو لنفسه بلا امره فهو له وله رفعه الا ان یضر بالبناء فیمنع ولو بنی لرب الارض بلا امره ینبغی ان یکون متبرعا کما مرّ اه (قوله بلا اذنها) فلو باذنهاتکون عاریة.

(رد المحتار : ۵۲۷/۵ ماخوذ از أحسن الفتاوی : جـ ۷)

غیر کی زمین میں غلطی سے تصرف:

سوال : ہمارے پڑوس میں مہاجر کی زمین ہے، شروع میں تپیدار کے نشان لیکر حد قائم کی اب سرکاری طور پر پیمائش کرائی تو اس مہاجر کی زمین کم نکلی وہ ہماری زمین سے پوری کی گئی جو کہ تقریباً نصف ایکڑ سے زائد ہے، اس کی فصل ہم اپنی زمین سمجھ کر اُٹھاتے رہے کئی سال ہو گئے یہ بھی یاد نہیں کہ فصل کیا کیا کاشت ہوئی اور پیداوار کتنی ہوئی ؟ کیا غلطی اور بھول چوک میں گزشتہ آمدنی کا حق مہاجر کو دینا لازم ہے یا کہ نہیں؟ بینوا توجروا

جواب : تخم کی لاگت اور زراعت کی مزدوری نکال کر باقی کا اندازہ لگا کر مالک کو لوٹانا واجب ہے۔

مغصوبہ زمین میں تصرف اور اس کی آمدن کا حکم:

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے امداد الاحکام سے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال : اگر کسی کے باپ دادا نے غصبی روپیہ کی جائیداد خریدی اور اس جائیداد کی وجہ سے وہ مالدار چلا آتا ہے، آیا ایسے شخص پر زکوۃ یا حج یا قربانی وغیرہ واجب ہوں گے یا نہیں؟ اگر ایسی جائیداد سے خود آپ یا اپنے لڑکے بالغ یا اور کسی یگانے بیگانے کی دعوت کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور

بعض لکھتے ہیں کہ ملکیت ہو جانے سے حرمت حلت میں مبدل ہو جاتی ہے، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا، امید ہے کہ اس مسئلہ کو بہت اچھی طرح سے بحوالۂ دلائل تحریر فرمائیں گے؟

الجواب : اگر اس نے دوسرے کی زمین غصب کی ہو تب تو وہ اس زمین سے مالدار نہیں ہوسکتا، لیکن زمین مغصوبہ میں غاصب جو کچھ کاشت وغیرہ کرے گا، وہ کھیتی اور اس کا منافع غاصب کی ملک ہے گو ملک خبیث ہے اگر کھیتی اور پیداوار کی آمدنی مقدار زکوۃ اور مقدار حج کو پہنچ جائے تو، اس کے ذمہ زکوۃ اور حج سب فرض ہے اور زمین مغصوب منہ کی ملک ہے اور غاصب کے ذمہ اس زمین کے استعمال کرنے کی اجرت واجب ہے، یعنی عرفاً جس قدر لگان کا شتکاروں سے زمیندار لیا کرتے ہیں، وہ اس کو دینا واجب ہے نیز اس سے معافی چاہنا بھی واجب ہے، کیوں کہ اس نے بدون اجازت کے اس کی زمین کو استعمال کیا، جب تک غاصب ایسا نہ کرے دوسروں کو اس کی آمدنی سے دعوت قبول کرنا حرام ہے، اور اگر غاصب نے زمین غصب نہیں کی بلکہ روپیہ غصب کیا اور اس روپیہ سے زمین خرید لی، تو یہ زمین غاصب ہی کی ملک ہے، روپیہ والے کی ملک نہیں، لیکن جب تک غاصب مغصوب منہ کا روپیہ ادا نہ کرے اس وقت تک زمین اس کی ملکیت خبیث ہے، لیکن جب یہ زمین کا مالک ہے تو اس پر اس کی آمدنی میں زکوۃ وحج وغیرہ کی فرضیت ضرور ہوگی، (بشرطیکہ آمدنی اس قدر ہو جائے کہ مغصوب منہ کی رقم ادا کرنے کے بعد بھی مقدار نصاب مقدار حج باقی رہے) اس صورت میں غاصب کے ذمہ مغصوب منہ کا روپیہ ادا کرنا واجب ہے اور وہ روپیہ اس کے ذمہ قرض ہے، زمین میں مغصوب منہ کا کوئی حق نہیں، زمین غاصب ہی کی ملکیت ہوگی، لیکن اگر غاصب اس کا روپیہ ادا نہ کرے تو وہ بعد حکم حاکم کے زمین بھی اپنے روپیہ کے معاوضہ میں لے سکتا ہے۔

یہ تو ملکیت کا حکم تھا، رہا دوسروں کا اس کے یہاں کھانا کھانا، دعوت قبول کرنا، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر غاصب کی آمدنی اسی زمین سے ہے جس کو اس نے غصب کے روپیہ سے خریدی تب تو لوگوں کو اس کا کھانا کھانا حرام ہے، اور اگر دوسری آمدنی بھی ہے اور حلال آمدنی حرام پر غالب ہے، تو دعوت قبول کرنا فتوی سے جائز ہے، مگر تقویٰ کے خلاف ہے، جب تک یہ شخص غصب کو واپس نہ کردے۔

(ماخوذ از امداد الاحکام)

بلا اجازت کسی کے جانور ذبح کرنا:

اگر ضرورت کی وجہ سے کسی کے جانور خریدے بغیر ذبح کردے اور نیت یہ ہو کہ بعد میں قیمت ادا کردیں گے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ دوسروں کے جانور مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کرنا غصب کے حکم میں ہے، لہٰذا مالک کو دو باتوں کا اختیار ہوگا، چاہے تو مذبوحہ جانور غاصب کے حوالے کر کے اس سے پورے سالم جانور کی قیمت وصول کرے اور اگر چاہے تو مذبوحہ جانور رکھ لے اور ذبح کی وجہ سے سالم بکرے کے مقابلہ میں قیمت میں جو کمی واقع ہوئی ہے وہ غاصب سے وصول کرے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: قال في العمادية في فصل ٣٢ ومن ذبح شاة غير فما لكها بالخيار ان شاء ضمنه قيمتها وسلمها اليه وان شاء اخذها وغرمها النقصان.

(تنقيح الحامديه: ٢/ ١٧٥، كتاب الغصب، هكذا فتاوىٰ خانية على هامش الهنديه: ٣/ ٢٤٥)

مغصوبہ زمین کے منافع کا حکم:

اگر کوئی زمین غصب کر کے منافع حاصل کرتا رہا اور منافع کا کچھ حصہ خود استعمال کرتا رہا کچھ رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کرتا رہا چند سالوں کے بعد زمین اصل مالک کو واپس کردی تو اب تک کے منافع کا کیا حکم ہوگا؟ کیا اصل مالک کو حق ہوگا کہ گذشتہ سالوں کے پیداوری منافع کا مطالبہ کرے؟

تو یاد رہے کہ شرعاً کسی کا مال غصب کرنا اور اس سے انتفاع حاصل کرنا حرام ہے زمانہ غصب میں جو کچھ بھی مغصوبہ سے حاصل ہوا ہو وہ مغصوب منہ کا حق ہے، بنابر ایں بکر اپنی مغصوبہ زمین کی جملہ پیداوار کا مطالبہ کرسکتا ہے، اسی طرح مغصوبہ زمین کی بازیابی کے بعد مساجد اور دیگر رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کی ہوئی رقم کی واپسی کا بھی مطالبہ کرسکتا ہے، مگر علاقے کے عرف کے مطابق غاصب کو اجرِ مزارعت دینا لازم ہوگا۔

وفي الهندية: وسئل شيخ الاسلام عطاء بن حمزة عمن زرع ارض انسان ببذرنفسه بغير اذن صاحب الارض هل لصاحب الارض

ان يطالبه بحصة الارض قال نعم ان جرى العرف فى تلك القرية انهم يـزرعـون الارض بثلث الخارج او ربعه او نصفه او بشئى مقدر شائع يجب ذلك القدر الذى جرى به العرف.

(الفتاوىٰ الهندية : صـ ١٤٤ باب العاشر فى زراعة الارض المغصوبة)

قـال الـعلامةابن عابدين رحمه اللّٰه : فالحاصل ان من زرع ارض غيـره بـلا اذنه ولوعلى وجه الغصب فان كانت الارض ملكا واعدها ربهـا الـزراعة اعتبر العرف فى الحصة ان كان ثمة عرف والا فان اعد هـالـلايـجـار الـخـارج كـلـه لـلـزارع وعليه اجر مثلها لربها والافان انتقصت فعليه النقصان والافلاشئى عليه .

(تنقيح الحامدية : ٢/١٧٢ ،كتاب الغصب ،
ومثله فى الفتاوىٰ الكاملية : صـ ٢٠٩ ، كتاب الغصب)

ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کا حکم:

اگر ڈاکو کسی کا مال چھیننا چاہے تو صاحب مال کو شرعاً حق حاصل ہے، مدافعت کر کے اپنے مال کو بچانے کی کوشش کرے البتہ یہ کوشش کرے کہ معمولی مدافعت سے کام چل جائے ،لیکن اگر مدافعت میں قتل وقتال کی بھی نوبت آ جائے تو شرعاً اس کی بھی اجازت ہے کیوں کہ انسان کی جان و مال اور عزت تینوں شریعت کی نگاہ میں محترم ہیں، ان کی حفاظت کے لئے قتال جائز ہے۔

کـمـا فـى حديث اخرجه مسلم رقم ١٤١ : "كل المسلم على المسلم حرام ، دمه،وماله وعرضه ."

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون بہانا مال لوٹنا، عزت کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔

مدافعت کرتے ہوئے ڈاکو مارا جائے تو جہنمی ہوگا اور صاحب مال مارا جائے تو شہید ہوگا۔

عـن ابـى هـريـرة رضى اللّٰهعنه أنه قال" جاء رجل الىٰ رسول اللّٰه صـلـى اللّٰه عـلـيـه وسلم ، فقال يا رسول اللّٰه أرأيت ان جاء رجل يريد

اخذ مالی قال فلا تعطه مالك، قال ارأیت ان قاتلنی ، قال قاتله قال أرأیت ان قتلنی قال فانت شهید، قال أرأیت ان قتلته قال هو فی النار." (اخرجه مسلم : رقم ۱٤۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے بتائیے کہ کوئی شخص میرا مال مجھ سے چھیننا چاہے تو میرے لئے کیا حکم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنا مال اس کو مت دو، تو دوبارہ عرض کی کہ اگر وہ مجھ سے قتال کرے تو میں کیا کروں؟ فرمایا تو بھی قتال کر، پھر عرض کیا اگر وہ مجھے قتل کردے تو کیا ہوگا، ارشاد فرمایا کہ تو شہید ہوگا عرض کیا کہ اگر میں ڈاکو کو قتل کردوں تو کیا ہوگا، ارشاد فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گا۔

وفی الحدیث الصحیح : من قتل دون ماله فهو شهید، ومن قتل دون دمه أی دفاعاً عن نفسه فهو شهید، ومن قتل دون اهله ای دفاعا عن عرضه فهو شهید .

(اخرجه ابو داؤد : ٤٧٧٢، والترمذی : ١٤٢١وقال حسن صحیح ، فقه المعاملات)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے، اور جو شخص اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ بھی شہید ہے، اور جو شخص اپنے اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ بھی شہید ہے۔ (ترمذی ، ابو داؤد)

غصب شدہ مال کسی کے پاس مل جائے اس کا حکم:

اگر اپنا غصب شدہ مال کسی کے پاس صحیح حالت میں مل جائے تو شرعاً اسکو حق حاصل ہے کہ اس سے واپس لے لے اگر چہ اس نے غصب کرنے والے سے خریدا ہو، کیوں کہ جس وقت غاصب ڈاکو یہ مال فروخت کرر ہا تھا اس مال کا مالک نہیں تھا، لہٰذا یہ بیع منعقد ہی نہیں ہوئی، لہٰذا مالک اپنا مال اسی طرح واپس حاصل کرلے باقی یہ شخص غاصب سے ادا کردہ قیمت واپس لے لے۔

عن ابی هریرة رضی الله عنه ، ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من ادرك ماله بعینه عند رجل او انسان قد افلس ، فهو احق به من غیره .

(اخرجه البخاری : ۲/۵۸ ، باب اذا وجد ماله عند مفلس فهو احق به)

وجاء فی حدیث آخر : من وجد عین ماله عند رجل فهو احق به، ویتبع البیع من باعه ، ای یرجع مشتری علی من باعه المتاع فیسترد الثمن منه. (اخرجه ابوداؤد والنسائی ، فقه المعاملات)

غصب در غصب کا حکم:

ایک شخص نے دوسرے کا مال غصب کیا پھر دوسرے ڈاکو نے اس پر ڈاکہ ڈالا، مثلاً کسی کی گاڑی تھی ایک شخص اس سے چھین کر لے گیا، لیکن دوسرے ڈاکو نے اس سے چھین لیا پھر اس کے ہاتھ سے ٹوٹ گئی یا کسی وجہ سے قابل استعمال نہیں رہی تو مالک کو شرعاً حق حاصل ہے کہ اس کے خلاف مقدمہ دائر کر کے دونوں میں سے جس سے چاہے ضمان وصول کر سکتا ہے۔

لوغصب شخص متاع انسان أو سیارته فجاء شخص آخر فغصب هذا المتاع من الغاصب أو اغتصب السیارة أو الدابة ، ثم هلك فی یده فمن یضمن هذا المغصوب اتفق فقهاء المذاهب الاربعة علی أن المالك بالخیار ان شاء ضمن الغاصب الاول لو جود فعل الغصب منه، فهو المتعدی الاول وان شاء ضمن الغاصب الثانی.

(فقه المعاملات)

احکام اللقطة

معمولی چیزوں کا حکم:

اگر کسی کو گمشدہ چیز مل جائے اور وہ ایسی حقیر چیز ہے کہ مالک خود اس کو تلاش نہیں کرے گا، مثلاً ایک کھجور یا ایک روپیہ ہے یا ایک پیاز یا کوئی انگور کا دانہ، خیال یہی ہے کہ یہ اللہ کی نعمت یوں ہی ضائع ہو جائے گی، تو اسکو اٹھا کر کسی کو دیدے یا خود استعمال کر لے۔

کما فی روایة البخاری عن انس رضی اللّٰه عنه انه قال " مر النبی صلی اللّٰه علیه وسلم بتمرة فی الطریق فقال لولا انی اخاف ان تکون من الصدقة لاکلتها " .

(اخرجه البخاری : ۲/ ۶۳، باب اذا وجد تمرة فی الطریق)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا کسی راستہ پر گذر ہوا ایک کھجور پڑی ہوئی ملی تو ارشاد فرمایا کہ اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ یہ کھجور صدقہ کی ہے تو اس کو اٹھا کر کھالیتا۔

وعن جابر رضی اللّٰه عنه قال" رخص لنا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی العطاء، والسوط والحبل واشاهه یلتقطه الرجل ینتفع به". (اخرجه ابوداؤد واحمد)

کوئی قیمتی چیز پڑی ہوئی ملنے کا حکم:

اگر کوئی قیمتی چیز پڑی ہوئی مل جائے، اور اس کے بارے میں یہ خیال ہو کہ مالک خود ہی واپس آکر اٹھا لے گا، تو چھوڑ دی جائے اور اگر یہ خیال ہو کہ اگر میں نے نہیں اٹھایا تو ضائع ہو جائے گی، یا کوئی خائن شخص یا چور اٹھا لے گا مالک تک نہیں پہنچ پائے گی ایسی صورت میں حفاظت کی نیت سے اٹھانا واجب ہے۔

کما فی کتاب الاختیار قال: اللقطة اسم للمال الملقوطه واخذها افضل لئلا تصل الیها یدخائنة، وان خاف ضیاعها فواجب اخذها، صیانة لحق الناس عن الضیاع، وان یخاف علی نفسه الطمع فیها، وترك التعریف والرد، فالترك اولیٰ، وهی امانة فی ید الملتقط.

(الاختیار لتعلیل المختار: ۳/ ۳۲)

لقطہ کی تعریف اعلاناً کرنا واجب ہے:

اگر کوئی پڑی ہوئی چیز حفاظت کی نیت سے اٹھالے تو اس پر واجب ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے اس کا اعلان کرے، مساجد کے دروازے پر یا بازاروں میں اعلانات لگائے، اخبارات میں اشتہار شائع کرے، اگر مالک مل جائے اور علامات سے یقین یا ظن غالب حاصل ہو جائے کہ یہی شخص اس چیز کا مالک ہے، تو اس کے حوالے کر دینا لازم ہے، اگر حوالہ نہیں کیا تو یہ شخص غاصب شمار ہوگا انکار کے بعد اگر ہلاک ہو جائے تو ضمان لازم ہوگا۔

عن زید بن خالد الجهنی أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم سئل عن اللقطة فقال: عرفها سنة فان جاء احد یخبرك بها، ای فادفعها الیه،

والا فاستنفقها . (صحيح البخاري : ٢/٦٣)

لقطہ کے استعمال کا حکم:

ملی ہوئی چیز کے بارے میں ہر ممکن طریقہ سے اعلان کرنے کے باوجود مالک نہ مل سکے تو شرعاً لازم ہے کہ اس کو فقراء پر صدقہ کردے اگر عزیز واقارب میں سے کوئی فقیر ہو مثلاً والدین بھائی بہنیں وغیرہ جن پر صدقہ ہوسکتا ہے اسی طرح دیگر فقراء، ومساکین پر بھی، خود اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔

لو رد النهي في الحديث : لا يحل مال امرئ مسلم الا بطيب نفس منه . (الترغيب والترهيب)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''کسی مسلمان کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں'' ہاں البتہ اگر وہ خود فقیر ہو تو خود بھی استعمال کرسکتا ہے۔

ملی ہوئی چیز صدقہ کرنے کے بعد مالک نکل آئے:

اگر اعلان کے بعد مالک نہ مل سکا اس لئے صدقہ کردیا یا فقیر ہونے کی بناء پر خود استعمال کرلیا اس کے بعد مالک نکل آیا، تو اب مالک کو اختیار ہوگا کہ صدقہ پر راضی رہے یا اٹھانے والے سے تاوان وصول کرے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله : فينتفع بها لو فقيرا والا تصدق بها على الفقير ولو على اصله وفرعه وعرسه فان جاء مالكها بعد التصدق خير بين اجازة فعله ولو بعد هلاكها فله ثوابها او تضمينه . (رد المحتار : ٤/٧٩، كتاب القطة)

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ریل کے ذریعہ سفر فرما رہے تھے سیٹ پر چند رفقاء اور بھی تھے قریب میں ایک مسافر سیٹ پر بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا، اس کے ہاتھ سے ایک بوٹی گر گئی اس نے جوتی سے اس کو سیٹ کے نیچے کردیا، حضرت نے جب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری ہورہی ہے اور یہ نعمت ضائع ہورہی ہے تو اس کو اٹھایا اور ایک رفیق سفر سے فرمایا کہ اس کو پانی سے دھولیں چنانچہ جب اس کو دھو کر صاف کرلیا تو حضرت نے خود

کھانے کا ارادہ فرمایا لیکن ساتھی نے خود کھانے کی اجازت مانگی تو حضرت نے اجازت دیدی۔

اس سے سبق حاصل ہوا کہ اگر کوئی چیز ضائع ہورہی ہو تو اس کو ضائع ہونے سے بچانا چاہئے، ورنہ نعمت الٰہی کی ناقدری ہوگی تو مزاج شریعت کے خلاف ہے۔

کافر کے لقطہ کا حکم:

زید مثلاً کسی کافر کا مقروض تھا اب وہ قرض خواہ ملک چھوڑ کر دوسرے ملک چلا گیا اب اس کا کوئی پتہ نہیں کہاں چلا گیا، تو اس کا قرض کیسے ادا کیا جائے؟ اس بارے میں حکم یہ ہے کہ اولاً خط وکتابت یا دیگر ممکنہ ذرائع سے قرض خواہ یا اس کے ورثہ کا پتہ لگانے کی کوشش کرے، انتہائی کوشش کے بعد جب مایوسی ہو تو اس رقم کو صدقہ کردے، اس صورت میں اصل حکم تو بیت المال میں جمع کرانے کا ہے، مگر چونکہ حکومت اسلامیہ نہ ہونے کی وجہ سے بیت المال مفقود ہے، اس لئے فقراء پر تصدق کردے۔

وفي الهندية قال: كل لقطة يعلم انها لذمي لاينبغي أن يتصدق ولكن يصرف الى بيت المال لنوائب المسلمين كذا في الراجية.

(عالمگيرية: ٦/ ٢٩٠ ومثله في الشاميه: ٤/ ٢٧٩، ماخوذ از احسن الفتاوى: ٦/ ٣٨٩)

گھڑی ساز کو گھڑی دے کر واپس نہیں آیا:

اگر کوئی گھڑی ساز ہے یا کاریگر یا دھوبی یا درزی یا کوئی دیگر ایسا شخص جو لوگوں کی مختلف چیزوں کی مرمت کرتا ہے، لوگ اپنی پرانی چیزیں مرمت کے لئے چھوڑ جاتے ہیں یا دھونے کے لئے کپڑا دے جاتے ہیں، اس کے بعد واپس نہیں آتے، تو ایسی صورت میں اگر مالکان کی آمد سے مایوسی ہوجائے اور مزید پڑے رہنے سے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو ان گھڑیوں کو یا کپڑے وغیرہ کو صدقہ کردیا جائے خود استعمال کرنا جائز نہیں۔ (ماخوذ از کتب فقہ)

مسجد کی حدود میں کوئی چیز گم ہوجائے:

جو چیز مسجد سے باہر یا مسجد میں گم ہوئی ہو، یا کہیں ملی ہو، اس کا اعلان مسجد میں کرنا صحیح نہیں کیوں کہ مساجد اللہ تعالیٰ کی عبادات، نماز، تلاوت ذکر وعظ ونصیحت وغیرہ کے لئے بنائی جاتی ہیں ان مقاصد سے ہٹ کر کوئی کام انجام دینا درست نہیں، لہٰذا مساجد میں گمشدہ چیزوں کا اعلان نہ کیا جائے، البتہ مسجد سے باہر دروازے میں کھڑے ہوکر یا اشتہار وغیرہ کے ذریعہ باہر ہی اعلان کیا

جائے۔

قال الامام المرغینانی رحمہ اللّٰہ : وینبغی ان یعرفھا فی الموضع الذی اصابھا وفی المجامع ، فان ذلک اقرب الی الوصول الی صاحبھا ۔ (ھدایۃ : ۱ / ۶۱۴)

وقال الشیخ محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللّٰہ : واما مکانہ وھو الاسواق وابواب المساجد والجوامع فی الوقت الذی یجتمعون فیہ کادبار الصلوٰۃ فی المساجد وکذلک فی مجامع الناس لان المقصود اشاعۃ ذکرھا، واظھارھا لیظھر علیھا صاحبھا فیجب تحری مجامع الناس ولا ینشد ھا فی المساجد لان المسجد لم یبن لھذا ۔ (او جز المسالک : ۲۹۸/۱۳)

لاوارث بچہ کا حکم:

اگر کوئی بچہ مل جائے، اس کو نہ اٹھانے کی صورت میں ضائع ہونے یا مرنے کا خوف نہ ہوتب بھی اٹھالینا مستحب ہے، اور اگر ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اٹھانا واجب ہے نہ اٹھایا اور بچہ مرگیا تو یہ شخص گناہ گار ہوگا۔

قال فی الاختیار : التقاط صغھاربنی آدم مفروض ، ان علم انہ یھلک ان لم یأخذہ بان کان فی مفازۃ ، صحراء أو بئر أو ارض مسبعۃ، دفعًا للھلاک عنہ، فان غلب علی ظنہ دفع الھلاک ، بأن کان فی مصر ، أو قریۃ ، فأخذہ مندوب ، لمافیہ من السعی فی احیاء نفس محترمۃ ۔ (الاختیار لتعلیل المختار : ۴۹/۳)

لاوارث بچہ کا نان نفقہ:

لاوارث بچہ کا نان نفقہ سرکاری بیت المال کے ذمہ ہے، حکومت کی طرف سے اس کا صحیح انتظام نہ ہونے کی صورت میں عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کی دیکھ بھال، پرورش اور تعلیم وتربیت کا انتظام کرے۔

وانما وجبت نفقتہ فی بیت المال لانہ لاولی لہ ، والسلطان ولی

من لاولی له، فینفق علیه من بیت المال ، لان ماله یکون لبیت المال عند الوفاة فیکون الغرم بالغنم ۔ (فقه المعاملات)

وقال فی کتاب اعلاء السنن : واذا فرض الامام نفقته من بیت المال ، ثم انفق الملتقط علیه شیئا من نفسه لحاجة اللقیط الیه ونوی الرجوع فله ان یرجع فی نفقته ولم یکن متبرعاً ۔

(اعلاء السنن : ۱۳/۳)

مسلمانوں کے لاوارث بچوں کو کافروں کی پرورش میں نہ دیا جائے:

مسلمانوں کے لاوارث بچوں کی پرورش مسلمانوں ہی کی ذمہ داری ہے اگر کوئی کافر انفرادی طور پر مسلمان لاوارث بچوں کی پرورش کرنا چاہے یا کسی ادارہ کی شکل میں مسلمان بچوں کی تعلیم وتربیت کرنا چاہے تو شرعاً یہ جائز نہیں، کیوں کہ کسی کافر کی تربیت میں پرورش پا کر اس کا مسلمان باقی رہنا بہت ہی مشکل ہے، لہٰذا مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ سرکاری سطح پر یا غیر سرکاری سطح طور پر ایسے ادارے وجود میں لائیں جن میں ایسے بچوں کی دینی نہج پر تربیت ہو سکے کافروں کے حوالہ کرنا یہ ایمانی غیرت کے خلاف ہے اور ناجائز ہے۔

لیس للکافر التقاط طفل مسلم، لانه لا ولایة لکافر علی مسلم، ولانه لایؤمن ان یفتنه ویعلمه الکفر بل الظاهر أنه یربیه علی دینه ، وینشأ علی ذالك فیصبح کافرًا،لان تاثیر الوالد علی الولد کبیرفهو سبب لانه أو کفرة ، کما قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کل مولود یولد علی الفطرة فابواه یهودانه ، أو ینصرانه ، أو یمجسانه ۔

(اخرجه البخاری فی کتاب القدر)

لاوارث بچہ کا مسلمان یا کافر ہونا:

جو لاوارث بچہ مسلمانوں کے علاقہ میں مل جائے وہ مسلمان سمجھا جائے گا، اور اس کی پرورش کا حقدار مسلمان ہوگا جو بچہ کافر ذمیوں کے علاقہ میں پایا جائے وہ ذمی ہوگا، کوئی ذمی اگر اس کی پرورش کرنا چاہے تو اس کو دیا جائے ، ورنہ مسلمان ہی پرورش کرے، امید ہے کہ بڑا ہو کر مسلمان ہی ہوگا، یہ اس کے لئے ابدی سعادت کا ذریعہ بنے گا۔

كما فى ملتقى الابحر نقلا عن المبسوط قال : واذا وجد اللقيط فى مصر من امصار المسلمين ، أوفى قرية من قراهم فهو مسلم وان وجد فى قرية من قرى اهل الذمة او فى بيعة او كنيسة كان ذميا .

(ملتقى الابحر : ۱/ ۳۸۱)

لاوارث بچہ کے نسب کا حکم:

لاوارث بچہ مجہول النسب ہوگا، خود سے اس کو کسی کی نسبت کرنا صحیح نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اس کے نسب کا دعویدار نکل آئے کہ یہ میرا بچہ ہے تو اس سے نسب ثابت ہوگا یہ اسی مدعی کا بچہ کہلائے گا، اس میں بچہ کا فائدہ ہے تعلیم وتربیت کے علاوہ اس سے بغیر باپ کے ہونے کا عار بھی دور ہوجائے گا، اگر کئی دعویدار نکل آئے تو جس کے پاس گواہ موجود ہوگا اسی کو دیدیا جائے گا۔

فاذا ادعى انسان نسبة اللقيط اليه ، تصح دعواه ويثبت النسب منه ، ولو من غير بينة ، حرمة للطفل ، لانه يتشرف بالنسب ويتعير بفقده، وبهذه الدعوىٰ يثبت انه ابوه، فيكون احق بولده ، وله أن ينتزعه من الملتقط .

(انظرالاختيار : ۳/ ۳۰ ، ملتقى الابحر : ۱/ ۳۸۰)

سیلاب میں بہتی ہوئی چیزوں کا حکم

اگر کوئی چیز سیلاب میں بہتی ہوئی آجائے، کرسی، برتن اور کوئی کھانے پینے اور پہننے کی چیز تو شرعاً اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں تفصیل ہے، جو چیز سیلاب میں بہہ کر آئے، ان کی دو قسمیں ہیں:

(۱) معمولی چیز جن کی کوئی اہمیت نہ ہو کہ مالک ان کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتے، تو ان کی تشہیر واعلان کی ضرورت نہیں ویسے اٹھا کر استعمال کرسکتے ہیں، ہاں البتہ مالک آکر مطالبہ کرے تو دینا پڑے گی۔

(۲) قیمتی چیزیں جن کی مالک تلاش کرے، اگر ایسی چیزیں ملیں تو ان کا اعلان اور تشہیر ضروری ہے، مالک کا انتظار کیا جائے اگر مالک کے آنے کی توقع نہ ہو، یا ان کے بگڑنے کا خطرہ ہو تو کسی غریب پر صدقہ کردیا جائے، خود اگر حاجت مند ہو تو خود بھی استعمال کرسکتا ہے لیکن اگر مالک

آکر طلب کرے تو دینا ہوگا، اگر اس وقت غریب کے پاس صحیح سالم موجود ہو تو واپس بھی لی جاسکتی ہے۔

حطب وجد فی الماء ان له قیمة فلقطة والافحلال لاخذه کسائر المباحات الاصلیة درر، قال فی الشامیة تحت قوله ان له قیمة فلقطة وقیل انه کالتفاح یجده فی الماء وذکر فی شرح الوهبانیة ضابطا وهوأن مالا یسرع الیه الفساد ولا یعتاد رمیة لحطب وخشب ان کانت له قیمة ولو جمعه من اماکن متفرقه فی الصحیح کما لو وجد جوزة ثم اخری، وهکذا حتی بلغ له قیمة بخلاف تفاح وکمثری فی نهر جار فانه یجوز اخذه وان کثر لانه مما یفسد لو ترك الخ.

(شامیة کتاب اللقطة مطلب فیمن وجد حطبا فی نهر جار الخ: ٤/٢٨٤)

جہاز والے پانی میں سامان ڈال دیں:

اگر جہاز والے پانی میں سامان ڈال کر چلے جائیں اور مقصد یہ ہو کہ جو چاہے لے جائے، تو اس کو لینا اور استعمال کرنا جائز ہے لیکن اگر واپس آنے کا ارادہ ہو یا اعلان کردے کہ ہم واپس اٹھائیں گے تو اس کو اٹھا کر لانا اور استعمال کرنا جائز نہیں۔

الفی شیئاً وقال من اخذه فهو له فلمن سمعه أو بلغه ذلك القول له أن یأخذه، والا لم یملکه لانه اخذه اعانة لمالکه لیرده.

(ردالمحتار: ٤/٢٨٥، کتاب اللقطة)

احکام المفقود

یعنی جو شخص اپنے گھر سے اس طرح غائب ہوگیا کہ اب نہ اس کی رہائش کا علم، نہ ہی حیات وموت کا علم ہے اس کے مال کا کیا حکم ہوگا اس میں تصرف کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کی بیوی کا کیا حکم ہے؟ دونوں احکام کو تفصیل سے ذکر کریں اس میں۔

مفقود کی وراثت کا حکم:

جب مفقود کی عمر نوے برس ہوجائے تو اپنے مال میں مردہ سمجھا جائے گا اور اس کا مال اس

وقت موجود وارثوں پر تقسیم ہوگا، نوے برس کی عمر ہونے سے پہلے اپنے مال میں زندہ ہے لہذا اس زمانہ میں کوئی شخص اس کے مال میں دخیل کار نہیں ہو سکتا اور غیر کے مال میں جب سے مفقود ہوا اس وقت سے مردہ متصور ہوگا یعنی اگر کوئی شخص اس کے مفقود ہونے کے بعد مر گیا تو یہ مفقود اس کا وارث نہ ہوگا اگر چہ مفقود کی عمر ابھی تک نوے برس نہ ہوئی ہو مگر چوں کہ غیر کے مال میں بھی مردہ ہونے کا حکم نوے برس کی عمر کے بعد ہی ظاہر ہوتا ہے، اس سے پہلے اس کے واپس آکر وارث بن جانے کا احتمال ہے اس لئے اس میت کے مال سے مفقود کا حصہ امانت رکھا جائے گا، اگر واپس آ گیا تو اس کو مل جائے گا ورنہ نوے برس عمر ہو جانے کے بعد جس میت کے مال سے امانت رکھا تھا اسی کے وارثوں پر لوٹا دیا جائے گا، جو میت کے انتقال کے وقت زندہ تھے موجودہ وارثوں کا اعتبار نہیں اور نہ ہی مفقود کے وارثوں کا اس میں کوئی حق ہے۔

قال العلامة التمر تاشي رحمه الله تعالىٰ: هو (اى المفقود) غائب لم يدر احي هو فيتوقع ام ميت اودع اللحد البلقع وهو فى حق نفسه حي فلا ينكح عرسه غيره ولا يقسم ماله (الى قوله) وميت فى حق غيره فلا يرث من غيره ولا يستحق ما اوصى له اذا مات الموصي بل يوقف قسطه الى موت اقرانه فى بلده على المذهب فان ظهر قبله حيا فله ذلك وبعده يحكم بموته فى حق ماله يوم علم ذلك فتعتد عرسه للموت ويقسم ماله بين من يرثه الآن وفى مال غيره من حين فقد فيرد الموقوف له الى من يرث مورثه عند موته:

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: (قوله وهو فى حق نفسه حي) مقابله قوله الآتي وميت فى حق غيره وحاصله انه يعتبر حيًّا فى حق الاحكام التى تضره وهى المتوقفة على ثبوت موته ويعتبر ميّتاً فيما ينفعه ويضر غيره وهو ما يتوقف على حياته لان الاصل انه حى وانه الى الآن كذلك استصحاباً بالحال السابق والاستصحاب حجة ضعيفة تصلح للدفع لا للاثبات اى تصلح لدفع ماليس بثابت لا لاثباته. (رد المحتار: ۳/۳۲۸)

وقال ایضاً : (قوله علی المذهب) وقیل بقدر بتسعین سنة بتقدیم التاء من حین ولادته واختاره فی الکنز وهو الارفق هدایة وعلیه الفتویٰ .

(ردالمحتار : ۳/۳۳۱ ، ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ۹/۴۰۸)

زوجۂ مفقود کا حکم:

سوال : شریعت مطہرہ کا حکم اس بارہ میں کیا ہے؟ کہ ایک شخص مدت سے غائب اور لاپتہ ہے اس کی موت یا زندگی کی کوئی خبر نہیں، ایسی حالت میں اس کی بیوی کے لئے دوسری جگہ نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب : مفقود کی بیوی کے لئے بہتر ہے کہ شوہر کی عمر نوے برس ہونے تک صبر کرے، اگر صبر نہ کرسکے تو ایسی مجبوری میں مذہب مالکی کے مطابق یہ عورت کسی حاکم مسلم کے ہاں دعویٰ پیش کرے اور گواہوں سے مفقود کے ساتھ تا حال قیام نکاح حاکم کے پاس ثابت کرے، نکاح کے اصل شاہد ضروری نہیں بلکہ شہادت بالتسامع کافی ہے، یعنی نکاح کی عام شہرت سن کر نکاح پر شہادت دی جاسکتی ہے، اس کے بعد شوہر کے مفقود ہونے کی شہادت شرعیہ پیش کرے، پھر حاکم اس شخص کی بقدر ممکن تلاش کرے جہاں اس کے جانے کا ظنِ غالب ہو وہاں آدمی بھیجے، اور جہاں صرف احتمال ہو خط وغیرہ سے تحقیق کرے اخبار میں اشتہار دینا مفید معلوم ہو تو یہ بھی کرلے، بہر کیف ہر ممکن صورت سے اس کی تلاش میں پوری کوشش کرے، حاکم کے پاس دعویٰ پیش ہونے سے قبل عورت کی طرف سے یا کسی دوسرے شخص کی طرف سے تلاش کی کوشش کافی نہیں، بلکہ دعویٰ پیش ہونے کے بعد ضروری ہے کہ حاکم خود پوری کوشش کرے، دوسروں کے کہنے پر ہرگز اعتبار نہ کرے، جب حاکم شوہر کے ملنے سے بالکل ناامید ہو جائے تو عورت کو چار سال کی مہلت دے، اگر ان چار سالوں میں بھی اس کی کوئی خبر نہ آئی تو عورت حاکم کے پاس دوبارہ درخواست پیش کر کے نکاح فسخ کروالے، اور شوہر کو مردہ تصور کر کے عدت موت چار ماہ دس دن گذار کر دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے، اگر کہیں حاکم مسلم موجود نہ ہو یا وہ شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرتا ہو تو جماعۃ المسلمین بطریق مذکورہ فسخ نکاح کا فیصلہ کرسکتی ہے، مگر اس کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ہیں:

(1) جماعت کے ارکان کم از کم تین ہوں۔

(2) سب ارکان عادل یعنی پکے دیندار ہوں۔

(3) سب ارکان یا کم از کم ایک رکن ایسا عالم ہو جو شہادت وقضاء کے احکام شریعت میں ماہر ہو۔

(4) فسخِ نکاح کا فیصلہ سب ارکان اتفاق رائے سے کریں۔

(5) شوہر کی تلاش کے وقت مصارف عورت خود برداشت کرے، اگر وہ عاجز ہو تو حکومت برداشت کرے۔

اگر دوسری جگہ نکاح کرنے کے بعد پہلا شوہر واپس آ گیا تو اس کے احکام یہ ہیں:

(1) یہ عورت اسی پہلے شوہر کو ملے گی، جدید نکاح کی بھی ضرورت نہیں، پہلا نکاح ہی کافی ہے۔

(2) اگر دوسرے شوہر نے خلوتِ صحیحہ کی ہو تو کل مہر دے گا، اور عورت پر عدتِ طلاق واجب ہوگی، اگر خلوۃ صحیحہ نہ ہوئی تو نہ مہر واجب ہوگا نہ عدت۔

(3) عدت پہلے شوہر کے پاس گذارے گی، مگر عدت گذارنے تک پہلے شوہر سے جماع کرنا جائز نہیں۔

(4) اگر دوسرے شوہر سے حالتِ نکاح میں یا فسخِ نکاح کے بعد عدت گذرنے سے قبل اولاد پیدا ہو گئی تو یہ دوسرے شوہر کی ہوگی۔

وهذا خلص ما هو مشروح فى الحيلة الناجزة للحيلة العاجزة .

تنبیہ:

حیلۂ ناجزہ میں جہاں نکاح پر شہادت کا ذکر ہے اس سے صرف انعقاد نکاح مراد نہیں بلکہ قیام نکاح پر شہادت ضروری ہے۔

لمافى الرواية الاولىٰ من العلامة سعيد بن صديق الفلاتى، مانصبه بعد ان يثبت الزوجية وغيبة الزوج والبقاء فى العصمة الى الآن اهـ وفى الالحاق من العلامة الفاهاشم فان الزوجة تثبت بشاهدين ان فلاناً زوجها وغائب عنها اهـ وفى الرواية الثانية والعشرين من العلامة الفلاتى كلفها اثبات الزوجية اهـ . فقط واللّٰه تعالىٰ اعلم

فائدہ:

ہم دستخط کنندگان ذیل کے نزدیک مناسب یہ ہے کہ حیلۂ ناجزہ (صــــ ٦١) میں بعنوان ''فائدہ'' جو الفاظ لکھے گئے ہیں ان کو مندرجہ ذیل الفاظ میں تبدیل کر دیا جائے۔ زوجۂ مفقود کے لئے قاضی کی عدالت میں فسخ نکاح کی درخواست کے بعد جو مزید چار سال کے انتظار کا حکم دیا گیا ہے یہ اس صورت میں ہے کہ عورت کے لئے نفقہ اور گذارہ کا بھی کچھ انتظام ہو اور عصمت وعفت کے ساتھ یہ مدت گذارنے پر قدرت بھی ہو، اور اگر اس کے نفقہ اور گذارہ کا کوئی انتظام نہ ہو نہ شوہر کے مال سے کسی عزیز وقریب یا حکومت کے تکفل سے اور خود بھی محنت ومزدوری پردہ اور عفت کے ساتھ کر کے اپنا گذارہ نہیں کر سکتی، تو جب تک صبر کر سکے شوہر کا انتظار کرے جسکی مدت ایک ماہ سے کم نہ ہو اس کے بعد [1] قاضی یا کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں فسخ نکاح کا دعویٰ دائر کرے۔

اور اگر نفقہ اور گذارہ کا تو انتظام ہے مگر بغیر شوہر کے رہنے میں اپنی عفت وعصمت کا اندیشہ قوی ہے تو سال بھر صبر کرنے کے بعد [2] قاضی کی طرف مرافعہ کرے اور دونوں صورتوں میں گواہوں کے ذریعہ یہ ثابت کرے کہ [3] اس کا شوہر فلاں اتنی مدت سے غائب ہے اور اس [4] نے اس کے لئے کوئی نان نفقہ نہیں چھوڑا، اور نہ کسی کو نفقہ کا ضامن بنایا اور اس نے اپنا نفقہ اس کو معاف بھی نہیں کیا، اور اس پر عورت حلف بھی کرے اور دوسری صورت یعنی عفت کے خطرہ کی حالت میں قسم کھائے کہ میں بغیر شوہر کے اپنی عفت قائم نہیں رکھ سکتی، قاضی کے پاس جب یہ ثبوت مکمل ہو جائے تو قاضی اس کو کہہ دے کہ میں نے تمہارا نکاح فسخ کر دیا، یا شوہر کی طرف سے طلاق دیدی یا خود عورت کو اختیار دیدے کہ وہ اپنے نفس پر طلاق واقع کرے اور جب عورت طلاق اپنے پر واقع کرے تو قاضی اس طلاق [5] کو نافذ کر دے۔

(٢،١) دیکھیے علامہ اتفاہاشم کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ عدم نفقہ کی صورت میں ایک ماہ اور خشیت زنا کی صورت میں ایک سال کا انتظار حاکم کے فیصلہ سے پہلے کافی ہے، خواہ مرافعہ سے پہلے اتنی مدت گذری ہو یا نہیں، مگر مذہب مالکی کو اختیار کرنے کے لئے جس ضرورت کا تحقق شرط ہے اس کو متیقن کرنے کے لئے ہم پہلے بہ چکے ہیں کہ اس مدت میں کچھ اضافہ کر دینا قرین احتیاط ہے چنانچہ یہاں ایک ماہ یا ایک سال کی مدت قبل المرافعہ مقرر کی گئی ہے تاکہ مقدمہ کی کارروائی کی مدت اس کے علاوہ ہو، البتہ اگر حاکم کے فیصلہ تک بھی اتنی مدت گذر گئی تو فتویٰ جواز کا دیا جائیگا۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ	رشید احمد	محمد عاشق الٰہی عفا اللہ عنہ
خادم دار العلوم کراچی نمبر ١٤	محمد رفیع عثمانی	محمد تقی عثمانی

(٣) یعنی اس کا شوہر ہونا بھی ثابت کرے اور غائب ہونا بھی۔ (٤) یعنی صورت اولیٰ میں۔

(٥) یہ طلاق رجعی ہوگی، اگر عدت کے اندر یا اس کے بعد مفقود آ جائے تو اس کے احکام وہی ہوں گے جو غائب غیر مفقود کے ہیں۔ رشید احمد

(کمافی فتوی العلامة الفاهاسم من الالحاق حيلة ناجره : ص ١١٠)

شوہر بحری سفر میں گم ہوگیا:

سوال : ایک شخص بحری سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ لانچ پر سوار ہو کر حج سے واپس آرہا تھارات کو لانچ کے ایک طرف تختہ پر جو تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑا تھا اس پر سویا ہوا تھا، ساتھیوں نے اور ناخدا نے بھی منع کیا مگر باز نہ آیا، صبح اٹھے تو یہ شخص مفقود تھا، اب اس کے مال اور بیوی کا شرعاً کیا حکم ہے؟ بینواتوجروا

جواب: قرائن سے اس کی موت متیقن ہے، لہٰذا اس کا ترکہ تقسیم کر دیا جائے، اور اس کی بیوی عدتِ موت گذار کر دوسرا نکاح کرسکتی ہے، قرائن مفیدۂ یقین بحکم شہادت ہیں۔

کما فی کتاب الدعوی من شرح التنوير ونصه والسابع قرينة قاطعة كان ظهر من دار خالية انسان خائف بسكين متلوث بدم فدخلوها فورًا فرأ ومذبوحاً لحينه اخذ به اذ لا يمترى احد انه قاتله (ردالمحتار : ٥٨٧/٤) وفي الشامية في اول كتاب القضاء في بيان طريق القاضي الى الحكم، اوالقرائن الوضعة التى تصير الامر فى حين المقطوع به فقد قالوا لو ظهر انسان من دار بيده سكين وهو متلوث بالدم سريع الحركة عليه اثر الخوف فد خلوا الدار على الفور فوجدوا فيها انساناً مذبوحاً بذلك الوقت ولم يوجدا حدغير ذلك الخارج فانه يؤخذبه وهو ظاهر اى لا يمترى فى انه قاتله والقول بانه ذبحه اخر ثم تسور الحائط او انه ذبح نفسه احتمال بعيد لا يلتفت اليه اذ لم ينشأ عن دليل . (رد المحتار : ٤٣١/٤)

شامیہ کتاب المفقود میں جو مذکور ہے کہ ''سفر بحر میں گم ہونے والے کا مدت طویلہ تک انتظار کر کے حاکم اس کی موت کا حکم کرے'' اس سے وہ شخص مراد ہے جس کے ساحل پر پہنچنے کا علم نہ ہو، صورتِ سوال میں تو وسط بحر ہی میں فقدان کا علم ہوگیا ہے جو موجب یقین ہے اور احتمال بعید ناشی بلا دلیل کا اعتبار نہیں۔

کما صرح به شارح التنوير وابن عابدين رحمهما الله تعالىٰ فيما

ذ کرنا من نصهما .

ایسا بعید احتمال تو بالمشافہ میت کے دیکھنے کے بعد بھی موجود ہوتا ہے کہ شاید موت نہ ہو بلکہ سکتہ ہو، لہٰذا اس صورت میں نہ مدت طویلہ تک انتظار کی ضرورت ہے اور نہ حکمِ حاکم کی۔

(ماخوذ از احسن الفتاوی : جـ ٥)

وقال على رضى الله عنه لا يحق للزوجة فسخ الزواج وتنتظر حتى تعلم احى ام ميت . (اخرجه عبد الرزاق فى المصنف)

وهذا مذهب الجمهور فى المفقود الذى لا يغلب هلاكه كالذى يخرج للحج، او لطلب العلم ، او التجارة .

وقال عمر رضى الله عنه : ايما امرأة فقدت زوجها، فلم تدر اين هو؟ فانها تنتظر اربع سنين ، ثم تعتد اربعة اشهر وعشرًا ، ثم تحل، اى تتزوج . (رواه عنه البخارى والشافعى)

وهذا مذهب مالك والشافعى فى المفقود الذى يغلب هلاكه، كفقيد البحر ، والمعركة، فانه فى الغالب يكون قد استشهد ، ان لم يرجع الى اهله فى اربع سنين . (فقه المعاملات)

عہدۂ قضاء کے احکام

عہدۂ قضاء کا مقصد ہے ملکی باشندوں کو انصاف فراہم کرنا، ہر ظالم کو انصاف کے کٹہرے میں لا کھڑا کرنا، اور مظلوم کی دادرسی کرنا، یہ انسان کی اجتماعی زندگی کا حصہ لازمی ہونے کے علاوہ عظیم عبادت بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو بعثت انبیاء کے مقاصد میں داخل فرمایا۔

كما يقول الله جل ثناؤه : ﴿ لقد ارسلنا رسلنا بالبينٰت وانزلنا معهم الكتاب والميزان ليقوم الناس بالقسط ﴾

(سورة الحديد : ٢٤٠)

ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

انصاف فراہم کرنا اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا اہم ترین عبادت ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ سرورکائنات ﷺ نے جن سات خوش نصیبوں کو قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ ملنے کی بشارت دی ان میں ایک امام عادل بھی ہے۔

کما قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم : "سبعة يظلهم الله تحت ظل عرشه يوم لا ظل الا ظله، امام عادل" (الحديث اخرجه البخاری ومسلم ، وانظر نص الحديث بكامله . (مسلم : ۷۱۵/۱)

وقال تعالىٰ لخاتم الانبياء والمرسلين ﴿ فاحكم بينهم بما انزل الله ولا تتبع اهواء هم عما جاء ك من الحق ﴾ (سورة المائدة : ٤٨)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: یہ کہ تو ان کے باہمی معاملات میں اسی بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ کرا اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر ان کی خواہشوں پر عمل درآمد نہ کیجئے۔

اسلام میں پہلا قاضی:

دین اسلام میں قضاء کا فریضہ سب سے پہلے سرورکائنات ﷺ نے انجام دیا، صحابہ کرامؓ اپنے معاملات کا فیصلہ کروانے کے لئے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے آپ ﷺ ان میں انصاف قائم فرماتے تھے، مظلوم کی دادرسی فرماتے، ظالم کو ظلم سے روکتے تھے، حتیٰ کہ یہود مدینہ بھی اپنے مقدمات کا فیصلہ آپ ﷺ سے کرواتے تھے، امت کو عدالت اسلامی سے آگاہ کر کے انصاف کرنا یہ بھی آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذمہ داری تھی۔

لقوله تعالىٰ : ﴿ انا انزلنا اليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما اراك الله ولا تكن للخائنين خصيما ﴾ (سورة النساء : ١٠٥)

بے شک ہم نے آپ کے پاس کتاب بھیجی ہے واقع کے موافق تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلا دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ فیصلہ فرمانے سے پہلے فریقین کو وعظ فرماتے غلط دعویٰ کر کے مال جیتنے اور اس کے استعمال حرام ہونے کے بارے میں ڈراتے تھے۔

كقوله عليه السلام : "انما انا بشر وانكم تختصمون الی ولعل بعضكم أن يكون الحن، ای ابلغ بحجته فاقضی له علی نحوما اسمع

فمن قضيت له من حق أخيه شيئاً فلا يأخذه فانما هي قطعة من النار اقتطعهاله". (اخرجه البخاري: ٦٨/٢، ومسلم رقم: ١٧١٣)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں تم اپنے مقدمات فیصلے کے لئے میرے پاس لاتے ہو، ہوسکتا ہے تم میں سے بعض زور بیان کا مالک ہو، اس کی بنیاد پر فریق مخالف پر غالب آئے اور میں دلائل کی بنیاد پر فیصلہ سنا دوں، تو یاد رکھو اگر میں نے (غلط دلائل سن کر) دوسرے کے مال کا تمہارے حق میں فیصلہ سنا دیا، تو ہرگز ناحق مال قبول نہ کر کیوں کہ وہ مال نہیں بلکہ درحقیقت آگ کا ٹکڑا ہے، جس کا تمہارے حق میں فیصلہ ہوا۔ (بخاری)

خلاصہ یہ کہ آپ ﷺ کی موجودگی میں فیصلہ آپ ﷺ فرماتے تھے، ہاں البتہ مدینۃ الرسول ﷺ سے دور دراز علاقوں کے لئے آپ ﷺ نے دوسرے صحابہ کو بھی ذمہ دار بنا کر بھیجا ہے، مکہ مکرمہ میں "عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو قاضی مقرر فرمایا، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن میں مقرر فرمایا، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانگی کے وقت ان شاندار الفاظ میں وصیت فرمائی۔

"يا علي اذا جلس اليك الخصمان، فلا تقض بينهما حتى تسمع الاخر، كما سمعت من الاول، فانك اذا فعلت ذلك، تبين لك القضاء اى ظهر لك وجه الحق في الحكم فتحكمت بالعدل."

(اخرجه الترمذي رقم: ١٣٣١، ابو داؤد في الاقضية رقم: ٣٥٨٢)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کا طریقہ سکھاتے ہوئے فرمایا کہ "اے علی جب تمہارے سامنے دو فریق مقدمہ لیکر حاضر ہوں، تو جب تک دونوں کی پوری بات سن نہ لو اس وقت تک کوئی فیصلہ مت کرو، کیوں کہ پوری بات سننے کے بعد انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا آسان ہوگا۔

(ترمذی، ابو داؤد)

عہدۂ قضاء قبول کرنے کا حکم:

قاضی اور جج بننے کا مقصد رشوت لیکر ناحق فیصلہ کرنا اور دنیا جمع کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد، ظلم کو دفع کرنا اہل حقوق کو حقوق پہنچانا ہے۔

امام مسلمین پر لازم ہے کہ ہر شہر میں ایک قاضی مقرر کرے اب پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا عہدۂ قضاء قبول کرنا چاہئے یا نہیں؟ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے اگر کوئی ذمہ دار شخص

اس عہدہ کو قبول کرے اور انصاف فراہم کرنے کا فریضہ انجام دے تو سب کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔

اگر کوئی بھی اس عہد کو قبول نہ کرے تو سب گناہ گار ہوں گے اگر کسی شہر میں اس منصب کے قابل ایک ہی شخص موجود ہو اور کوئی ہو ہی نہیں تو شرعاً اس کے ذمہ لازم ہے کہ اس عہدہ کو قبول کرے اور انصاف قائم کرے۔

قاضی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت:

جب قاضی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو اللہ تعالی اس سے راضی ہوتا ہے اور اللہ تعالی کی مدد ونصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے، جب قاضی ظلم کرنے لگتا ہے اور خلاف شرع فیصلہ کرتا ہے، شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔

كما جاء في الحديث انه عليه السلام قال : " ان الله مع القاضي مالم يجر اى يظلم فاذا جار تخلى الله عنه ولزمه الشيطان ."

(ترمذی : ۱۳۳۰ ، کتاب الاحکام وقال حدیث حسن)

عہدۂ قضاء کا طالب ہونا خطرناک ہے:

جو شخص شرعی احکام سے ناواقف ہو اور حق وباطل کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، صرف منصب اور دنیا کمانے کی لالچ میں قضاء کے عہدہ پر فائز ہوتا ہے اور پھر خلاف شرع فیصلہ کرتا ہے رشوت لے کر ظالم کی حمایت کرتا ہے، ایسے شخص کے لئے بہت بڑی تباہی ہے، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

" من ولى القضاء فقد ذبح بغير سكين ."

یعنی جس نے قضاء کا منصب قبول کیا گویا کہ اس کو بغیر چھری کے ذبح کیا گیا۔

(ابو داؤد ، ترمذی : ۱۳۲۵)

قاضی کی تین قسمیں:

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : " القضاة ثلاثة واحدة في الجنة واثنان في النار، فاما الذى فى الجنة فرجل عرف الحق فقضى به، ورجل عرف الحق فجار فى الحكم ، فهو فى النار، ورجل قضى

للناس علی جهل فهو فی النار ."

(اخرجه ابو داؤد رقم : ۳۵۷۳ ، والترمذی رقم : ۱۳۲۳ ، والحاکم وصححه)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قاضی کی تین قسمیں ہیں ایک جنت میں جائے گا اور دوسرا جہنم میں:

(۱) جنت میں جانے والا قاضی وہ ہے جو حق کو سمجھ کر انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے۔

(۲) وہ قاضی جو حق کو جاننے کے باجود ظلم کرے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔

(۳) جو قاضی حق و باطل کے درمیان تمیز کی اہلیت نہ رکھتا ہو اس لئے غلط فیصلہ کرتا ہے وہ بھی جہنمی ہے۔

عہدۂ قضاء باعث حسرت ہے:

قاضی اگر انصاف فراہم نہ کر سکے یا اپنے بارے میں خطرہ ہو کہ اس منصب کو قبول کرنے کے بعد جادۂ حق پر قائم نہیں رہ سکوں گا اس پر لازم ہے کہ اس عہدہ کو قبول کرنے سے اجتناب کرے۔

کما جاء فی الحدیث : عن ابی ذرر ضی اللّٰہ عنه انه قال ، قلت یا رسول اللّٰہ الاتستعملنی ؟ فقال یا اباذر ، انك ضعیف وانها امانة، وانها یوم القیامة خزی وندامة الامن اخذ بحقها وادی الذی علیه فیها. (اخرجه مسلم رقم : ۱۸۲۵)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) کیا آپ مجھے قضاء کا عہدہ عطاء نہیں فرماتے؟ تو ارشاد فرمایا کہ اے ابوذر! تم اس ذمہ داری کو اٹھانے کے متحمل نہیں ہو، کیوں کہ یہ ایک امانت ہے اور یہ قیامت کے دن ندامت اور شرمندگی کا باعث ہے، ہاں البتہ کوئی شخص اہلیت کا حامل ہو وہ اس عہدہ کو قبول کرے اور پھر اسکا حق اداء کرے تو اور بات ہے۔ (مسلم)

" وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم : من ابتغی القضاء وسأل فیه شفعاء ، ای وسط من یومله الی القضاء وکل الی نفسه ، ومن اکره علیه انزل اللّٰہ علیه ملکا یسدده . "

(أخرجه الترمذي في كتاب الاحكام رقم : ١٣٢٤، وقال هذا حديث حسن غريب)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص عہدۂ قضاء کا طلب گار ہو اور اس عہدہ کو حاصل کرنے کے لئے سفارش کار کے ذریعہ کوشش کرے اور اس عہدہ پر فائز ہو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوتی بلکہ اسکو ویسے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے ہاں البتہ جس کے اندر اہلیت ہو اور اس کی طلب کے بغیر اس کو یہ منصب دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی تائید اور مدد کے لئے ایک فرشتہ مقرر فرماتے ہیں جو اس کی مدد کرتا ہے۔

عہدۂ قضاء سے انکار کا ایک واقعہ:

بڑے بڑے علماء اور فقہاء قضاء کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کرتے تھے اس خوف سے کہ کہیں فیصلہ کرنے میں کسی فریق پر ظلم نہ ہو جائے، نیز ایسا نہ ہو کہ سلاطین وقت کے دباؤ میں آ کر کہیں خلاف شرع فیصلہ کرنا پڑ جائے، چنانچہ کتابوں میں مذکور ہے کہ حیوۃ بن شریح کو مصر کے قضاء کا عہدہ پیش کیا گیا، تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، تو والی مصر نے ان کو قتل کی دھمکی دی کہ اگر یہ عہدہ قبول نہ تو قتل کر دیا جائے گا، جب شریح نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنی جیب سے ایک چابی نکالی اور امیر کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ یہ میرے گھر کی چابی ہے یہ لے لیں کیوں کہ اب میں اپنے رب سے ملنے کا خواہش مند ہوں، چنانچہ جب امیر نے حضرت شریح رحمہ اللہ کے اس عزم کو دیکھا تو انہیں چھوڑ دیا۔ (فقه السنة : ٣/ ٤٠٠)

اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ جس شخص کو فیصلہ کے وقت ظلم صادر ہونے کا خوف ہو اس کے حق میں عہدۂ قضاء قبول کرنا مکروہ ہے۔

قاضی بننے کی شرائط:

قاضی کے اندر بنیادی طور پر ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

١...... اسلام

٢...... عقل

٣...... بلوغ

٤...... احکام شرع سے واقف ہونا

٥...... اعضاء و جوارح، صحیح سالم ہوں اور متوازن مزاج کا مالک ہو۔

قاضی کو اعمال صالحہ کا پابند ہونا چاہئے نیز صلاح وتقویٰ کی صفت سے متصف ہونا بھی قاضی کی شان کے زیادہ لائق ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ فاسق کو عہدۂ قضاء پر فائز نہیں کرنا چاہئے، تاہم اگر کسی فاسق مسلمان کو قاضی بنادیا گیا اور اس نے قرآن وسنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے فیصلہ کیا تو وہ فیصلہ نافذ ہوگا اگر شرع کے خلاف فیصلہ صادر کرے تو وہ نافذ نہ ہوگا۔

قال في ملتقى الابحر: ولا ينبغي أن يكون القاضي فظاً غليظاً جباراً عنيداً، وينبغي أن يكون موثوقا به، في دينه وعفافه، وعقله وصلاحه، وفهمه وعلمه بالسنة والآثار، ووجوه الفقه، كذا المغني. (ملتقى الابحر: ۲/۶۹)

۶ قاضی کے حکم نافذ ہونے کے لئے یہ خوبی ضروری ہے، کہ وہ حاکم وقت کا مقرر کردہ ہوتا کہ حاکم کی قوت سے قاضی کا فیصلہ نافذ ہو اور فریقین قاضی کا فیصلہ نہ مانیں تو حاکم زبردستی منوائے۔

حکم (ثالث) کے فیصلہ کی حیثیت:

جو شخص حکومت کی طرف سے قاضی مقرر نہ ہو بلکہ فریقین آپس کی رضا مندی سے اس کو مقرر کریں تو شرعاً ایسے شخص کو "حکم" کہا جاتا ہے، اب جبکہ دونوں نے آپس کی رضا مندی سے حَکم مقرر کر دیا اور فیصلہ صادر ہونے تک ان کے فیصلہ پر راضی ہو تو اس فیصلہ کو ماننا ضروری ہے، اگرچہ اس کی حیثیت صلح کی ہے۔ اسی طرح مفتی جو فتویٰ صادر کرتا ہے اس کی حیثیت بھی قاضی کے فیصلہ کی طرح نہیں، کیوں کہ وہ شریعت کا حکم بیان کرتا ہے فیصلہ نہیں کرتا۔

ظالم حاکم کی طرف سے عہدۂ قضاء قبول کرنے کا حکم:

ظالم حاکم کی طرف سے قضاء کا عہدہ قبول کرنا جائز ہے، ہاں البتہ خلاف شرع فیصلہ کرنا، کسی پر ظلم کرنا، ناحق کسی کا مال وصول کرنا، جائز نہیں بعض تابعین نے حجاج بن یوسف ثقفی کی طرف سے قضاء کا عہدہ قبول کیا تھا، حالانکہ اس کا ظالم ہونا مسلّم ہے۔

کافر حاکم کی طرف سے عہدۂ قضاء قبول کرنے کا حکم:

جب مسلمانوں کے کسی علاقہ پر کفار کا غلبہ ہو جائے مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنا فیصلہ کسی مسلمان قاضی سے کروانے کے لئے ایک مسلمان قاضی کا مطالبہ کریں، جب مسلمانوں کے مطالبہ

پر یا حاکم کافر اپنی مرضی سے کسی مسلمان کو قاضی مقرر کردے، تو مسلمان قاضی کے لئے کافر حاکم کی طرف سے عہدہ قضاء قبول کرنا جائز ہے، عہدۂ قضاء قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ قرآن وحدیث کے مطابق کرے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : ذكر في اول جامع الفصولين كل مصر فيه والى مسلم من جهة الكفار يجوز منه اقامة الجمع والاعياد واخذ الخراج وتقليد القضاء تزويج الايامى لاستيلاء المسلم عليهم واما اطاعة الكفرة فهى موادعة ومخادعة واما فى بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين اقامة الجمع والاعياد ويصير القاضى قاضيا بتراضى المسلمين ويجب عليهم طلب والى مسلم اهـ وقد منا نحوه فى باب الجمعة عن البزازية .

(رد المحتار : ٤/١٧٥ ، قبيل باب العشر والخراج)

حاکم اور قاضی کے لئے آداب:

قاضی اور حاکم کو چاہئے کہ مندرجہ ذیل باتوں کی پابندی کرے۔

(۱) حسن خلق کو اپنائے، نیز وقار بھی ہو کہ کسی کام میں ایسی جلد بازی نہ کرے جو اس کے ہلکے پن غصہ سے مغلوب ہونے پر دلالت کرے، فریقین میں سے کسی کے ساتھ ہنسی مذاق نہ کرے، نہ کوئی ایسی بات کرے جو کم درجہ کے لوگوں کی ہوتی ہے، نیز فریقین میں سے کسی کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے۔

(۲) عمدہ لباس اختیار کرے جو اہل فضل علماء کا لباس ہے۔

(۳) دونوں فریق کو ایک نظر سے دیکھے، دونوں کو ایک طرح کی نشست پر بٹھائے، کسی ایک طرف زیادہ نہ جھکے۔

(۴) جب تک فریقین کی بات سن نہ لے فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرے۔

(۵) کسی ایک فریق کو دلیل کی تلقین نہ کرے، نہ ہی گواہی کا طریقہ سکھائے۔

(۶) عزیز واقارب کے علاوہ کسی ایسے شخص سے ہدیہ قبول نہ کرے کہ بعد میں مقدمہ فیصلہ کرکے فقط ہدیہ کی وجہ سے ان کی رعایت کرنی پڑے، خصوصاً مقدمہ کے دونوں فریق میں سے

کسی ایک سے ہدیہ قبول کرنا یہ رشوت کے حکم میں ہے، اس سے اجتناب لازم ہے۔

(هدايه : ۳/۱۱٤)

(۷) عمومی دعوت کے علاوہ کسی شخص کی خاص دعوت قبول نہ کرے جو محض قاضی صاحب کی خاطر کر رہا ہو۔

(۸) جنازہ میں حاضر ہوا کرے، بیماروں کی عیادت کرے، کیوں کہ یہ حقوق المسلمین میں داخل ہے۔

" قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : حق المسلم على المسلم ست، قيل ما هن يا رسول الله، قال اذا لقيته فسلم عليه و اذا دعاك فاجبه، و اذا استنصحك اى طلب النصيحة فانصح له و اذا عطس فحمد الله فشمته ، و اذا مرض فعده ، و اذا مات فاتبعه " .

(اخرجه مسلم فی کتاب السلام رقم : ۲۱٦۲)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں آپ ﷺ عرض کیا گیا یا رسول اللہ (ﷺ) وہ حقوق کیا ہیں، تو فرمایا:

(۱) جب کسی مسلمان سے ملاقات ہو تو اس کو سلام کیا جائے۔

(۲) وہ دعوت کرے تو اس کو قبول کرے۔

(۳) اگر وہ نصیحت طلب کرے تو اس کو نصیحت کرے۔

(٤) چھینکنے کے بعد الحمد للہ کہے، تو سننے والا یرحمک اللہ کہے۔

(٥) جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کو جائے۔

(٦) جب انتقال کر جائے تو جنازہ میں حاضر ہو اور قبرستان تک ساتھ چلے۔

(مسلم)

(۹) قاضی کو چاہئے کہ فیصلہ کے وقت شریعت کی مکمل پابندی کرے۔

(۱۰) فیصلہ کے وقت ہر اس بات سے دور رہے، جو اس کے دل کو مشغول کرے فکر کو مشوش کرے، لہذا غصہ کے وقت یا خوف کے وقت یا بھوک کی حالت میں یا پیشاب پاخانہ کے تقاضے کے وقت فیصلہ نہ کرے۔

کما روی فی الحدیث : لا یقضین حاکم بین اثنین وھو غضبان. (اخرجه البخاری فی الاحکام رقم : ۲۵۷۱)

قال ابن دقیق العید : وقد قال الفقهاء علی الغضب کل ما یحصل به تغیر الفکر کالجوع، والعطش المفرطین وغلبة النعاس، وسائر ما یتعلق به القلب، تعلقا یشغله عن استیفاء النظر ، وھو قیاس فطنة . (نقلاً عن ملتقی الابحر : ۲/ ۷۱)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک اہم خط:

ولعلنا ندرك أهمية القضاء ومكانة القضاء فی الاسلام، والمنهج الذی ینبغی أن یسلکه الحاکم فی حکمه، من تلك الرسالة العظیمة، التی أرسلها الفاروق "عمر"رضی اللّٰه عنه الی "أبی موسیٰ الأشعری" وفیها النموذج الأكمل والدستور المحكم، الذی ینبغی أن یسیر علیه القضاة فی جمیع العصور والأزمان، فقد جاء فی تلك الرسالة ما نصُّه:

" بسم اللّٰه الرحمن الرحیم ، من عبد اللّٰه عمر بن الخطاب أمیر المؤمنین الی " عبداللّٰه بن قیس " اسم " أبی موسی الأشعری " سلام اللّٰه علیك .

أما بعد : فان القضاء فریضة محكمة ، وسنَّةٌ متَّبعة، فافهم اذا أُدلی الیك، فانه لا ینفع كلام بحق لا نفاذَله، آسِ،أی وَاسِ بین الناس فی وجهك وعدلك ومجلسك، حتی لا یطمع شریف فی حَیْفِكَ، أی میلك معه لشرفه ، ولا ییأس ضعیف من عدلك .

البینة علی من ادَّعی، والیمین علی من أنكر، والصلحُ جائز بین المسلمین ، الا صلحا احل حراماً، أو حرَّم حلالاً! .

لا یمنعنَّك قضاءٌ قضیتَ به الیومَ فراجعتَ فیه عقلك، وهُدیت فیه لرشدك ، أن ترجع الی الحقِ، فان الحقَّ قدیمٌ، ومراجعةُ الحقِ خیرٌ

من التمادی فی الباطل .

الفهمَ الفهمَ فیما تردَّد فی صدرك ، مما لیس فی کتاب ولا سُنَّة، ثم اعرفِ الأشباهَ والنظائر، وقسِ الأمور عند ذلك، واعمد الی أقربها الی اللّٰه وأشبهها بالحقِ، المسلمون عدولٌ بعضُهم علی بعض، الَّا محدودًا فی حدٍّ أو مجرَّباً علیه شهادة زور، أو متَّهماً فی ولاءٍ أو نسب، فان اللّٰه تولَّی منکم السرائر ، ودرأ أی دفع ، بالبیّنات والأیمان الحدودَا!

وایَّاك والقَلَق والضَّجَر، والتأذِّی بالخصوم، والتنکُّر عند الخصومات، فانَّ الحقَّ فی مواطن الحقِ، یُعْظِمُ اللّٰه به الأجر، ویُحسِنُ به الذُّخر، فمن صحَّتْ نیَّته، وأقبل علی نفسه، کفاه اللّٰه مابینه وبین الناس ، ومن تخلَّق، أی أظهر، للناس بما یعلم اللّٰه أنه لیس من نفسه، شانَه اللّٰه، أی أ بغضه اللّٰه وأهانه، فما ظنُّك بثوابٍ من عند اللّٰه عزَّوجل، فی عاجل رزقه، وخزائن رحمته ، والسلام ."

هذه وصیة أمیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه الی أحد قُضاته، وهی تفیض صدقاً، واخلاصاً، وروعةً وبیاناً، لسلوك الطریق الأمثل ، فی فصل الخصومات بین الناس ، لیسعد النا س فی حیاتهم ، ویأمنوا علی أموالهم وأرواحهم، فی ظلِّ شریعة اللّٰه الخالدة!! . (فقه المعاملات)

قاضی سے فیصلہ میں غلطی صادر ہونے کا حکم:

قاضی کے اندر قضاء کی اہلیت موجود ہے اور شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی مکمل کوشش کی ،لیکن اس کے باوجود غلطی سے کوئی خلاف شرع فیصلہ ہوگیا اور مال حقدار کے بجائے دوسرے کو مل گیا تو ایسی صورت میں قاضی عنداللہ مجرم نہیں ہوگا۔

"عن عمر بن العاص رضی اللّٰه عنه أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال : اذا اجتهد الحاکم فأصاب فله الاجران، وان اجتهد

فاخطافله اجر".

(اخرجه البخاری فی کتاب الاعتصام رقم: ۲۵۹۳، مسلم رقم: ۱۷۱٦ فی الاقضیة)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی حاکم اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرے اور درست فیصلہ ثابت ہوتو ان کو دو اجر ملیں گے اور اگر خطاء اجتہادی واقع ہو جائے تب بھی ایک اجر ملے گا۔

(بخاری و مسلم)

لیکن یاد رہے کہ یہ ایسے قاضی کے لئے ہے جو قضاء کے اصول وضوابط سے مکمل واقف ہو احکام شرع کا استحضار رکھتا ہو، اس کے باوجود معاملہ سمجھنے میں غلطی واقع ہوئی تو یہ حکم ہے۔

قاضی کے غلط فیصلے سے حرام حلال نہیں ہوتا:

فقہاء امت کا اس پر اجماع ہے کہ قاضی اگر جھوٹی شہادت سن کر کسی کے حق میں غلط فیصلہ کردے یہ قضاء ظاہراً تو نافذ ہے، اس لئے مدعی علیہ کے ذمہ لازم ہوگا کہ مال مدعی کا حوالہ کردے ، لیکن باطنا عند اللہ یہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، لہٰذا مدعی کے لئے اس مال کو لینا حرام ہوگا، اس کا استعمال بھی حرام ہوگا، اگر لے لیا تو واپس کرنا لازم ہے، کیوں کہ قاضی کے فیصلہ کردینے سے حرام حلال نہیں ہوتا۔

لما قال صلی اللّٰہ علیه وسلم: انما انا بشر، وانکم تختصمون الی ولعل بعضکم الحن، بحجته من بعض، فاقضی بنحو ما اسمع فمن قضیت له من حق اخیه شیئاً فلا یأخذ ه، فانّما اقطع له قطعة من النار. (بخاری رقم: ٦٨/٢، مسلم ١٧١٣، کتاب الاقضیة)

وهذا الحديث حجة قاطعة، على أن حكم القاضي لا يجعل الحرام حلالا، فالشخص المبطل مؤاخذ ومعاقب عند اللّٰه حتى ولو حكم له القاضي، ولهذا قال الفقهاء، ان قضاء القاضي بالبينة الكاذبة، لا يبيح للمدعي أن يأخذ الحق، ولا يغير الواقع، ويبقى الامر المدعىٰ على ملك صاحبه، وقد حكى الامام الشافعي الاجماع على ذالك، لم يخالف فيه احد، وقضاء القاضي ينفذ ظاهرًا لا باطناً أى لا يحل ديانة وان ثبت قضاءً. (فقه المعاملات)

فیصلہ سے پہلے مصالحت کی کوشش کرنا:

قاضی کے لئے یہ بات بھی مناسب ہے کہ فیصلہ سے پہلے فریقین میں صلح کرانے کی کوشش کرے، کیوں کہ صلح میں بہتری ہے، کیوں کہ قاضی کی ذمہ داری منازعت کا خاتمہ کرنا ہے، یہ صلح ہی کے ذریعے ہوسکتا ہے، اس لئے فیصلہ کسی فریق کے حق میں ہوتا ہے تو دوسرے کی مخالفت میں، اس سے آپس کا نزاع ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے بغض اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔

كقوله تعالىٰ : ﴿ فلا جناح عليهما أن يصلحا بينهما صلحا، والصلح خير ﴾ (سورة النساء : ١٢٨)

كما فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم : روى البخارى عن كعب بن مالك انه تقاضى من عبد الله بن ابى حدرد الاسلمى ، دينا له عليه فى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فى المسجد، فارتفعت حتى سمعهما رسول الله صلى الله عليه وسلم وهوفى بيته فخرج اليهما حتى كشف سجف اى ستر حجرته ، فنادى يا كعب، فقال لبيك يارسول الله قال ضع من دينك هذا، فأومااليه اى الشطر، قال لقد فعلت يا رسول الله ، قال صلى الله عليه وسلم (لاخر) قم فاقضه .

(اخرجه البخارى : ٢/٦١ ، ومسلم رقم : ١٥٥٨ ، فى المساقاة)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاۃ مبارکہ میں مسجد نبوی میں انہوں نے عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ سے اپنے قرض کا مطالبہ کیا دونوں کی آواز کچھ بلند ہوگئی، آپ ﷺ نے گھر میں آواز سنی تو حجرۂ مبارک سے پردہ ہٹا کر باہر تشریف لائے (چونکہ پہلے دونوں کی بات سن چکے تھے) اس لئے حضرت مالک سے فرمایا کہ صلح کرلو یعنی اپنا آدھا قرض معاف کردو حضرت مالک نے آپ ﷺ سفارش قبول کرلی تو آپ ﷺ دوسرے سے فرمایا کہ تم اب قرض ادا کردو۔

یہ ایک طرح کی سفارش ہے، اس پر بڑے اجر وثواب کا وعدہ ہے۔

كقوله تعالى : ﴿ من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها،

ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها ﴾ (سورة النساء : ٨٥)

ترجمہ: جو شخص اچھی سفارش کرے اسکو اس (سفارش) کی وجہ سے (ثواب کا) حصہ ملے گا، اور جو شخص بری سفارش کرے اس کو اس کی وجہ سے (گناہ کا) حصہ ملے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

قضاء علی الغیب کا حکم:

احناف کا اصل مسلک یہ ہے کہ اگر مدعا علیہ غائب ہو تو اس کی عدم موجودگی میں اس کے خلاف فیصلہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ فیصلہ کے وقت اس کا خود موجود ہونا یا اس کے وکیل کا موجود ہونا ضروری ہے، کیوں کہ ممکن ہے کہ غائب کے پاس کوئی ایسی دلیل موجود ہو جو مدعی کے دعویٰ کو باطل کردے۔

قال صاحب الهداية : ولا يقضى القاضي على غائب الا أن يحضر من يقوم مقامه، كالوكيل أو الوصى لأن العمل بالشهادة لقطع الخصومة والمنازعة ولا منازعة بدون الانكار ولم يوجد ولانه يحتمل الاقرار والانكار من الخصم، فيشتبه وجه القضاء .

(الهداية : ١٦٩/٣)

البتہ ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں جب حجت وگواہی سے قاضی کے سامنے دعویٰ ثابت ہو گیا تو قاضی کے لئے جائز ہے کہ غائب کے خلاف فیصلہ کرے۔

" واستدلا لهم بقصة " هند " امرأة ابى سيفان ، انهاجاء ت الى رسول الله صلى الله عليه وسلم وقالت له،أن ابا سفيان رجل شحيح فهل يجوز لى أن اخذ من ماله بغير اذنه ؟فقال لها صلى الله عليه وسلم خذى مايكفيك وولدك بالمعروف ".

(طرف من حديث اخرجه البخارى ومسلم)

ہند زوجہ ابی سفیان نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی ابوسفیان بخیل آدمی ہے (یعنی خرچہ پورا نہیں) کیا میرے لیے بلا اجازت شوہر کے مال میں سے لے کر خرچ کرنا جائز ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بقدرِ ضرورت لے سکتی ہیں جو تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو۔

" وقالوا هذا قضاء على غائب وقد حكم لها رسول الله صلى الله عليه وسلم وزوجها غائب ."

فقد روى مالك في المؤطا أن عمر رضي الله عنه قال اللغرماء من كان له دين فليأتنا غدا، فانا بايعوا ماله ، وقاسمواه بين غرمائه .

(انظر الموطا للامام مالك رحمه الله)

هذا حكم على الغائب فقد كان الرجل الذى قضى عليه يبيع ماله غائباً . (فقه المعاملات)

خلاصہ یہ ہے کہ مدعیٰ ثابت ہونے کی صورت میں ائمہ ثلاثہ کے ہاں قضاء علی الغائب جائز ہے، جبکہ احناف کے ہاں جائز نہیں، البتہ شدید مجبوری کی صورت میں احناف کے ہاں بھی غائب کے خلاف فیصلہ کرنا جائز ہے۔

مدعیٰ علیہ کی گرفتاری کا حکم:

مدعیٰ علیہ کے ذمہ حق ثابت ہونے کے بعد بھی اگر وہ اداءِ حق سے انکار کرے، تو قاضی اس کو اداءِ حق پر مجبور کرے گا، اگر پھر بھی انکار کرے تو اسکو گرفتار کر کے جیل میں بھیجا جائے گا، کیوں کہ وہ انکار کی وجہ سے ظالم ٹھہرا ظلم کا دفع کرنا حاکم کے ذمہ لازم ہے۔

" كقوله عليه السلام : لیُّ الواحد ، يُحلّ عرضَه وعقوبَته " .

(اخرجه البخارى تعليقا : ٤٦/٥ ، فى الاستقراض ، ابوداؤد رقم : ٣٦٢٨)

ومعنى الحديث إن مما طلة القادر على سداد الدين ظلم يبيح التكلم عليه وعقوبته وسبحته .

سزاء کی مدت:

اتنے عرصے تک قید میں رکھا جائے گا کہ اس سے گمان غالب حاصل ہو جائے کہ اگر اس کے پاس مال ہوتا تو ضرور قرض ادا کر کے قید کی مشقت سے جان چھڑا لیتا، اگر ایک مدت تک جیل کاٹنے کے باوجود قرض ادا نہ کرے تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا البتہ صاحب حق اس کا تعاقب جاری رکھے گا جب اس کے پاس مال نظر آئے تو اس سے اپنے حق کا مطالبہ کرے گا۔

ومدة الحبس شهر او شهران ، وتقبل بينه الاعسار بعد الحبس

بالاجماع،واما قبل الحبس فلا تقبل والفارق بينهما أنه وجد بعد الحبس قرينة ، وهي تحمل شدة الحبس ومضايقه ، وذلك دليل اعساره . (انظر الاختيار لتعليل المختار : ۲/ ۹۰)

بیمار قیدی کا حکم:

جب قیدی جیل میں بیمار ہو جائے تو جیل کے اندر ہی علاج کروایا جائے گا اگر زیادہ بیمار ہو جائے تو پولیس کی نگرانی میں ہسپتال میں لاکر علاج کروایا جائے گا اور صحت یاب ہونے پر دوبارہ جیل بھیج دیا جائیگا، بشرطیکہ مالدار ہونا ثابت ہو جائے یا مدعی ثابت کردے کہ یہ تنگ دست نہیں۔

قاضی کے فیصلہ کے بغیر اپنا حق وصول کرنے کا حکم:

اگر دوسرے کے ذمہ حق ہے، لیکن کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے، اور مقروض انکاری ہے کہ میرے ذمہ تمہارا کوئی حق نہیں ہے، ایسی صورت میں بھی بہتر تو یہی ہے کہ عدالت کے ذریعہ حق وصول کرنے کی کوشش کی جائے لیکن اگر ممکن نہ ہو تو کسی بھی مناسب حیلہ کے ذریعہ اپنا حق وصول کرنا جائز ہے، البتہ اس کے لئے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہ کرے نیز اپنے حق سے زائد وصول نہ کرے۔

اسلامی عدالت کا ایک انوکھا واقعہ:

اسلام میں قاضی کی عدالت میں امیر وغریب کی کوئی تفریق نہیں اسی طرح حاکم ومحکوم، رشتہ دار غیر رشتہ دار، باپ بیٹا سب کا ایک ہی حکم ہے کہ مظلوم کی دادرسی کی جائے گی اور ظالم کے ظلم کو دفع کیا جائے گا اگر مدعی علیہ حاکم وقت ہے یا اور کسی بڑے عہدہ پر فائز ہے ظلم ثابت ہونے یا اس کے خلاف دعویٰ بینہ سے ثابت ہونے پر قاضی اس کے خلاف بھی فیصلہ سنائے گا، اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح کا مشہور واقعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

أخرج الامام أبو نعيم في الحلية هذا الخبر العجيب ، قال :

" وجد علي بن أبي طالب رضي الله عنه، درعاً له عند يهودي ، كان قد التقطها من الطريق، فقال له علي درعي سقطت عن جمل لي أورق، أي أحمر، فقال له اليهودي ، درعي وهي في يدي!! .

ثم قال له اليهودي : بيني وبينك قاضي المسلمين .

فأتوا " شريحا " فلما رأىٰ علياً قد أقبل ، وسع له فى المجلس ، فقال شريح : ماتشاء يا أمير المؤمنين !؟

قال : درعى سقطت عن جمل لى أورق ، فالتقطها هذا اليهودى!

فقال شريح : ما تقول يا يهودى ؟قال : درعى وفى يدى !!

فقال شريح : صدقت يا أمير المؤمنين ، انها لدرعك ، ولكن لا بد من البينة ، فأتنى بشاهدين يشهد ان لك بها !

فدعا على رضى الله عنه مولاه ، أى مملوكه، قنبر، ودعا الحسن بن على ، فشهد أنها درعه .

فقال شريح : اماشهادة مولاك فقد أجزناها، أى قبلنا ها،وأما شهادة ابنك فلا نجيز ها! يريد أنها لا تقبل بسبب صلة القرابة ، لأن شهادة الولد لوالده ، أو الوالد لولده غير جائزة، لوجود شبهة التحيز .

فقال على : أصلح الله أمرك ، أما سمعت عمر بن الخطاب يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : " الحسن والحسين سيداشباب اهل الجنة ".

(ترمذى كتاب المناقب رقم : ٣٧٦٨،من رواية ابى سعيد خدرى)

قال شريح : اللهم نعم!!قال على : أفلا تقبل شهادة سيدا شباب أهل الجنة ؟!فأصر القاضى على عدم قبول شهادته !

فقال على لليهودى : اذهب فخذ الدرع!!

فقال اليهودى : عجباً، أمير المؤمنين جاء معى الى قاضى المسلمين ، فقضىٰ لى عليه، ورضى بحكمه وقضائه !!

ثم قال اليهودى : صدقت والله يا أمير المؤمنين .

انها لدرعك سقطت عن جمل لك، والتقطتها أنا اشهد أن لا اله الا الله وأن محمدًا رسول الله ، فوهبها له على رضى الله عنه ،

واجازه على اعترافه ووصله بتسع مائة درهم اكرامالہ، وقتل معه يوم صفين.

(انظر كتاب الحلية لابى نعيم فقد ذكره فيه هذه القصة العجيبة)

ابونعیم نے ''حلیۃ الاولیاء'' میں نقل فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک زرہ گر گئی تھی جو ایک یہودی نے اٹھالی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب اپنی زرہ یہودی کے پاس دیکھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ زرہ میری ہے اونٹ سے گر گئی تھی تو نے اٹھالی، اور یہودی نے کہا یہ تو میری زرہ ہے میرے قبضہ میں ہے۔ پھر یہودی نے کہا کہ عدالت میں چلتے ہیں، چنانچہ دونوں وقت کے مشہور قاضی شریح کے پاس پہنچے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عدالت میں قاضی کے سامنے اپنا دعویٰ دائر کرایا کہ میری ایک زرہ میرے سرخ اونٹ سے گر گئی تو اس یہودی نے اٹھالی اور واپس نہیں دے رہا ہے قاضی یہودی سے پوچھا کہ کیا تو اس نے کہا یہ تو میری زرہ ہے چنانچہ میرے قبضہ میں ہے۔

قاضی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گواہ پیش کرنے کو کہا تو انہوں نے اپنے غلام اور اپنا بیٹا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیش کیا، قاضی نے کہا غلام کی گواہی تو قبول ہے لیکن بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول نہیں اس لیے کوئی اور گواہ پیش کریں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور تو نہیں ہے، یہ حسن ہیں جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے جنت میں جوانوں کے سردار ہونے کی بشارت دی ہے، تب بھی قاضی نے ان کی گواہی قبول نہیں کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زرہ یہودی کے حوالہ کردی، جب یہودی نے اس مساوات اور عدل وانصاف کو دیکھا کہ امیر المؤمنین کے مقابلہ میں ایک یہودی کی بات سنی گئی اور امیر المؤمنین کے خلاف یہودی کے حق میں فیصلہ ہوگیا تو فوراً انہوں نے کہا امیر المؤمنین یہ زرہ آپ کی ہے۔ اور کہا '' اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمد عبده ورسوله'' جب وہ مسلمان ہوگیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زرہ بھی ان کے حوالہ کردی اور مزید انعام بھی دیا پھر وہ پکا مسلمان ہوگیا، یہاں تک کہ جنگ صفین میں آپ رضی اللہ عنہ کی معیت میں لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم)

عقل مند وہوشیار قاضی:

قاضی کے لئے عقل مند ہوشیار اور معاملہ فہم ہونا ضروری ہے تاکہ عقل وفہم کے ذریعہ اور مدعی

اور مدعا علیہ سے مختلف سوالات کے ذریعہ حق کو واضح کر سکے، خصوصاً حدود و قصاص وغیرہ معاملات میں دیکھے کہ گواہوں کا بیان دعویٰ کے موافق ہے یا دعویٰ اور بیان میں تضاد ہے کیوں کہ شہادت کی بناء پر حدود ساقط ہو جاتے ہیں۔

"لقوله عليه السلام : ادرأوا الحدود بالشبهات ما استطعتم فان كان له مخرج فخلوا سبيله ، فان الامام لأن يخطئ في العفو، خير من ان يخطئ في العقوبة ." (اخرجه الترمذي : ١٤٣٤)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ، حدود میں شبہات پیدا ہو جائے، تو حتی المقدور حدود کو دفع کرنے کی کوشش کرو، اگر نفاذ حد سے بچنے کا کوئی راستہ نظر آئے تو مجرم کو چھوڑ دو، کیوں کہ امام کا غلطی سے معاف کر دینا، غلطی سے سزا دینے سے بہتر ہے۔ (ترمذی)

واقعات:

(۱) گواہوں کو متفرق کر کے ہر ایک سے الگ الگ گواہی حاصل کرنا تا کہ ان کے بیانات کے درمیان، اتفاق یا تضاد کو پرکھا جا سکے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک جماعت نے ان کے پاس آ کر شہادت دی کہ فلاں شخص نے ایک عورت سے زنا کیا ہے، تو انہوں نے ہر گواہ سے الگ الگ گواہی لی تو ایک نے کہا کہ اس عورت نے ایک جوان کے ساتھ زنا کیا، سیب کے درخت کے نیچے، دوسرے نے گواہی دی کہ اس نے ایک جوان کیساتھ زنا کیا امرود کے درخت کے نیچے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے جھوٹ کو پہچان لیا۔

(التلخيص الحبير : ٢/٤٩٦)

(۲) مروی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ دو عورتیں اپنے شیر خوار بچوں کو لیکر جنگل میں گئیں وہاں بچوں کو ایک جگہ رکھ کر اپنا اپنا کام کر رہی تھیں اتنے میں ایک بھیڑیا نمودار ہوا اور ایک بچہ لیکر غائب ہو گیا اب جو بچہ موجود تھا اس پر دونوں عورتوں کا جھگڑا ہو گیا ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ یہ بچہ میرا ہے اور بھیڑیا تمہارا بچہ لے گیا ہے، دونوں حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو انہوں نے طرفین کی باتیں سن کر بڑی کے حق میں فیصلہ سنایا۔

پھر دونوں عورتوں کا حضرت سلیمان علیہ السلام پر گذر ہوا اور ان کو واقعات اور داؤد علیہ السلام

کے فیصلہ سے مطلع کیا، تو سلیمان علیہ السلام نے ایک چھری منگوائی اور فرمایا کہ میں بچہ کو درمیان سے دو ٹکڑے کر کے دونوں کو ایک ایک ٹکڑا دیتا ہوں، یہ بات سن کر بڑی نے رضا مندی کا اظہار کیا ،لیکن چھوٹی عورت جو درحقیقت اس بچہ کی ماں تھی اس نے فوراً کہا بچہ اسی کو دیدیں لیکن اس کو ٹکڑا نہ کریں، حضرت سلمان علیہ السلام نے اس عورت کی کامل شفقت ومحبت کو دیکھ کر اندازہ لگالیا کہ یہ اسی خاتون کا بچہ ہے چنانچہ اسی کے حوالہ کردیا، یہ ہے قاضی کی ذکاوت اور ہوشیاری، دلائل اور شہادت کے علاوہ فہم وفراست بھی ہو جس سے حق واضح ہو جائے۔

فیصلہ کرنے کا طریقہ:

جب کوئی شخص دوسرے کے ذمہ حق کا دعویٰ کرے یا کسی مال کی ملکیت کا دعویٰ کرے، تو شرعاً اس کو مکلّف بنایا جائے گا، کہ اپنے دعویٰ کو شہادت ودلائل سے ثابت کرے، محض دعویٰ کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ جس نے جو دعویٰ کرلیا وہ سن کر اس کے حق میں فیصلہ کردیا جائے۔

"لقوله عليه السلام: لو يعطى الناس بدعواهم، لادعى رجال اموال قوم ودماء هم، لكن البينة على المدعى واليمين على من انكر"
(اخرجه البيهقي واحمد بسند حسن واخرجه مسلم في صحيحه رقم: ١٧٢١، بلفظ ولكن اليمين على المدعى عليه)

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے قاضی مدعی اور مدعا علیہ کا تعین کرے، پھر مدعی علیہ سے سوال کرے کہ اس دعویٰ کے متعلق وہ اقرار کرتا ہے یا انکار اگر اقرار کرے تو فیصلہ کردے اور اگر انکار کرے تو مدعی سے کہا جائے ثبوت پیش کرے، دستاویز اور گواہوں کو حاضر کرے، اگر ثبوت پیش کردیا تب بھی اس کے حق میں فیصلہ ہوگا اور اگر ثبوت موجود نہیں ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ مدعی علیہ قسم اٹھائے تو اس کو قسم دی جائے گی۔

مدعی علیہ کے ذمہ قسم ہے:

مدعی علیہ اگر قسم اٹھالے تو مقدمہ خارج کردیا جائے گا، مدعی اب کوئی بات نہیں کرسکتا ہے۔

"لقوله عليه السلام: للمدعى الكندى، الك بينة؟ قلت لا، قال فلك يمينه، ليس لك غير ذلك" (اخرجه البخاري: ٤/٢٤١، من حديث الاشعث بن قيس قال: في نزلت: ﴿ان الذين يشترون بعهد

اللہ و ایمانهم ثمناً قلیلا ﴾ الآیة ، کان بینی و بین رجل خصومة فی بئر فقال النبی صلی اللہ علیه و سلم : الك بینة ؟ قلت لا، قال : فلك یمینه، لیس لك الا ذلك ، وهذه روایة الصحیحین .

اب اگر مدعیٰ علیہ قسم اٹھانے سے انکار کردے، صراحت کے ساتھ انکار کرے یا قاضی کی طرف سے مطالبہ کے باوجود خاموشی اختیار کرے، تو بہتر یہ ہے کہ تین مرتبہ قسم دی جائے، پھر بھی انکار کرے تو مدعا علیہ پر دعویٰ لازم کردیا جائے گا اور اس کے خلاف فیصلہ کردیا جائے گا۔

مدعی کی قسم پر فیصلہ کرنا جائز نہیں:

اگر مدعیٰ علیہ خود قسم اٹھانے کے بجائے یہ کہے کہ مدعی خود قسم اٹھائے تو میں مان جاؤں گا تو مدعی کو قسم نہیں دی جائے گی، نہ ہی مدعی کی قسم پر فیصلہ کیا جائے گا، کیوں رسول اللہ ﷺ نے دعویٰ کے فیصلے کا یہ قانون مقرر فرمادیا ہے کہ گواہ مدعی کے ذمہ ہے اور قسم مدعا علیہ کے ذمہ۔

" لقوله علیه السلام : البینة علی المدعی و الیمین علی المدعی علیه " . (انظر الاختیار : ۲/ ۱۱٤ ، والحدیث اخرجه البخاری)

یعنی مدعی کے پاس گواہ نہ ہونے کی صورت میں مدعا علیہ کے ذمہ قسم ہے، باقی بعض فقہاء کا قول ہے کہ اگر مدعی کے پاس ایک گواہ موجود ہو اور قسم بھی اٹھائے، تو یہ قسم دوسرے گواہ کے قائم مقام ہوگی، لہٰذا ایک گواہ اور قسم کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔ ان کا مستدل حدیث ابن عباس ہے۔

" ان النبی صلی اللہ علیه و سلم قضی بالیمین مع الشاهد " .

(مسلم رقم : ۱۷۱۲)

لیکن جمہور فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ایک خاص واقعہ کے متعلق تھی، اس سے عام قانون کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا جو مذکورہ بالا حدیث بخاری میں موجود ہے۔

تنبیہ:

یاد رہے کہ مدعا علیہ کی قسم پر دعویٰ کا خارج ہونا، یہ صرف تجارتی معاملات یا مال کے متعلق دعووں میں ہوگا، باقی حدود و قصاص وغیرہ میں مدعا علیہ کی قسم براءت کے لئے کافی نہیں۔

ثبوت دعویٰ کا ایک طریقہ مدعیٰ علیہ کا اقرار ہے:

اگر مدعیٰ علیہ یا مجرم خود جرم کا اعتراف کرلے یہ معترف کے حق ثبوت جرم کی بڑی دلیل ہے،

اب مزید کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے، اس کے اعتراف پر فیصلہ کیا جائے گا۔

قال تعالیٰ: ﴿ بل الانسان علی نفسه بصیرة ﴾

(سورة القیامة: ١٤)

وقال تعالیٰ: ﴿ کونوا قوامین بالقسط شهداء لله ولو علی انفسکم ﴾ (سورة النساء: ١٣٥)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر اگر چہ اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔''

وقوله علیه: واغد یا انیس علی امرأة هذا، فان اعترفت فارجمها. (هذا طرف من حدیث اخرجه البخاری: ١٢١/٢١)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ، قصاص، حدود، اور دیگر مالی مقدمات کا فیصلہ اقرار کی بنیاد پر فرماتے تھے۔

البتہ یہ اقرار صرف اقرار کرنے والے کے حق میں ہی معتبر ہوگا، دوسرے کے حق میں نہیں، نیز اقرار کے معتبر ہونے کے لئے شرعاً یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر اقرار کی اہلیت موجود ہو، کہ وہ عاقل بالغ ہو، اور اس کا ہوش وحواس درست ہو، اس اقرار کے لئے اس پر کوئی جُبر نہ ہو۔

اقرار سے رجوع کرنے کا حکم:

اگر کوئی لوگوں کے حقوق کے متعلق اقرار کرے، مثلاً قرض، وصیت، یا وراثت وغیرہ تو اقرار کے بعد ان حقوق کی ادائیگی اس کے ذمہ لازم ہو جائے گی، رجوع کرنا صحیح نہیں۔

اور اگر حقوق اللہ میں سے کسی حق کے متعلق اقرار کرے مثلاً زنا کا اقرار کرے یا شراب نوشی وغیرہ کا تو اس کے اقرار پر حد جاری کیا جائے گا، لیکن اگر وہ حد جاری ہونے سے پہلے یا دوران حد اپنے اقرار سے رجوع کر لیتا ہے تو حد ساقط ہو جائے گا، کیوں کہ رجوع کی وجہ سے اس میں شبہ پیدا ہو گیا، اور حدود اللہ شبہ سے ساقط ہو جاتے ہیں۔

"لقوله علیه السلام: ادرؤا الحدود بالشبهات ما استطعتم فان الامام لأن یخطئ فی العفو، خیر من أن یخطئ فی العقوبة".

(اخرجه الترمذی رقم: ١٤٢٤ فی کتاب الحدود)

وفی روایه فی الصحیح : " أن النبی صلی الله علیه وسلم قال لما عز حین اقر عنده بالزنا ، لعلك قبلت، أو غمزت، أو نظرت ، قال عنده لا بل زنیت ، فعند ذلك أمر برجمه " .

(اخرجه البخاری فی کتاب الحدود : ٤/١٧٧)

وروی عن عمر بن الخطاب أنه خطب فی الناس فقال : والرجم فی کتاب الله حق علی من زنا، اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینة ، أو کان الحبل ، أو الاعتراف .

(صحیح البخاری فی کتاب الحدود : ٤/١٨٠)

مرض الموت میں اقرار کا حکم:

اگر کوئی شخص حالت صحت میں کسی وارث کے حق میں قرض کا اقرار کرے کہ میرے ذمہ فلاں کے اتنا قرض ہے تو اس کا یہ اقرار معتبر ہوگا، اور ادا کرنا لازم ہوگا، لیکن اگر مرض الموت میں کسی وارث کے حق میں اس طرح اقرار کرے، چوں کہ اس میں احتمال ہے کہ اس طرح وہ بعض وارث کو زیادہ مال دینا چاہتا ہو دوسرے بعض کو نقصان پہنچا کر اس لئے اس اقرار کا اعتبار نہیں ہوگا الا یہ کہ دوسرے ورثاء اس کی تصدیق کریں۔

کما فی الهدایة : ولو اقر المریض لوارثه لا یصح، الاأنْ یصدقه فیه بقیة الورثه، لانه قد تعلق بما له حق الورثة فی مرضه ، ولهذا یمنع من التبرع علی الوارث اصلا، وان اقر لاجنبی ، جاز لعدم وجود الشبهة . (الهدایة فی الفقه الحنفی : ٣/٢١٠)

مرض الموت میں طلاق پھر مطلقہ کے حق میں اقرار:

اگر کوئی شخص مرض الموت میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدے، اس کے بعد عدت میں اس عورت کے حق میں قرضہ کا اقرار کرے، پھر قرضہ ادا کئے بغیر وفات پائے، تو حکم یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس عورت کے حق میراث اور اقرار کردہ مال میں سے کونسا کم ہے، جو کم ہے وہ دیدیا جائے، کیوں کہ اس اقرار میں یہ شبہ موجود ہے کہ شاید اس کو زیادہ مال دلانے کے لئے طلاق دیکر اس کے بعد اقرار کا قدم اٹھایا ہے۔

كما في الهداية : اذا طلق زوجته في مرضه ثلاثا، ثم اقرلها بدين ومات، فلها الاقل من الدين وميراثها منه ، لانهما متهمان فيه لقيام العدة، والاقرار بابه مسدود للوارث فلعله اقدم على الطلاق ليصح اقراره لها زيادة على ميراثها . (الهداية : ٣/ ٢١١)

مرض الموت کی تعریف:

مرض الموت ایسی حالت کو کہتے ہیں کہ جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو اور اسی حالت میں مر بھی جائے، خواہ اسی عارضہ سے مرا ہو یا کسی دوسری وجہ سے خواہ یہ حالت مرض کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے، مثلاً کوئی شخص کشتی میں ڈوب رہا ہو یا آگ کے اندر گر گیا ہو، یا کسی ملبہ کے نیچے اس طرح دبا ہو کہ کچھ دیر زندہ رہا، اگر مرض کا مہلک ہونا معلوم نہ ہو تو اسے مرض الموت جب کہیں گے کہ اس میں اس قدر اضافہ ہو جائے کہ مریض گھر کے باہر کے ضروری مصالح سے عاجز ہو جائے مثلاً عالم مسجد میں جانے سے اور تاجر تجارت سے عاجز ہو جائے اگر مرض کسی مرحلہ پر ٹھہر جائے یعنی اس میں اضافہ نہ ہو رہا ہو اور اس ٹھہراؤ کے بعد ایک سال اسی حالت میں گزر جائے تو یہ مرض الموت میں داخل نہیں، پھر جب مرض بڑھ جائے اور اسی زیادتی کی حالت میں مر بھی جائے تو اس زیادتی کے وقت سے مرض الموت شمار ہوگا۔

(البحر الرائق : ٤/ ٤٣ ، ردالمحتار : ٢/ ٥٢ ، احسن الفتاویٰ)

كتاب الشهادة
شہادت کے احکام کے بیان میں

شہادۃ:

اپنے سامنے کسی معاملہ کو ہوتا ہوا دیکھ کر، یا کان سے سن کر یقین حاصل ہونے کی صورت میں بوقت ضرورت گواہی دینا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اس معاملہ کے وقت موجود تھا۔

شہادت کی ادائیگی کا حکم:

اگر اس معاملہ میں اور کوئی گواہ نہ ہو جو گواہ ہے وہ اگر گواہی نہ دے تو حق کے ضائع ہونے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں اگر اس سے گواہی طلب کی جائے تو شہادت دینا فرض ہے۔

لقوله تعالیٰ : ﴿ ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فانه اثم قلبه ﴾

(سورة البقرة : ۲۸۳)

ترجمہ: مت چھپاؤ گواہی کو اور جو شخص اس کو چھپائے تو بے شک اس کا دل گناہگار ہے۔

﴿ واقيموا الشهادة ﴾ (سورة الطلاق : ۲)

" وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : الا أخبر كم بخير الشهداء الذى يأتى بشهادته قبل أن يسألها أو يخبر بشهادته قبل أن يسألها " .

(اخرجه مسلم فى الأقضية رقم : ۱۷۱۹ ، مؤطا باب خير الشهادة)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ، کیا میں آپ لوگوں کو نہ بتلا دوں کہ گواہی دینے والوں میں بہترین شخص کون ہے؟ پھر خود ہی ارشاد فرمایا کہ جو طلب کرنے سے پہلے ہی گواہی دیدے، یا گواہی کے متعلق مطلع کر دے سوال سے پہلے۔ (مسلم)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی کسی معاملہ کے متعلق علم رکھتا ہو، مثلاً ایک شخص کا انتقال ہوا اس کا کچھ مال دوسرے کے ذمہ ہے وہ انکار کر رہا ہے، ورثاء کے پاس کوئی گواہ موجود نہیں جبکہ بعض لوگوں کو اس حق کا علم ہے، لیکن ورثاء کو ان گواہوں کا علم نہیں، تو ان لوگوں کے لئے لازم ہے کہ خود ہی گواہی دیدے۔

گواہی کے لئے علم صحیح کا ہونا ضروری ہے:

کسی واقعہ کے متعلق گواہی دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، اسی طرح کسی معاملہ کے متعلق گواہی کے لئے ضروری ہے کہ اس معاملہ کے وقت خود موجود ہو اور آنکھوں سے دیکھا اور کان سے سنا ہو، دیکھنے اور معائنہ کئے بغیر گواہی دینا جائز نہیں۔

وہ مواقع جن میں شہرت کی بنیاد پر شہادت دینا جائز ہے:

شہادت کا عام قانون تو یہی ہے کہ مشاہدہ اور معائنہ کے بغیر شہادت جائز نہیں البتہ بعض مواقع ایسے ہیں کہ ان میں محض شہرت کی بنیاد پر گواہی دینا جائز ہے۔

(۱) نسب: مثلاً ایک بچہ کسی کے گھر میں بڑا ہوا، اس کا دعویٰ یہی ہے کہ یہ میرا بچہ ہے تو اس شہرت کی بناء پر اس کے بچہ ہونے کی گواہی دی جا سکتی ہے۔

(۲) موت: ایک شخص کا انتقال ہوا اعلان ہو گیا کہ مرنے والا فلاں بن فلاں ہے، یہ خبر لوگوں میں مشہور ہو گئی، اب جن لوگوں نے اس کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا ان کے لئے بھی جائز ہے کہ شہادت دیں کہ فلاں بن فلاں کا انتقال ہو گیا ہے۔

(۳) نکاح: دو مرد و عورت ایک جگہ رہائش پذیر ہیں، دونوں میاں بیوی ہونے کے دعویدار ہیں، اب اس شہرت کی بناء پر گواہی دینا جائز ہے۔

(٤) ولایۃ القاضی: ایک شخص قاضی ہونے کا دعویدار ہے کہ اس کو حاکم وقت کی طرف سے عہدۂ قضاء پر فائز کیا گیا ہے، مزاحمت کرنے والا کوئی نہیں، عدالت میں بیٹھ کر مقدمات کا فیصلہ کر رہا ہے، لوگوں نے سنا کہ یہ قاضی صاحب ہیں، بعد میں اس بنیاد پر اس کے قاضی ہونے کی گواہی دینا جائز ہے۔

(٥) اصل الوقف: ایک جائیداد، زمین، مکان، مدرسہ وغیرہ کے متعلق مشہور یہی ہے کہ یہ موقوفہ جائیداد ہے ایک زمانہ کے بعد اس پر شہادت کی ضرورت پیش آئے تو اس کے موقوفہ ونے کی شہادت دینا جائز ہے اگرچہ وقف کرتے وقت گواہی دینے والا موجود نہ تھا۔

قال في الاختيار : ويجوز أن يشهد بكل ما سمعه ، أو ابصره من الحقوق والعقود لانه علمه وتيقنه ويقول اشهد بكذا ، ولا يقول اشهدني لانه كذب، وتجوز شهادة المختبى ، وهو أن يقر الرجل بحق، والشهود مختبئون في بيت يسمعون اقراره فانه يحل لهم الشهادة اذا كانوا يعرفون وجهه ويرونه .

ولا يجوز لاحد أن يشهد بمالم يشاهده ويعاينه الا النسب والموت، والنكاح، وولاية القاضي، وأصل الوقف لان هذه الاشياء تكون بحضور جماعة مخصوصة، فاقيمت الشهرة والاستفاضة مقام العيان والمشاهدة ألاترى انا نشهد أن عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم وأن فاطمة ابنته، ونشهد بخلافة ابي بكر وعمر والخلفاء الراشدين بالاستفاضة ، والشهرة انما تكون بالتواتر أو باخبار من يثق الناس به ، كما اذا اخبرنا احد أن فلانامات ، فتجوز الشهادة بموته،

اذا تواتر الخبر، أو نقله لنا الموثوقون.

(الاختيار لتعليل المختار للموصلي: ۲/۱۴۳)

قبول شہادت کی شرائط:

(۱) مسلمان ہونا:

مسلمان ہونا، لہذا کسی کافر کی گواہی مسلمان کے خلاف قابل قبول نہیں۔

﴿ ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا ﴾.

(سورة النساء: ۱۴۱)

ترجمہ: ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے۔

کیوں کہ اس میں احتمال ہے کہ عداوت اور بغض کی وجہ سے مسلمان کے حق میں جھوٹ بولے، البتہ کافر کی گواہی کافر کے حق میں مقبول ہے۔

(۲) عاقل، بالغ، آزاد ہونا:

عاقل، بالغ، آزاد ہونا، لہذا کسی نابالغ، مجنون، اور غلام کی شہادت قابل قبول نہیں۔

(۳) عادل ہونا:

یعنی گواہ صدق و دیانتداری میں مشہور ہو، لہذا فاسق بے دین شخص کی گواہی شرعاً معتبر نہیں۔

(۴) نابینا کی گواہی کا حکم:

گواہ بینا شخص ہو، لہذا نابینا کی شہادت معتبر نہیں کیوں کہ جب نابینا شخص کسی واقعہ کے متعلق شہادت دینا چاہے تو کس طرح دے سکتا ہے، جبکہ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ کس نے کس کو مارا، خنجر سے مارا، تلوار سے مارا، یا چھرا گھونپ دیا، البتہ بعض فقہاء نے کہا کہ خرید و فروخت کے معاملہ میں نابینا شخص کی گواہی معتبر ہے، بشرطیکہ وہ آواز کو اچھی طرح پہچان کر یقین کے ساتھ گواہی دے۔

(۵)

زبان سے شہادت ادا کرنا، لہذا گونگے شخص کی گواہی معتبر نہیں کیونکہ وہ اداءِ شہادت پر قادر نہیں۔

دشمن کی گواہی معتبر نہیں:

جن لوگوں کی آپس میں کسی دنیوی معاملہ کی وجہ سے دشمنی ہو تو ان کی ایک دوسرے کے

خلاف گواہی معتبر نہیں ہے۔

وقال عمر رضی اللہ عنہ : لا تقبل شھادۃ خصم، ولا ظنین .

(اخرجه مالك فى المؤطا عن عمر موقوفاً : ۲/۷۱۹)

قریبی رشتہ داروں کی شہادت معتبر نہیں:

اصول وفروع ،یعنی ماں ، باپ ،دادا، دادی وغیرہ کی شہادت اپنی اولاد کے حق میں، یا اولاد کی شہادت اپنے اصول ماں باپ وغیرہ کے حق میں معتبر نہیں ، نیز میاں ، بیوی کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں معتبر نہیں، نیز نوکر، نوکرانی جو گھر میں رہتے ہیں ان کی شہادت اپنے مالک کے حق میں معتبر نہیں۔

فلا تقبل شهادة الوالد لولده، ولا الام لابنها، ولا الولد لابيه ، ولا الزوج لزوجته، ومثله الخادم الذى ينفق عليه صاحب البيت ، فان الشهادة ، فى هذه الحال لا تقبل ، لوجود التهمة .

وفى الحديث : ولا تجوز شهادة خائن ولا خائنة ولا ذى عمر، اى حقد ، على أخيه ولا تجوز شهادة القانع لاهل البيت .

(ابو داؤد كتاب القضاء رقم : ۳٦۰۰، وابن ماجه فى الاحكام رقم : ۲۳٦٦)

القانع ، الخادم الذى ينفق عليه أهل البيت . (فقه المعاملات)

وہ رشتہ جن کی شہادت معتبر ہے:

اصول وفروع اور زوجین کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کی شہادت قابل قبول ہے، مثلاً بھائی کی شہادت بھائی کے حق میں، یا چچا، چچازاد بھائی ، یا بھتیجے وغیرہ کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں شرعاً معتبر ہے۔

وبهذا اخذ الجمهور . (فقه المعاملات)

نصاب شہادت:

عام معاملات ، بیع شراء، قرض ، اجارہ ، رہن اقرار ، غصب وغیرہ میں مردوں کی طرح عورتوں کی گواہی بھی معتبر ہے، یعنی ایک مرد ہو اس کے ساتھ دو عورتیں ہوں اس طرح عورتوں کی گواہی شرعاً معتبر ہے، صرف تنہا عورتوں کی گواہی معتبر نہیں ، مثلاً چار عورتیں مل کر شہادت دیں کہ ہم گواہی

دیتی ہیں کہ زید نے عمر کو یہ زمین فروخت کی ہے، کوئی مرد گواہ موجود نہیں تو صرف عورتوں کی گواہی سے عمر کے حق میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا، اگر قاضی فیصلہ کردے تو شرعاً وہ فیصلہ معتبر نہیں ہوگا۔

اسی طرح نکاح، طلاق، رجعت وغیرہ میں بھی عورتوں کی گواہی مردوں کی معیت میں معتبر ہے۔

حدود وقصاص میں خواتین کی شہادت غیر معتبر ہے:

البتہ حدود وقصاص میں خواتین کی شہادت شرعاً معتبر نہیں چاہے تنہا شہادت دے یا مردوں کے ساتھ مل کر شہادت دے، بلکہ حدود وقصاص کے ثبوت کے لئے دو مردوں کی شہادت ضروری ہے، مثلاً زید کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے بھائی نعیم کو خالد نے قتل کیا ہے، اور اس مقدمہ کا گواہ محض سلیم ہے، اور پانچ خواتین ہیں، تو چونکہ مقدمہ قتل کے ثبوت کے لیے دو مرد گواہوں کا ہونا ضروری ہے، جبکہ یہاں صرف ایک ہے اگر چہ اس کے ساتھ پانچ خواتین گواہ بھی موجود ہیں، لیکن نصاب شہادت نامکمل ہونے کی بناء پر زید کا مقدمہ خارج کردیا جائے گا۔

﴿ واستشهدوا شهيدين من رجالكم فان لم يكونا رجلين فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشهداء أن تضل احد اهما فتذكر احداهما الاخرىٰ ﴾ (سورة البقرة : ٢٨٢)

ترجمہ: اپنے مردوں میں سے دو گواہ بناؤ، اگر دو مرد گواہ میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو تا کہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلا دے۔ (بیان القرآن)

وذهب الجمهور الى أن شهادة النساء مع الرجال جائزة فى الاموال ، والنكاح ، والرجعة، والطلاق وكل شئى، الا فى "الحدود والدماء" فلا تقبل فيها شهادة النساء لغلبة العاطفة عليهن ، ولان الحدود تدرء بالشبهات .

قال الزهرى : مضت السنة من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتين من بعده ، أن لا شهادة للنساء فى الحدود

والقصاص .

(الهداية : ۲/۱۲۹ ، والاثر ، رواه ابن ابی شیبه عن الزهری)

ثبوت زنا کے لئے شہادت کا نصاب:

حد زنا کی ثبوت کے لئے چار مردوں کی گواہی ضروری ہے اس میں عورتوں کی گواہی مطلقاً معتبر نہیں، نیز نصاب شہادت چار مردوں سے کم ہونے سے بھی جرم ثابت نہ ہوگا۔

لقوله تعالیٰ : ﴿ والّتی یاتین الفحشة من نساء کم فاستشهدوا علیهن اربعة منکم ﴾ (سورة النساء : ۱۵)

وہ مسائل جن میں خبر واحد معتبر ہے:

قال العلامة الصابونی : وقد اجاز الفقهاء شهادة الرجل الواحد، فی بعض حالات استثنائیة ، کشهادة الخبیر فی المتلفات، والطبیب فی المریض الذی یحل معه الافطار، والشهادة علی الولادة، وشهادة الواحد فی تزکیة الشهود، وفی الاخبار عن عزل المؤکل وفی الاخبار عن عیب المبیع ، فلا یشترط فی مثل هذه الامور وجود شاهدین . (فقه المعاملات)

یعنی بعض حالات میں خبر واحد معتبر ہے دینیات، پاکی ناپاکی، حلال وحرام وغیر کی خبروں میں اسی طرح بعض دیگر حالات بھی ہیں جن میں خبر واحد معتبر ہے، مثلاً:

(۱) ڈاکٹر خبر دے کہ مریض کے لیے فلاں فلاں غذا نقصان دہ ہے، اب ان سے بچنا لازم ہے۔

(۲) یا مسلمان ڈاکٹر بتائے کہ اس وقت روزہ توڑ دیں ورنہ جان کو خطرہ ہے اب روزہ توڑ دینا لازم ہوگا۔

(۳) ایک شخص خبر دے کہ فلاں فلاں صاحب کا بچہ ہے تو اس خبر پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

(٤) گواہ کے عادل اور غیر عادل ہونے کے متعلق خبر۔

(٥) ایک معتبر شخص وکیل کو خبر دے کہ مؤکل نے تمہیں معزول کر دیا تو اس کی خبر پر

اعتماد کرتے ہوئے اپنے کو معزول سمجھے۔

(٦) ایک مبیع کے متعلق بتائیے کہ اس میں یہ عیب ہے تو اس پر اعتماد کرتے ہوئے رد بیع کا اختیار استعمال کرے وغیر ذالک۔

جن مواقع میں تنہا عورت کی شہادت معتبر ہے:

عورتوں کے جن حالات پر شرعاً مرد مطلع نہیں ہوسکتا ان میں تنہا ایک عورت کی شہادت بھی معتبر ہے، مثلاً، ولادت، یا پردۂ بکارت کا قائم ہونا یا زائل ہونا، یا عورتوں کے بعض عیوب، لہٰذا اگر صرف دائیہ اطلاع دے کہ پیدائش کے وقت بچہ کے رونے کی آواز نکلی تھی پھر انتقال کرگیا تو صرف اس کی شہادت پر حیاۃ ثابت ہوگی، اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور وراثت بھی جاری ہوگی۔

وفی الحدیث أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: " اجاز شهادة القابلة " دار قطنی فی سننه عن حذیفة بن الیمان.

(مجمع الزوائد: ٤/ ٢٠١)

وروی عبد الرزاق فی مصنفه عن الزهری أنه قال: مضت السنةأن تجوز شهادة النساء فیما لا یطلع علیه غیرهن، من ولادات النساء وعیوبهن. (نصب الرایة: ٤/ ٨٠)

وہ افراد جن کی شہادت مردود ہے:

چونکہ شہادت کے لئے گواہ کا عادل دیندار ہونا شرط ہے اس لئے ہر وہ شخص جو اعلانیہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو اس کی شہادت مردود ہے، مثلاً اداکار، گلوکار، ہیجڑے، شراب خور، جوئے باز، سود خور وغیرہ، کیوں کہ جب اعلانیہ طور پر گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں تو شہادت کے معاملہ میں بھی ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے۔

قال فی کتاب الاختیار: ولا یقبل شهادة مخنث ولا نائحة ولا من تغنی للناس الغناء الماجن، لان ذلك فسق لانه علیه السلام: "نهی عن صوتین احمقین، النائحة والمغنیة". (ترمذی: ١٠٠٥)

ولا تقبل شهادة المدمن علی الشرب واللهو، ولا من یفعل کبیرة

توجب الحد، ولا من يأكل الربا، ولا من يلعب القمار، ولا من يدخل الحمام بغير ازار. (انظر الاختيار: ۲/۱٤۲، الهداية: ۳/۱۳۱)

جھوٹی گواہی عظیم گناہ ہے:

سچی شہادت اجر عظیم کا باعث ہے، لیکن جھوٹی شہادت بڑا ہی قبیح گناہ ہے، قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

کقوله تعالىٰ: ﴿فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور﴾ (سورة الحج: ۳۰)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ اکبر الکبائر ہے شرک اور والدین کی نافرمانی کے بعد سب سے بڑا گناہ جھوٹی گواہی کو قرار دیا۔

"كما روى البخارى ومسلم: الا أنبئكم باكبر الكبائر؟ قلنا بلىٰ يا رسول الله؟ قال الاشراك بالله وحقوق الوالدين، وكان صلى الله عليه وسلم متكئا فجلس، فقال الا وشهادة الزور، او قال قول الزور، فمازال يكررها حتى قلنا ليته سكت، خشية عليه من شدة التاثر والغضب" (اخرجه البخارى رقم: ٢٦٥٤، ومسلم رقم ۸۷)

جناب رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ کیا میں تمہیں اکبر الکبائر سے مطلع نہ کردوں؟ ہم نے کہا ضرور یا رسول اللہ (ﷺ) پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، یہ ارشاد فرماتے وقت آپ ﷺ تکیہ لگائے بیٹھے ہوئے تھے تو سیدھے ہوکر بیٹھے اس کے بعد ارشاد فرمایا، جھوٹی گواہی، یا جھوٹی بات، پھر آپ مسلسل یہ جملہ دہراتے رہے، آپ ﷺ کے اس قول کے بار بار تکرار سے سخت متاثر ہونے اور غصہ کی کیفیت کو دیکھ کر ہم (دل ہی دل میں) تمنا کرنے لگے، اے کاش کہ آپ ﷺ خاموش ہوجاتے۔ (بخاری ومسلم)

دستاویز کا حکم:

کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے دستاویز بھی ایک اہم ثبوت ہے۔

کقوله تعالىٰ: ﴿ولا تسئموا أن تكتبوه صغيرا او كبيرا الى أجله

ذلكم اقسط عند الله و اقوم للشهادة و ادنیٰ أن لا ترتابوا ﴾

(سورة البقرة : ۲۸۲)

اور یہ کہ تم اس (دین) کے (بار بار) لکھنے سے اکتایا مت کرو، خواہ وہ (معاملہ دین کا) چھوٹا ہو یا بڑا لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے، اور زیادہ سزاوار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو، (اس لئے لکھ لینا ہی زیادہ اچھا ہے)۔

لہٰذا جب کوئی معاملہ کیا جائے تو اس کو لکھ لیا جائے اور دستاویز کو پختہ کرنے کے جو قانونی تقاضے ہیں ان کو پورے کئے جائیں اور دستاویز صحیح ہونا عدالت میں ثابت ہو جائے تو قاضی کو اس کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا، مدعیٰ علیہ کا دستاویز کو حق تسلیم کرنا اقرار حق کے قائم مقام ہے۔

مدعیٰ علیہ کا قسم میں توریہ کا حکم:

جب مدعیٰ علیہ کے ذمہ قسم لازم آئے اور وہ قسم اٹھائے تو اس میں مدعی یا قاضی جو قسم دلانے والا ہے اس کی نیت کا اعتبار ہوگا قسم اٹھانے والے کی نیت کا اعتبار نہ ہوگا، کیوں کہ کبھی قسم اٹھانے والا کسی اور چیز کی نیت کرتا ہے۔

مثلاً زید کا دعویٰ ہے کہ بکر نے مجھ سے مکان خریدا ہے اس کی قیمت دو لاکھ روپیہ اس کے ذمہ واجب ہے وہ دے نہیں رہا ہے، اور بکر اس کا انکار کرتا ہے، زید کے پاس کوئی گواہ نہیں اس لئے بکر کو قسم دی گئی کہ قسم اٹھائے کہ اس کے ذمہ زید کا دین بسلسلہ خریداری مکان نہیں ہے، اب بکر قسم اٹھاتا ہے لیکن قسم کے وقت نیت کرتا ہے کہ میں نے زید سے کوئی قرض نہیں لیا تو اس نیت کا کوئی اعتبار نہیں۔

"لقوله عليه السلام : يمينك على مايصدقك عليه صاحبك" .

(اخرجه مسلم باب يمين الحالف على نية المستحلف رقم : ۱۶۵۳)

امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ضمن میں فرمایا ہے کہ قسم میں قاضی یا قسم دلانے والے کی نیت کا اعتبار ہوگا، یہاں قسم اٹھانے کا توریہ عنداللہ کوئی فائدہ نہ دے گا، اگر جھوٹی قسم کھاتا ہے تو وہ حدیث کی رو سے بڑا گناہ گار اور مجرم ہوگا۔

اور جھوٹ بول کر دوسرے کے مال کو ہڑپ کرنا گناہ عظیم ہونا حدیث میں صراحت کے ساتھ

مذکور ہے۔

"لقوله عليه السلام : من حلف على يمين يقتطع بها مال امرئ مسلم ، لقى الله وهو عليه غضبان ." (اخرجه مسلم رقم : ٢٢٣)

کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی مسلم بھائی کا مال کھائے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضبناک ہوگا۔ (مسلم)

توریہ کی جائز صورت:

ہاں البتہ بعض فقہاء نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص مجبور ہو تو زبردستی اس پر مال کا دعویٰ ہے، اب اس کے لئے اپنا مال بچانے کی کوئی صورت نہیں تو دفع ظلم کے لئے وہ توریہ کر کے جھوٹی قسم اٹھاتا ہے اور اپنا مال بچاتا ہے تو شرعاً اس کی گنجائش ہوگی۔ (فقہ المعاملات)

احكام الصلح فى المعاملات

معاملات میں صلح کے احکام

صلح کے لغوی معنیٰ:

نزع کو ختم کرنا۔

كما فى قوله تعالىٰ : ﴿ وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فاصلحوا بينهما ﴾ (سورة الحجرات : ٩)

شرعی معنیٰ:

کوئی ایسا درمیانہ راستہ تلاش کرنا جو دونوں فریق کے لئے قابل قبول ہو، جس سے آپس کی منازعت ختم ہو جائے اور بغض وعداوت کی بنیاد ختم ہو جائے۔

صلح کی اقسام:

(١) دوملکوں کا سرحدی پٹی پر صلح کرنا۔

(٢) مسلمان اور کفار کا آپس میں کسی معاملہ پر صلح کرنا۔

(٣) جنگی معاہدات۔

(٤) دو قوموں کا آپس میں مصالحت کرنا۔

(٥) میاں بیوی کے آپس کی مصالحت۔

(٦) کسی وارث کا کچھ مال لیکر دوسرے ورثاء سے صلح کر لینا۔

(٧) مدعی اور مدعا علیہ کا آپس میں صلح کرنا۔

ان سطور میں صرف آخری قسم کے متعلق تفصیلات اور فقہی احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

صلح کی مشروعیت:

جب کوئی شخص دوسرے پر مال کا دعویٰ کرے اور دوسرا انکار کرے تو فیصلہ کا ایک راستہ تو قضاء کا ہے دوسرا راستہ مصالحت کا، قضاء کی صورت میں وقتی طور پر مقدمہ تو نمٹ جاتا ہے لیکن عام طور پر آپس کا نزاع ختم نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی وقت پھر لڑائی شروع ہونے کا امکان ہوتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ فیصلہ غلط ہو جاتا ہے اور ناحق مال دوسرے کو مل جاتا ہے۔

دوسرا راستہ جو صلح کا ہے، اس میں عموماً آپس کی بغض وعداوت ختم ہو جاتی ہے اور معاشرہ کے اندر امن کی فضاء قائم ہو جاتی ہے اس لئے شریعت نے قضاء کے بجائے صلح کا راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے۔

كقوله تعالىٰ: ﴿وان امرأة خافت من بعلها نشوزاأو اعراضاًفلاجناح عليهما أن يصلحا بينهما صلحا و الصلح خير﴾

(سورة النساء: ١٢٨)

ترجمہ: اگر کوئی عورت ڈرے اپنے خاوند کے لڑنے سے یا جی بھر جانے سے تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر کہ آپس میں کسی طرح صلح کرلیں اور یہ صلح ہی بہتر ہے۔ (از تفسیر عثمانی)

"وقال عليه السلام: الصلح جائز بين المسلمين، الا صلحا حرم حلالاأو احل حراماً والمسلمون على شروطهم."

(اخرجه الترمذي: ١٣٥٢، ابوداؤد: ٣٥٩٤، في الاقضية)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کا آپس میں صلح کرنا جائز ہے ہاں ایسی صلح کرنا جس سے کسی حرام کو حلال کیا جائے یا حلال کو حرام کیا جائے (وہ ناجائز ہے) اور مسلمان اپنے وعدہ وعہد کے پابند ہوتا ہے۔ (یعنی اس کے خلاف نہیں کرتا) (ابو داؤد، ترمذی)

شیخ صابونی فرماتے ہیں، وہ صلح جو حلال کو حرام کرے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر پر شرط رکھتی ہے کہ شوہر اس کی دوسری سوکن سے ہم بستری نہ کرے اور حرام کو حلال کرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ جواء کھیلنے پر صلح کرنا یا قرض کے بدلے مثلاً ایک من شراب دینے کی شرط ٹھہرانا وغیرہ، نیز ہر وہ چیز جس کا استعمال شرعاً حرام ہے اسکو بیع وشراء اور لین دین میں عوض ٹھہرانا۔ (فقه المعاملات)

صلح کی صورتیں:

(۱) صلح عن اقرار: مدعا علیہ حق کا اقرار کرتا ہے کہ ہاں، میرے ذمہ میں تمہارے دس ہزار روپے لازم ہیں لیکن میں پورا قرض دینے پر قادر نہیں ہوں تم اپنے حق کا کچھ حصہ معاف کر دو تو بقیہ دینے کے لئے تیار ہوں اب مدعی اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

(۲) صلح عن انکار: یعنی مدعا علیہ اپنے ذمہ حق کے لازم ہونے کا منکر ہے اب ان کے ذمہ قسم لازم ہے تو وہ قسم اٹھانے کے بجائے مدعی سے اس کے مطلوبہ مقدار سے کچھ کم پر صلح کرتا ہے جمہور فقہاء کے نزدیک صلح کا یہ طریقہ جائز ہے، کیوں کہ اس صورت میں مدعیٰ علیہ قسم اٹھانے، اپنے نفس کو ذلیل کرنے اور عدالتوں کے چکر کاٹنے کے بجائے مال خرچ کر کے اپنے کو مشقت اور ذلت سے بچاتا ہے، یہ اس کے حق میں جائز ہے، باقی مدعی اگر باطل پر ہو یعنی غلط دعویٰ کے ذریعہ ناحق مال بٹورنا چاہتا ہے تو اس کے حق میں صلح کے ذریعہ حاصل ہونے والا مال حرام ہی رہے گا، صلح کی وجہ سے دوسرے کا مال حلال نہیں ہو سکتا۔

قال ابو حنيفة رحمه الله : اجود مايكون الصلح عن انكار، لان الحاجة الى جوازه امس، لان الصلح لقطع المنازعات، واطفاء الثائرات، وهو في الصلح مع الانكار ابلغ وللحاجة والضرورة اثر في تجويز المعاقدات، ولو ابطلناه لفتح باب المنازعات .

(انظر الاختيار لتعليل المختار : ۳/۵)

صلح کے ارکان:

صلح بھی دوسرے عقود کی طرح ایک عقد ہے لہٰذا صلح کے انعقاد کے لئے ایجاب وقبول کا ہونا ضروری ہے، ایجاب وقبول کے لئے کوئی متعین عبارت ادا کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر وہ

عبارت جو صلح پر طرفین کی رضامندی پر دلالت کرے اس سے صلح منعقد ہو جائے گی۔

مثلا قال : صالحتك بألف درهم ، على الالفين التى لك عندى وقال الاخر قبلت .

یعنی ایک کہتا ہے کہ میرے تمہارے ذمہ جو دو ہزار قرض ہے میں ایک ہزار کے عوض تم سے صلح کرتا ہوں، ایک ہی ہزار دیدوں؟ دوسرا جواب میں کہتا ہے ہاں مجھے قبول ہے یا منظور ہے تو اس سے صلح منعقد ہو جائے گی۔

صلح کی شرائط:

1- عاقدین عاقل بالغ ہوں، لہٰذا بچہ اور مجنون کی صلح جائز نہیں۔

2- مصالح علیہ مال متقوم ہو، یا ایسا حق ہو جس کا عوض لینا شرعاً جائز ہو جیسے قصاص وغیرہ، کیوں کہ قصاص کے بدلہ میں مال دے کر صلح کر لینا جائز ہے۔

لقوله تعالىٰ : ﴿ فمن عفى له من أخيه شئى فاتباع بالمعروف واداء اليه باحسان ﴾ (سورة البقره : ١٧٨)

ترجمہ: پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی تو (دیت کا) معقول طور پر مطالبہ کرنا چاہیے، اور (قاتل کو) خوبی کے ساتھ مال (مقتول کے ورثاء تک) پہنچانا چاہیے۔

وہ حقوق جن میں صلح جائز نہیں:

بعض حقوق چوں کہ شرعاً ان کا عوض لینا جائز نہیں، لہٰذا ان پر صلح کرنا بھی جائز نہیں۔

جیسے حق شفعہ ہے، کسی کو زمین پر حق شفعہ کے دعویٰ کا حق حاصل ہے اب وہ صلح کرتا ہے کہ اتنی رقم دیدو میں حق شفعہ کا دعویٰ چھوڑ دیتا ہوں اب اس پر صلح کر لیتا ہے، شرعا جائز نہیں، اس صلح کا عوض بھی حلال نہیں۔

اسی طرح حد قذف اور کفالہ بالنفس وغیرہ۔

حدود اللہ میں صلح جائز نہیں:

حقوق العباد میں تو صلح کرنا جائز ہے، لیکن حدود اللہ میں صلح جائز نہیں لہٰذا اگر سزا میں کسی چور کا ہاتھ کاٹا جا رہا ہو، وہ صلح کرلے کہ اتنا مال دیتا ہوں میرا ہاتھ نہ کاٹا جائے یہ صلح شرعاً حرام ہے، اسی

طرح کوئی شرابی پکڑا گیا اور عدالت میں پیش ہوا، اس پر حد شرب جاری کرنے کا فیصلہ ہوا اب وہ مال پر صلح کرنا چاہتا ہے تا کہ اس پر حد جاری نہ ہو یہ بھی شرعاً جائز نہیں، اگر قاضی ایسا کرے تو بڑا خائن ہوگا، جو کچھ مال لے گا وہ رشوت ہوگی اس کا استعمال بھی حرام ہوگا۔

کما ورد فی الحدیث : " انه علیه السلام غضب علی اسامة بن زید ، لما اراد أن یشفع فی المرأة المخزومیة ، التی سرقت علی عهد النبی صلی الله علیه وسلم وقال له : اتشفع فی حد من حدود الله یا اسامة ! انما اهلك الدین من قبلکم انهم کانوا اذا سرق فیهم الشریف ترکوه واذا سرق فیهم الضعیف اقاموا علیه الحد والذی نفس محمد بیده لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدها . "

(هذا طرف من حدیث اخرجه البخاری فی الحدود : ۱۲/۷٦ ، مسلم : ۱٦٦۸)

یعنی بنی مخزوم کی ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں چوری کی، جرم ثابت ہونے پر سزا میں اس کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ ہوا ادھر عزیز واقارب کو خیال ہوا رسول اللہ ﷺ سے سفارش کی جائے تا کہ سزا معاف فرمادیں، اس کام کے لئے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو واسطہ بنایا جب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں سفارش کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ حضرت اسامہ پر ناراض ہوئے اور ارشاد فرمایا، اسامہ! کیا تم حدود اللہ کو ساقط کرنے کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ تم سے پہلے انبیاء کی قومیں اسی طرح ہلاک ہوئیں کہ ان میں کوئی مالدار چوری کرتا تو اس پر حد جاری نہیں کرتے اور اگر کوئی کم درجہ کا آدمی چوری کرتا تو سزا میں ہاتھ کاٹ دیا جاتا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد (ﷺ) بھی چوری کرتی تو میں سزا میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ (بخاری)

قال فی کتاب الاختیار : ولا یجوز الصلح عن الحدود لانها حق الله تعالیٰ ولا عن حد القذف لانه وان کان فیه حق العبد لکن المغلب فی حد القذف حق الشرع عندنا .

(الاختیار لتعلیل المختار للموصلی : ۳/۷)

دو شریکوں میں سے ایک کے صلح کرنے کا حکم:

دو آدمی کسی کاروبار میں شریک ہیں، اس مشترکہ کاروبار میں کسی کو ادھار یا قرض دیا، یا کسی اور وجہ سے دونوں کا مشترکہ قرضہ تیسرے شخص کے ذمہ میں واجب ہے اب ایک شریک اپنے حصۂ قرض کے بارے میں مدیون سے صلح کر لیتا ہے اور صلح کا عوض وصول کر لیتا ہے تو دوسرے شریک کو دو باتوں کا اختیار ہوگا۔

(1) چاہے تو صلح سے حاصل ہونے والے مال کا آدھا حصہ اپنے شریک سے وصول کر لے، پھر دونوں مل کر بقیہ ادھار قرضہ وصول کرنے کی کوشش کریں۔

(2) چاہے تو جب ایک شریک نے اپنا حصہ صلح کے ذریعہ وصول کر لیا تو دوسرا شریک بھی مقروض سے اپنے حصے کا مطالبہ کرے۔

قال صاحب الهداية : واصل هذه المسئلة ، أن الدين المشترك بين اثنين اذا قبض احدهما شيئا منه ، فلصاحبه أن يشاركه في المقبوض، لانه ازداد بالقبض مالية ، وهذه الزيادة راجعة الى اصل الحق فله المشاركة ولكنه قبل المشاركة باق على ملك القابض، وقد قبضه بدلا عن حقه فيملكه حتى ينفذ تصرفه فيه ويضمن شريكه حصته . (الهدايه : ۳/۲۲۲) .

صلح کے متفرق مسائل:

1..... ایک شخص نے کسی عورت پر دعویٰ کیا کہ یہ میری بیوی ہے، عورت نے نکاح سے انکار کیا، لیکن مرد کے اصرار کو دیکھ کر عورت نے کچھ مال پر صلح کر لی تو یہ جائز ہے گویا کہ یہ مرد کے حق میں خلع شمار ہوگا کہ عورت نے مال دے کر خلع کر لی اور عورت کے حق میں صلح کہ اس نے مقدمہ ختم کرنے کے لئے مال خرچ کیا، البتہ حقیقت میں دونوں میں کوئی نکاح نہیں ہوا تھا، مرد نے جھوٹا دعویٰ کیا تو ایسی صورت مین صلح کے عوض کا استعمال مرد کے لئے حرام ہوگا، عورت کو واپس کرنا ضروری ہے۔

2..... اگر ایک عورت نے کسی مرد پر نکاح کا دعویٰ کیا کہ یہ میرا شوہر ہے، مرد نے انکار کیا اس کے بعد کچھ مال دے کر اس عورت سے صلح کر لی تا کہ عورت دعویٰ چھوڑ دے یہ جائز نہیں کیوں کہ

اگر حقیقت میں یہ اس کی بیوی ہے تو مرد بیوی کو نکاح سے فارغ کرنے کے لئے مال نہیں دیتا بلکہ عورت مال دے کر خلع کرتی ہے، اور اگر دونوں میں نکاح نہیں ہوا تھا تب بھی مال دینا جائز نہیں جو مال دیا گیا وہ رشوت کہلائے گا۔

میراث میں مصالحت جائز ہے:

حصۂ میراث میں صلح جس کو اہل میراث کی اصطلاح میں ''تخارج'' کہا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ ایک وارث کا میراث میں جتنا حصہ بنتا ہے اس کے بدلہ میں کوئی متعین مال لیکر صلح کر لیتا ہے، کہ فلاں متعین مال (مثلاً دوکان، مکان، جائیداد) مجھے دیدیا جائے اور میراث میں جو میرا حصہ بنتا ہے وہ آپ بقیہ ورثا آپس میں تقسیم کرلیں یا اتنی رقم دیدیں بقیہ آپ تقسیم کرلیں صلح کی یہ صورت شرعاً جائز ہے۔

فقد روی عن عثمان بن عفان رضی اللّٰہ عنہ أنہ صالح تما ضر الاشجعیة امرأة عبد الرحمن بن عوف رضی اللّٰہعنہ علی ثمانین الف دینار (٨٠) عن ربع ثمنها ترکة زوجها لانها کانت احدی اربع زوجات بحضرة الصحابة، فلم ینکر علیه احد، فکان احماعاً.

(رواہ سعید بن منصور بسند صحیح، اعلاء السنن: ٣٧/٦١)

تعجیل کے مقابلہ میں دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا:

زید عمر کے ذمہ ایک لاکھ روپے واجب الاداء ہے جو چھ ماہ بعد اداء کرنا لازم ہے، اب زید کہتا ہے کہ تم فوری اداء کردو میں بیس ہزار معاف کرتا ہوں (٢٠٠٠٠)، یہ صلح شرعاً جائز نہیں ہے، گویا یہ بیس ہزار اس مدت کے عوض دیا اور لیا گیا ہے، جبکہ مدت کا کوئی عوض لینا اور دینا ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا یہ بھی حرام ہوا۔

(انظر کتاب الاختیار: ٩/٣، الهدایة: ٢٢٠/٣)

اس مسئلہ کی تفصیل میں شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم تحریر فرماتے ہیں۔

آج کل بعض تجار ''دین مؤجلہ'' (وہ دین جس کی ادائیگی کی تاریخ ابھی نہیں آئی) میں یہ معاملہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے دین کے کچھ حصے کو اس شرط پر چھوڑ دیتے ہیں کہ مدیون باقی دین فی الحال اداء کردے، مثلاً عمر پر زید کے ایک ہزار روپیہ دین تھا، اب زید عمرو سے کہتا ہے کہ میں سو

روپے دین کے چھوڑ دیتا ہوں، بشرطیکہ تم نوسو روپے فی الحال ادا کردو، فقہ کی اصطلاح میں اس معاملے کو "ضع وتعجل" (کچھ ساقط کردو اور جلدی حاصل کرلو) کا نام دیا جاتا ہے۔

اس کے حکم میں فقہاء کا اختلاف ہے، صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، تابعین میں سے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ، احناف میں سے امام زفر بن ہذیل اور شوافع میں سے شیخ ابوثور اس کے جواز کے قائل ہیں، اور صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما اور تابعین میں سے امام محمد بن سیرین اور حضرت حسن بصری، حضرت ابن مسیب، حضرت حکم بن عتیبہ اور امام شعبی رحمہم اللہ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

(دیکھئے مؤطا امام مالك: ١/٦٠٦، مصنف عبدالرزاق: ٨/٧١ تا ٧٤)

اس سلسلے میں دو مرفوع حدیثیں آپس میں متعارض ہیں اور سند کے اعتبار سے دونوں ضعیف ہیں۔

پہلی حدیث وہ ہے جو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ:

"لما امر النبی صلی اللّٰه علیه وسلم باخراج بنی النضیر من المدینة، جاء ه ناس منهم، فقالوا: یارسول اللّٰه! انك امرت باخراجهم، ولهم علی الناس دیون لم تحل، فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: ضعوا وتعجلوا."

(سنن الکبری للبیهقی: ٦/٢٨، کتاب البیوع، باب من عجل له ادنی من حقه)

"جب حضور اقدس ﷺ نے بنی نضیر کو مدینہ طیبہ سے نکل جانے کا حکم فرمایا تو کچھ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے بنی نضیر کو مدینہ سے نکلنے کا حکم فرمایا ہے، حالانکہ لوگوں پر ان کے دیون باقی ہیں، جن کی ادائیگی کا وقت ابھی نہیں آیا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ، کچھ ساقط کردو اور جلدی ادا کردو۔"

اس حدیث سے اس معاملہ کا جواز ثابت ہوتا ہے، اور ایک دوسری حدیث جو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے اگلے باب میں حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے

نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

" اسلفت رجلاً مائة دینار ثم خرج سهمي في بعث بعثه رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقلت له: عجل لي تسعين ديناراً وأحط عشرة دنانير، فقال: نعم، فذكر ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: اكلت ربايا مقدا و اطعمته."

میں نے ایک شخص کو ایک سو دینار بطور قرض دیئے، اس کے بعد حضور ﷺ جو وفد بھیج رہے تھے اس میں میرا نام بھی آگیا، میں نے اس شخص سے کہا کہ اگر تم مجھے نوے دینار فوراً ادے دو، میں تمہیں دس دینار چھوڑ دیتا ہوں، اس نے منظور کرلیا (اور میں نے اس سے نوے دینار لے لئے) پھر بعد میں کسی وقت حضور ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا: اے مقداد! تم نے خود بھی سود کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا۔ (حوالہ بالا)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کردی ہے کہ سند کے اعتبار سے دونوں حدیثیں ضعیف ہیں، اس لئے دونوں میں سے کسی ایک کو حجت اور دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا، البتہ فقہاء نے جانب حرمت کو ترجیح دی ہے، اس لئے کہ جب دین کی تاخیر کی صورت میں دین میں زیادتی کرنا سود میں داخل ہے، اسی طرح عین کی تعجیل اور جلدی کی صورت میں دین کے اندر کمی بھی اسی میں داخل ہے۔

جہاں تک بنی نضیر کے واقعے کا تعلق ہے، تو وہ حجت نہیں بن سکتا، اولاً تو اس لئے کہ اس کی سند ضعیف ہے، ثانیاً اس لئے کہ اگر سنداً اس واقعہ کو درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو یہ کہنا ممکن ہے کہ بنی نضیر کی جلاوطنی کا یہ واقعہ سن ۲ ھ میں پیش آیا ہو، اس طرح یہ واقعۂ سود کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے کا ہو جائے گا۔

علامہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ ذکر کر کے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

" ولما اجلى بنى النضير قالوا: ان لنا ديوناً على الناس، فقال: ضعوا وتعجلوا، ومعلوم ان مثل هذه المعاملة لا يجوز بين المسلمين، فان من كان له على غيره دين الى اجل، فوضع عنه بعضه

بشرط ان یعجل بعضه، لم یجز، کره ذلك عمر، وزید بن ثابت وابن عمر رضی الله عنهم."

(شرح السیر الکبیر للسرخسی: ٤/١٤١٢، فقرہ نمبر ٢٧٣٨، پھر دوبارہ یہی مسئلہ صلاح الدین المنجد کی تحقیق کے ساتھ: ج۴/۱۹۴ فقرہ نمبر ۲۹۲۱ پر ذکر کیا گیا ہے)

جب حضور ﷺ نے بنونضیر کو جلاوطن کر دیا تو وہ لوگ حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین ہیں، تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: دین کا کچھ حصہ ساقط کر دو اور بقیہ دین فوراً لے لو، اور یہ بات طے ہے کہ مسلمان کے درمیان آپس میں یہ معاملہ ناجائز ہے، اس لئے کہ اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہو اور دین کی ادئیگی کا وقت ابھی نہ آیا ہو تو وہ دائن اگر اس شرط پر دین کا کچھ حصہ چھوڑ دے کہ مدیون دین فوراً ادا کر دے تو یہ معاملہ جائز نہیں اور حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے اس معاملہ کو مکروہ قرار دیا ہے۔

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مسلمان بنی نضیر کے ساتھ حالت جنگ میں تھے اور اس وقت ان کے لئے بنی نضیر کے پورے مال پر قبضہ کر لینا بھی جائز تھا، لہٰذا اگر مسلمانوں نے ان کے دین کا بعض حصہ کم کر دیا تو یہ بطریق اولی جائز ہوگا۔

بنی نظیر کے قصہ سے استدلال درست نہ ہونے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہود دوسرے لوگوں سے سود پر لین دین کا معاملہ کرتے تھے اور حضور ﷺ نے دین کے جس حصے کو ساقط کرنے کا حکم فرمایا ہے، اس سے مراد وہ سود ہے جو رأس المال سے زائد ہو، رأس المال میں کمی کرنے کا حکم نہیں دیا، اس بات کی تائید واقدی کی عبارت سے ہوتی ہے جو انہوں نے اس واقعہ کے بیان میں لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"فاجلاهم (ای بنی النضير) رسول الله صلى الله عليه وسلم من المدينة، وولى اخراجهم محمد بن مسلمة، فقالوا: ان لنا ديوناً على الناس الى آجال، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: تعجلوا او ضعوا، فكان لابى رافع سلام بن الحقيق على اسيد بن حضير عشرون ومائة دينار الى سنة فصالحه على اخذرأس ماله ثمانين ديناراً

وابطل ما فضل . "

"حضور ﷺ نے قبیلہ بنونضیر کو مدینہ سے جلاوطن کردیا، اور حضرت محمد بن مسلمہ کو اس کا نگران مقرر فرمایا، اس وقت وہ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے، اور آکر کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین واجب ہیں، جن کی ادائیگی مختلف مدتوں پر ہونی ہے، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جلدی لے لو اور ساقط کردو، اور ابی رافع سلام بن الحقیق کے حضرت اسید بن حضیر کے ذمہ ایک سوبیس دینار دین تھے، جن کی واپسی سال گذرنے پر ہونی تھی، چنانچہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اصل راس المال جو اسی دینار تھے اس پر اس سے صلح کرلی اور جو زائد (سود) کے چالیس دینار تھے ان کو چھوڑ دیا۔"

(مغازی الواقدی: ۱/۳۷۴، علامہ واقدی لکھتے ہیں کہ قبیلہ بنی قینقاع کی جلاوطنی کے وقت بھی بعینہ یہی قصہ پیش آیا تھا، دیکھئے: ۱/۱۷۹)

یہ روایت اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ دین کا جو حصہ ساقط کیا گیا تھا، وہ سود ہی تھا، اصل رأس المال کا حصہ نہیں تھا۔

اس لئے جمہور علماء کے نزدیک "ضع وتعجل" (کچھ ساقط کروا، فوراً دے دو) کا معاملہ حرام ہے، چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آثار ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

" قال مالك : والامر المكروه الذى لا اختلاف فيه عندنا ان يكون للرجل على الرجل الدين الى اجل، فيضع عنه الطالب ويعجله المطلوب...... قال مالك : وذلك عندنا بمنزلة الذى يؤخر دينه بعد محله عن غريمه ويزيد الغريم فى حقه قال : فهذ الربا بعينه لا شك فيه. "

"امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ امر مکروہ جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو، اور وہ (طالب) دائن دین کا کچھ حصہ ساقط کرکے بقیہ دین کا فوری مطالبہ کرے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ صورت ہمارے نزدیک اس صورت ہی کی طرح ہے کہ کوئی شخص مدیون کو اداء دین کی تاریخ

کے بعد اور مہلت دیدے اور وہ مدیون اس مہلت کے بدلے دین میں کچھ اضافہ کردے، فرماتے ہیں کہ یہ صریح ربا ہے، جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔"

(مؤطا امام محمد، کتاب البیوع، باب ماجاء فی الربا فی الدین: ۶۰۶/۱)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ مؤطا امام محمد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اثر ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"قال محمد: وبهذا نأخذ من وجب له دين على انسان الى اجل، فسأل ان يضع عنه ويعجل له مابقى، لم ينبغ ذلك، لانه يعجل قليلاً بكثير دينا، فكانه يبيع قليلاً نقدًا بكثير دينا، وهو قول عمر بن الخطاب وزيد بن ثابت وعبد الله بن عمر، وهو قول ابى حنيفة."

"امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اس سے استدلال کرتے ہیں کہ اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو، اور وہ اس سے کہے کہ وہ اس کا کچھ دین ساقط کردے گا، بشرطیکہ وہ بقیہ دین فوراً ادا کردے تو یہ صورت درست نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں وہ دین کثیر کے بدلے میں دین قلیل کو جلد طلب کر رہا ہے، گویا کہ وہ قلیل نقد کو کثیر دین کے عوض فروخت کر رہا ہے، یہی قول حضرت عمر بن خطاب، حضرت زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔"

(مؤطا امام محمد: ۳۳۲/۱، باب الرجل يبيع المتاع او غيره نسيئة ثم يقول: انقدني واضع عنك)

اور علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ تعالیٰ "المغنی" میں فرماتے ہیں:

"اذا كان عليه دين مؤجل، فقال لغريمه: ضع عنى بعضه واعجل لك بقيته، لم يجز، كرهه زيد بن ثابت وابن عمر والمقداد وسعيد بن المسيب وسالم والحسن وحماد والحكم والشافعى ومالك والثورى وهشيم وابن علية واسحق وابو حنيفة، وقال المقداد لرجلين فعلا ذالك: كلا كم قد آذن بحرب من الله ورسوله، وروى عن ابن عباس انه لم يربه بأسا، وروى ذلك عن النخعى وابى ثور،

لانه آخذ ببعض حقه، تارك لبعضه، فجاز، كما لو كان الدين حالا، وقال الخرقي: لا بأس ان يعجل المكاتب لسيده، ويضع عنه بعض كتابته ولنا انه بيع الحلول فلم يجز، كما لو زاده الذي له الدين فقال: اعطيك عشرة دراهم وتعجل لي المائة التي عليك، فاما المكاتب فان معاملته مع سيده، وهو يبيع بعض ماله ببعض، فدخلت المسامحة فيه، ولانه سبب العتق، فسومح فيه، بخلاف غيره."

اگر ایک شخص کا دوسرے پر دین مؤجل ہو، اب وہ شخص اپنے غریم (قرض خواہ) سے کہے کہ مجھ سے دین کا کچھ حصہ ساقط کردو، بقیہ دین فوراً ادا کردوں گا، یہ صورت جائز نہیں، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عمر، حضرت مقداد، حضرت سعید بن المسیب، حضرت سالم، حضرت حسن، حضرت حماد، حضرت حکم، امام شافعی، امام مالک، امام ثوری، اور حضرت ہشیم، حضرت ابن علیہ، امام اسحاق اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس صورت کو ناپسند قرار دیا ہے اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے ایسے دو شخصوں کو جنہوں نے ایسا معاملہ کیا تھا، خطاب کرتے ہوئے فرمایا، تم دونوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا اعلان کیا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس معاملے میں کوئی حرج نہیں ہے، امام نخعیؒ امام ابوثور سے بھی یہی منقول ہے، اس لئے کہ اس صورت میں قرض خواہ اپنے حق کا کچھ حصہ وصول کررہا ہے، اور کچھ حصہ معاف کررہا ہے، لہٰذا یہ صورت جائز ہے، جیسا کہ دین حال (نقد) میں یہ صورت جائز ہوتی ہے، اور امام خرقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر مکاتب غلام اپنے آقا کو بدل کتابت جلد ادا کردے، اور اس کے بدلہ میں آقا کچھ بدل کتابت معاف کردے تو اسمیں کوئی حرج نہیں، ہمارے نزدیک چونکہ مذکورہ صورت میں مدت کی بیع ہورہی ہے، اس لئے جائز نہیں ہے، جیسے کہ اگر قرض خواہ دین میں اضافہ کرتے ہوئے مقروض سے کہے کہ تم میرا سو درہم کا قرض فوراً ادا کردو، میں تمہیں دس درہم دوں گا، (ظاہر ہے کہ یہ صورت جائز نہیں) جہاں تک مکاتب غلام کا تعلق ہے، چوں کہ اس کا معاملہ اپنے مولیٰ کے ساتھ ہورہا ہے، اور گویا کہ مولیٰ اپنے ایک مال کو دوسرے مال کے عوض فروخت کررہا ہے، اس لئے اس کے جواز میں مسامحت سے کام لیا گیا ہے دوسرے اس لیے کہ یہ صورت اس غلام کی فوری آزادی کا سبب بھی بن رہی ہے، اس لئے بھی اس میں تسامح سے کام لیا گیا ہے، بخلاف مذکورہ

صورت کے۔ (کہ اس میں یہ بات نہیں پائی جارہی ہے)

(مغنی لابن قدامة، مع الشرح الکبیر: ٤/١٧٤، ١٧٥)

چنانچہ مندرجہ بالا نصوص فقہیہ کی بنیاد پر مدت کے مقابلے میں دین کے کچھ حصے کے سقوط کی حرمت کو راجح قرار دیا گیا ہے۔

فوری ادائیگی والے دیون "ضع وتعجل" کا اصول نافذ کرنا:

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہو رہا ہے کہ "ضع وتعجل" کی ممانعت صرف دیون مؤجلہ میں ہے، جہاں تک دیون حالہ کا تعلق ہے، بلکہ مدیون ان کی ادائیگی کے بارے میں عقد کے اندر کسی مدت کو شرط قرار نہیں دیا گیا، بلکہ مدیون ان کی ادائیگی میں کسی بھی وجہ سے تاخیر کر رہا ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسے دیون میں دین کے کچھ حصے کو چھوڑنے پر صلح کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ مدیون باقی دین فوراً ادا کر دے، علماء مالکیہ نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے، چنانچہ المدونۃ الکبریٰ میں ہے کہ:

"قلت: ارأیت لو ان لی علی رجل الف درهم قد حلت، فقلت: اشهدوا ان اعطانی مائة درهم عند رأس الشهر فالتسع مائة درهم له، وان لم یعطنی فالالف کلها علیه، قال مالك: لا بأس بهذا، وان اعطاه رأس الهلال فهو کما قال، وتوضع عنه التسع مائة، فان لم یعطه رأس الهلال فالمال کله علیه."

(المدونة الکبریٰ: ١١/٢٧، آخر کتاب الصلح)

"میں نے ان سے کہا کہ اس مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر ایک شخص کے ذمہ میرے ایک ہزار روپے دین ہوں اور اس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو اور میں اس سے کہوں کہ اگر تم نے مہینہ شروع ہونے پر سو درہم ادا کر دیئے تو نو سو درہم تمہارے ہیں، اور اگر تم نے ادا نہیں کئے تو پھر پورے ایک ہزار درہم ادا کرنے پڑیں گے؟ اس کے جواب میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، اگر وہ مہینے کے شروع میں سو درہم ادا کر دے تو پھر ایسا ہی ہوگا جیسے تم نے کہا، اور نو سو درہم اس سے ساقط ہو جائیں گے، اور اگر مہینے کے شروع میں اس نے سو درہم ادا نہیں کئے تو پھر پورا دین اس کے ذمہ رہے گا۔"

پھراس کے بعداسی قسم کا ایک اور مسئلہ ذکر فرمایا کہ:

"قلت : ارأيت لو ان لی علی رجل مائة دينار ومائة درهم حا لة، فصالحته من ذالك علی مائة دينار و درهم نقدًا، قال : لا بأس بذلك."

(المدونة الكبرى : ١١/٢٧، آخر كتاب الصلح)

میں نے ان سے کہا کہ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر کسی کے ذمہ میرے ایک سو دیناراور ایک سو درہم فی الحال واجب ہوں اور میں اس سے سو دیناراور ایک درہم نقد پر صلح کرلوں تو کیا یہ جائز ہے؟ امام مالک نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں۔

اور علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وما ذكره عن عيسىٰ هو في نواز لــه من كتاب المديان والتفليس ونصه : وسئل عن الرجل يقول لغريمه وقد حل حقه : ان عجلت لی كذا و كذا، من حقی فبقيته عنك موضوع، ان عجلته لی نقدًا الساعة، او الی اجل يسميه، فعجل له نقدًا، او الی الاجل، الا الدرهم او النصف او اكثر من ذلك : هل تكون الوضيعة لازمة؟ فقال: ما اری الوضيعة تلزمه، اذا لم يعجل له جميع ذلك، واری الذی له الحق علی شرطه، قال محمد بن رشد : هذه مسالة يتحصل فيها اربعة اقوال : احدهما قوله فی هذه الرواية، وهو قول اصبغ فی الواضحة ومثله فی آخر كتاب الصلح من المدونة ان الوضيعة لا تلزمه، الاان يجعل له جميع ماشرط الی الاجل الذی سمی، وهو اصح الاقوال."

"نوازل کی کتاب المدیان والتفلیس میں عیسیٰ سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ ان سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ اگر ایک شخص اپنے ایسے غریم (مدیون) سے کہے جس کے دین کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو: اگر تم نے میرا اتنا حق ادا کر دیا تو بقیہ دین معاف ہے، یا تو تم ابھی نقد ادا کرو، یا فلاں وقت تک ادا کر دو، لہٰذا اگر مدیون فوراً ادا کر دے، یا اس کی مقرر کردہ مدت پر ادا کر دے مگر صرف ایک درہم یا نصف درہم یا کچھ زیادہ باقی رہ جائے تو کیا اس صورت میں بھی دائن کے لئے اسقاط دین لازم ہوگا جس کا اس نے وعدہ کیا تھا یا نہیں؟ جواب میں فرمایا کہ میری رائے میں اگر مدیون

نے پوری رقم ادا نہیں کی تو اس صورت میں اسقاط دین دائن پر لازم نہیں ہوگا، اور میری رائے میں اسقاط دین شرط ادا پر موقوف تھا، محمد بن رشد فرماتے ہیں کہ اس میں چار اقوال ہیں، اور ایک وہی ہے جو اس روایت میں ہے، اور یہی اصبغ اور واضح کا قول ہے اور مدونۃ الکبریٰ کی کتاب الصلح کے آخر میں بھی یہی قول مذکور ہے، وہ یہ کہ دائن پر دین کی کمی کرنا اس وقت تک لازم نہیں ہوگا جب تک مدیون مقررہ مدت پر پورا دین ادا نہ کر دے، اور یہی سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔''

(تحریر الکلام فی مسائل الالتزام للحطاب: ص ۲۳۱، دیکھئے فتح العلی المالک: ۱/۲۸۹)

یہ عبارات اس بارے میں بالکل صریح ہیں کہ علماء مالکیہ کے نزدیک دیون حالہ میں ''ضع وتعجل'' کا اصول جاری کرنا جائز ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ فقہاء مالکیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ متفق ہیں، اس لئے کہ دوسرے علماء نے جہاں کہیں ''ضع وتعجل'' کے حرام ہونے کا ذکر کیا ہے، وہاں ''دیون مؤجلہ'' کی قید بھی لگائی ہے، جیسا کہ مؤطا میں امام محمد بن حسن کی ذکر کردہ عبارت اور اس پر قائم کئے گئے ترجمۃ الباب سے یہی ظاہر ہو رہا ہے، اسی طرح علامہ ابن قدامہؒ نے بھی اس مسئلہ کو ''دین مؤجل'' کے ساتھ مقید کیا ہے (دونوں کی عبارات پیچھے گذر چکی ہیں) اور یہ بات بداہت کے ساتھ ثابت ہے کہ کتب فقہ میں مفہوم مخالف حجت ہوتا ہے، لہٰذا اس سے ظاہر ہوا کہ دیون حالہ میں ''ضع و تعجل'' جائز ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ نصف دین ساقط کرنے کے بارے میں حضرت کعب اور حضرت ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہما کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"فقال اهل العلم فى التطبيق بينه و بين هذه الآثار، ان الآثار فى المؤجل، وهذا فى الحال، وفى كتاب الرحمة: اتفقوا على ان من كان له دين على انسان الى اجل، فلا يحل له ان يضع عنه بعض الدين قبل الاجل، ليعجل له الباقى ...... على انه لأ باس اذا حل الاجل ان ياخذ البعض ويسقط البعض." (المسوىٰ على المصفىٰ: ۲/۳۸۲)

''اہل علم اس واقعہ کے درمیان اور ان آثار کے درمیان جو ''ضع وتعجل'' کے بارے مروی ہیں، اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ ان آثار اور روایات کا تعلق دین مؤجل سے ہے، اور یہ واقعہ دین حال سے متعلق ہے، اور کتاب الرحمۃ میں ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے پر کسی مدت کے لئے

دین واجب ہو تو دائن کو مدت کے آنے سے پہلے یہ کرنا جائز نہیں کہ دین کا کچھ حصہ معاف کردے تا کہ بقیہ دین فوراً وصول کرلے ...... ہاں! اس میں کوئی حرج نہیں کہ جب دین کی ادائیگی کا وقت آجائے اس وقت کچھ دین وصول کرلے اور باقی معاف کردے۔“

دیون مؤجلہ اور دیون حالہ میں فرق اس لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ دین حال میں مدت کی شرط نہیں ہوتی اور ”تاخیر“ مدیون کا حق نہیں ہوتا، لہٰذا چونکہ اس میں ”مدت“ منتفی ہے اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دین کا جو حصہ معاف کردیا ہے، وہ ”مدت“ کے عوض معاف کیا ہے، لہٰذا اس میں ربا کے معنی نہیں پائے جاتے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرض حسن، حنفیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوتا (یعنی قرض میں مدت ذکر کرنے سے وہ مدت لازم نہیں ہوتی) مالکیہ کے نزدیک قرض مؤجل ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”وان اجل القرض لم يتأجل، و كان حالا، و كل دين حل أجله، لم يصر مؤجلاً بتأجيله، وبهذا قال الحارث العكلي والاوزاعي وابن المنذر والشافعي، وقال مالك والليث: يتأجل الجميع بالتأجيل ...... و قال ابو حنيفة في القرض وبدل المتلف كقولنا .“

قرض مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوتا، بلکہ ادائیگی فوری واجب رہے گی، اور ہر وہ دین جس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو، اب وہ دین مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوگا، امام حارث العکلی، امام اوزاعی، ابن منذر اور امام شافعی کا بھی یہی قول ہے، اور امام مالک اور امام لیث فرماتے ہیں کہ ہر قرض مؤجل کرنے سے مؤجل ہو جاتا ہے...... قرض اور ہلاک شدہ چیز کے بدل کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا بھی وہی قول ہے، جو ہمارا ہے۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اختلف العلماء في تاخير الدين الى اجل، فقال ابو حنيفة واصحابه: سواء كان القرض الى اجل او غير اجل، له ان ياخذه متى احب، و كذلك العارية وغيرها، لانه عند هم من باب العدة والهبة غير مقبوضة، وهو قول الحارث العكلي واصحابه وابراهيم النخعي،

وقال ابن ابی شیبة : وبه نأخذ وقال مالك واصحابه : اذا اقرضه الی اجل ثم اراد ان یأخذ قبل الأجل لم یکن له ذلك . "

(عمدة القاری للعینی : ٦/ ٦٠، کتاب الاستقراض باب اذا اقرضه ، الی أجل مسمی ، مزید دیکھئے : احکام القرآن للجصاص : ٤٨٣/٢ ، فتح الباري : ٦٦/٥ ، مسوی مع المصفیٰ : ٣٨٢/٢ تنقیح الحامدیة : ٢٧٧/١ ، شرح المجلة للاتاسی : ١/ ٤٣٩)

کسی مدت تک دین کو مؤخر کرنے کے بارے علماء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ قرض چاہے مؤجل ہو یا غیر مؤجل، دونوں صورتوں میں دائن اپنا قرض جب چاہے وصول کرنے کا حق رکھتا ہے، اور عاریت کا بھی یہی حکم ہے، اس لئے کہ یہ مدت ان کے نزدیک وعدہ اور ہبہ غیر مقبوض کی طرح ہے، حارث عکلی اور ان کے اصحاب اور امام ابراہیم نخعی کا بھی یہی قول ہے، اور ابن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ ہم بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں، امام مالکؒ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ جب کسی مدت تک کے لئے قرض دے دیا تو دائن اس مدت سے پہلے قرض واپس لینا چاہے تو واپس نہیں لے سکتا۔

لہٰذا جو فقہاء اور علماء یہ کہتے ہیں کہ "قرض مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوتا" ان کے نزدیک "ضع وتعجل" کا اصول قرض میں جائز ہے، اس لئے کہ ان کے نزدیک قرض دیون حالہ میں سے ہے، اور "دیون حالہ" میں "ضع وتعجل" کا اصول جاری کرنا جائز ہے، اور اس کے اصل حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ پر دین تھا جب حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی حضرت عبداللہؓ سے ملاقات ہوئی تو ان کو پکڑ لیا، اور دونوں قرض پر زور زور سے گفتگو کرنے لگے، اتنے میں حضور اقدس ﷺ وہاں سے گزرے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہ دونوں قرض پر جھگڑ رہے ہیں تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ فرمایا گویا کہ آپ ﷺ فرما رہے ہیں کہ نصف قرض لے لو، اور نصف چھوڑ دو۔ چنانچہ انہوں نے نصف لے لیا اور نصف چھوڑ دیا۔

(امام بخاری نے صحیح بخاری میں اس کو کئی جگہ روایت کیا ہے، اور یہ الفاظ "کتاب الخصومات" باب فی الملازمة، حدیث نمبر: ۲۴۲۴ میں مذکور ہیں)

تعجیل کی صورت میں بلاشرط کے دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا:

دین مؤجل اگر جلد ادا کر دیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے جب یہ ''چھوڑنا'' تعجیل کے لئے شرط نہ ہو، بلکہ تبرعاً دائن کچھ دین ساقط کر دے، لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو، تو اس صورت میں سقوط اور کمی جائز نہیں، چنانچہ علامہ جصاص رحمۃ اللہ علیہ ''ضع و تعجل'' کے جواز پر جتنے آثار اور روایات ملی ہیں، ان کو اسی پر محمول کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ومن اجاز من السلف اذا قال: عجل لی و ضع عنك، فجائز ان يكون اجازوه اذا لم يجعله شرطا فيه، وذلك بان يضع عنه بغير شرط، ويعجل الاخر الباقی بغير شرط.

(احکام القرآن للجصاص: ٤٦٧/١، آیت ربا)

جن اسلاف نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے کہے کہ ''تم میرا دین جلدی ادا کر دو، میں تمہیں کچھ دین معاف کر دوں گا'' بظاہر تو انہوں نے جواز کا یہ قول اس صورت میں اختیار کیا ہے، جبکہ دین میں یہ کمی تعجیل کے ساتھ مشروط نہ ہو، دائن بغیر شرط کے دین کا کچھ حصہ ساقط کر دے، اور مدیون بغیر کسی شرط کے دین جلدی ادا کر دے۔

(ماخوذ از فقہی مقالات: ١/ ١٠٠ ـ ١١٥)

میراث سے صلح (تخارج) کے چار اہم مسائل:

تخارج کی چند صورتوں کو وضاحت کے لئے سوال و جواب کی صورت میں نقل کئے دیتے ہیں تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

سوال: ایک آدمی کو وفات پائے عرصہ پانچ سال گزر گیا، اس نے ورثاء میں ایک بیوی پانچ لڑکے چھ لڑکیاں چھوڑی ہیں، فوت ہونے کے بعد فوراً جائیداد تقسیم کر دی گئی، جائیداد غیر منقولہ میں ½۳۵ ایکڑ زمین ایک گھر اور ایک پلاٹ تھا، اور منقولہ جائیداد میں چوپائے، زیورات اور گھریلو سامان تھا، گھریلو سامان، زیورات، چوپائے اور جانوروں کی قیمت لگائی گئی اور ساتھ ہی بڑے لڑکے پر جو تیرہ سو روپے قرض تھا وہ بھی اس قیمت میں جمع کیا گیا، کل رقم چودہ ہزار روپے بنی جو ورثاء کے حصص کے مطابق تقسیم کر کے ہر ایک وارث کا حصہ متعین کر دیا گیا، پھر تین بڑی

لڑکیوں سے جو عاقلہ بالغہ شادی شدہ تھیں پوچھا گیا کہ آپ اپنا حصہ جائیداد سے لینا چاہتی ہیں یا دوسرے ورثاء کے حق میں دست بردار ہوتی ہیں؟ تینوں نے منقولہ جائیداد سے چند متعین چیزیں لیکر باقی حصہ اپنے پانچ بھائیوں کو بخش دیا۔ ایک لڑکی نے ایک ہزار روپے قیمت والی بھینس لیکر باقی حصہ جائیداد بھائیوں کو بخش دیا، دوسری نے سلائی مشین چار سو روپے قیمت کی اور گائے پانچ سو کی لے کر باقی حصہ بھائیوں کو بخش دیا، تیسری نے ۱۰ ایکڑ زمین لے کر باقی حصہ بھائیوں کو بخشا۔

اب پانچ سال گزرنے پر بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ تخارج باطل ہے، جائیداد کی از سر نو تقسیم ہوگی، اس لئے کہ صحت تخارج کے لئے ایک تو تمام ورثاء کا عاقل ہونا شرط ہے، حالانکہ اس وقت ان میں ایک لڑکا ۱۴ سال کا تھا۔

دوسری وجہ یہ کہ ایک وارث پر دین تھا اور ترکہ میں دین ہونے کی صورت میں تخارج باطل ہو جاتا ہے، حالانکہ یہ دین وارث پر تھا جو منقول جائیداد کے ساتھ شامل کر کے ورثہ پر تقسیم کیا گیا تھا بایں صورت کہ جس وارث پر دین تھا اس وارث ہی کے حصہ میں اس کو مجرا کیا گیا تھا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

یہاں چار امور قابل تحقیق ہیں:

(۱) میت کا کسی وارث پر دین ہو تو وہ تخارج سے مانع ہے یا نہیں؟

(۲) مصالح اپنا حصہ صرف بعض وارثوں کو دے دوسروں کو نہ دے تو تخارج صحیح ہوگا یا نہیں؟

(۳) تخارج بغبن فاحش صحیح ہے یا نہیں؟

(٤) وارثوں میں کوئی صغیر ہو تو تخارج درست ہے یا نہیں؟

ان امور اربعہ کی تحقیق بالترتیب تحریر کی جاتی ہے:

۱۔ اگر ترکہ منقولہ میں مدیون کے حصۂ میراث سے دین زائد ہو تو تخارج سے مانع ہے ورنہ نہیں، اس لئے کہ منع دین کی علت "تملیك الدین من غیر من علیه الدین" ہے جو کہ ترکہ منقولہ میں حصۂ میراث سے متجاوز دین میں موجود ہے کہ مصالح مدیون کے علاوہ دوسرے وارثوں کو بھی دین کا مالک بنا رہا ہے مگر ترکہ منقولہ سے غیر متجاوز دین میں یہ علت مفقود ہے اس لئے کہ

ترکہ منقولہ کی تقسیم میں اس کی قیمت لگا کر تقسیم کرنے کا دستور ہے، اور ظاہر ہے کہ کل ورثاء کی تراضی سے دین کو مدیون کے حصہ میں محسوب کیا جائے گا۔

فهو حيث الدين ممن عليه الدين وهو جائز.

مسئلہ زیر نظر میں یہی صورت ہے، اس لئے یہ دین تحت تخارج سے مانع نہیں۔

۲. اگر بدل صلح ترکہ سے نہیں قرار پایا، بلکہ مصالح اپنے پاس سے ادا کرتا ہے تو یہ تخارج مطلقاً صحیح ہے اور اگر ترکہ سے بدل صلح قرار پایا تو اس میں چونکہ سب وارثوں کا حق ہے اس لئے اس کی صحت کے لئے سب کی رضامندی شرط ہے۔

قال العلائی رحمه الله تعالیٰ: ولو اخرجوا واحدًا من الورثة فحصة تقسم بين الباقي على السواء ان كان ما اعطوه من مالهم غير الميراث وان كان المعطى مما ورثوه فعلى قدر ميراثهم يقسم بينهم،

وقال ابن عابدين رحمه الله تعالیٰ: افاد ان احد الورثة اذا صالح البعض دون الباقي يصح وتكون حصته له فقط كذا لو صالح الموصى له كما في النقروی سائحانی. (ردالمحتار: ٤/٥٣٧)

قلت: في مسألتنا وقع التخارج بتراضي الورثة فاندفع هذا الاشكال ايضا لكن بقي رضا الصغير وسيأتي حكمه.

۳. بدل صلح خواہ کتنا ہی قلیل ہو تخارج جائز ہے، البتہ اگر کسی کے ساتھ یوں دھوکا ہوا کہ بوقت صلح وہ کسی چیز کی صحیح قیمت سے آگاہ نہ تھا بعد میں غبن فاحش ظاہر ہوا تو اس کو قاضی سے صلح فسخ کرانے کا اختیار ہے۔

في شرح التنوير: ولو ظهر غبن فاحش لايدخل تحت التقويم في القسمة فان كانت بقضاء بطلت اتفاقا لان تصرف القاضي مقيد بالعدل ولم يوجد ولو وقعت بالتراضي تبطل ايضافي الاصح لان شرط جوازها المعادلة ولم توجد فوجب نقضها خلافاً لتصحيح الخلاصة قلت فلو قال كالكنز تفسخ لكان اولى وتسمع دعواه ذلك اي ما ذكرمن الغبن الفاحش ان لم يقر بالاستيفاء وان اقربه لا.

وفی الحاشیة : (ولو ظهر غبن فاحش فی القسمة) ای فی التقویم للقسمة بأن قوم بالف فظهر انه یساوی خمس مائة .

وفیها تحت (قوله قلت الخ) فمقتضاه انها تحتاج الی الفسخ وان معنی تبطل و بطلت له ابطالها و به یشعر قول الکنز تفسخ حیث لم یقل تنفسخ . (ردالمحتار : ۱۸۷/۵)

علائیہ کی عبارت مذکورہ سے بعض کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں بوجہ غبن فاحش تخارج باطل ہے، حالانکہ علائیہ وشامیہ کی عبارت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ تخارج کے بعد غبن فاحش کے ظہور سے خیار فسخ ہے اوراس کا دعویٰ مسموع ہے، غبن کہتے ہی اس نقصان کو ہیں جو عقد کے بعد ظاہر ہو، بوقت عقد جو نقصان ظاہر اور معلوم ہو وہ خواہ کتنا ہی فاحش ہو غبن نہیں، یہ امر محتاج بیان نہیں کہ تخارج میں بدل صلح کی کوئی کمیت مشروط نہیں، معہذا تسکین خاطر خام کے لئے چند امور تحریر کئے جاتے ہیں:

(۱) کتب مذہب میں تصریح ہے کہ بدل صلح سونا یا چاندی، یا مکیل یا موزون ہو تو صحت تخارج کے لئے یہ شرط ہے کہ بدل صلح اس چیز میں مصالح کے حصہ سے زائد ہو، آگے یہ کوئی شرط نہیں کہ کل ترکہ سے اس حصہ کی کیا نسبت ہو، اور اگر بدل صلح اشیاء مذکورہ سے نہ ہو تو اس میں کوئی کمیت بھی مشروط نہیں۔

(۲) تخارج بحکم بیع ہے اور بیع میں بتراضی متعاقدین بدلین میں تفاوت کثیر جائز ہے۔

(۳) قال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ : اوصی لرجل بثلث ماله ومات الموصی فصالح الوارث الموصی له من الثلث بالسدس جاز الصلح وذکر الامام المعروف بخواهرُ زاده ان حق الموصی له وحق الوارث قبل القسمة غیر متأکد یحتمل السقوط بالاسقاط اهـ .

(رد المحتار : ۵۳۶/٤)

اس میں اسقاط بالصلح مراد ہے، مطلق اسقاط صحیح نہیں کما حررت فی کتاب الوصیة والفرائض تحت عنوان ''وارث کا حق اس کے اسقاط سے ساقط نہیں ہوتا۔'' احسن الفتاویٰ جلد ۹ میں۔

اسقاط بالصلح کی مثال کی عبارت مذکورہ میں صلح من الثلث بالسدس مذکور ہے جس میں تضعیف وتنصیف کی نسبت ہے اور خود علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالی نے غبن فاحش کی مثال میں یہی نسبت بیان فرمائی ہے۔

کما مر فی نصه : بأن قوم بالف فظهر انه یساوی خمس مائة .

اس سے ثابت ہوا کہ تفاوت فاحش کے باوجود تخارج جائز ہے۔

(٤) اگر صغیر خود عاقد ہو تو بیع وشراء وغیرہ عقود دائرہ بین النفع والضرر کی طرح عقد صلح میں بھی صغیر کا عاقل ہونا شرط ہے، بلوغ شرط نہیں۔

صغیر غیر عاقل کا عقد منعقد نہیں ہوتا اور عاقل غیر ماذون کا عقد منعقد ہو جاتا ہے، مگر اذن بعد البلوغ یا اذن ولی پر موقوف ہے۔

ولی فی المال بالترتیب یہ ہیں:

باپ، اس کا وصی، دادا، اس کا وصی، قاضی۔

فی صلح شرح التنویر : وشرطه العقل لا البلوغ والحرية فصح من صبی مأذون ان عری صلحه عن ضرر بین .

(رد المحتار : ٥٢٦/٤)

وفی الهندية : واما شرائطه فانواع منها ان یکون المصالح عاقلا فلا یصح صلح المجنون والصبی الذی لا یعقل هکذا فی البدائع .

(عالمگیریة : ٢٢٩/٤)

وفی کتاب المأذون من شرح التنویر : وتصرف الصبی والمعتوه الذی یعقل البیع والشراء ان کان نافعاً محضا کالاسلام والاتهاب صح بلا اذن وان کان ضارًا کالطلاق والعتاق والصدقة والقرض لا وان اذن به ولیهما وما تردد من العقود بین نفع وضرر کالبیع والشراء توقف علی الأذن حتی لو بلغ فاجازه نفذ فان اذن لهما الولی فهما فی شراء وبیع کعبد مأذون فی کل احکامه. (رد المحتار: ١٢١/٥)

اور اگر صبی خود مباشر عقد نہ ہو بلکہ اس کی طرف سے کوئی دوسرا عقد کرے تو صبی کا عاقل ہونا

شرط نہیں، بہر صورت صلح منعقد ہو جائے گی، البتہ اس عقد کے نفاذ کے لئے یہ شرط ہے کہ صبی کی طرف سے اس کا ولی فی المال عقد کرے، اگر غیر ولی نے عقد کیا تو وہ منعقد تو ہو جائے گا مگر صبی کے اذن بعد البلوغ یا اذن ولی یا اذن قاضی پر موقوف رہے گا۔

البتہ تقسیم غیر ترکہ میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ عام عقود فضولی کی طرح یہ بھی موقوف ہے، دوسرا قول یہ کہ یہ تقسیم باطل یعنی منعقد نہیں ہوتی، رحمتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے وجہ الفرق یہ بیان فرمائی ہے کہ انعقاد عقد فضولی میں وجود متعاقدین شرط ہے جو یہاں مفقود ہے۔

وسنذكر نصه عن الرافعي رحمه الله تعالىٰ .

قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : قال في المحيط فلو قسم بغير قضاء لم تجز الا ان يحضر (الغائب) او يبلغ (الصغير) فيجيز طوری وهذا ما قدمه الشارح . (رد المحتار : ١٨٢/٥)

ونص الشارح المتقدم : وصحت برضا الشركاء الا اذا كان فيهم صغير او مجنون لا نائب عنه او غائب لا وكيل عنه لعدم لزومها حينئذ الا باجازة القاضي او الغائب او الصبي اذا بلغ او وليه هذا لو ورثة ولو شركاء بطلت منية المفتي وغيرها .

وقال ابن عابدين رحمه الله تعالى : (قوله اذا كان) استثناء منقطع كما يفيده قوله بعد لعدم لزومها او استثناء من محذوف اى ولزمت اه ط او اراد بالصحة اللزوم (قوله الا باجازة القاضي) الظاهر رجوعه للمستثنيات الثلاث (قوله او الغائب او الصبي اذا بلغ) ولو مات الغائب او الصبي فاجازت ورثته نفذت عندهما خلافا لمحمد منية المفتي والاول استحسان والثاني قياس وكما تثبت الاجازة صريحا بالقول تثبت دلالة بالفعل كالبيع كما في التاتار خانية وفي المنح عن الجواهر : طفل وبالغ اقتسما شيئا ثم بلغ الطفل وتصرف في نصيبه وباع البعض يكون اجازة (قوله هذا) اى لزومها باجازة القاضي ونحوه لو كانوا شركاء في الميراث فلو شركاء في

غیرہ تبطل و مقتضاہ انہا لا تنفذ بالاجازۃ فلیتأمل .

وعبارۃ المنیۃ ھکذا : اقتسم الورثۃ لابامر القاضی وفیھم صغیر او غائب لا تنفذ الا باجازۃ الغائب او ولی الصغیر او یجیز اذا بلغ اقتسم الشرکاء فیما بینھم وفیھم صغیرا وغائب لا تصح القسمۃ فان امرھم القاضی بذلک صح .

اقول : سیذکر المصنف تبعا لسائر المتون ان القاضی لا یقسم لو کانوا مشترین وغاب احدھم فکیف تصح قسمۃ الشرکاء بامر القاضی ، اللھم الاان یراد بہ الشرکاء فی المیراث لکن یبقی قول الشارح ولو شرکاء بطلت محتاجا الی نقل ونقل الزاھدی فی قنیتہ : قسمت بین الشرکاء وفیھم شریک غائب فلما وقف علیھا قال لا ارضی لغبن فیھا ثم اذن لحراثہ فی زراعۃ نصیبہ لا یکون رضا بعد ما رد فلیحرر وولا تنس ماقدمہ من ان للشریک اخذ حصتہ من المثلی بغیبۃ صاحبہ وما نقلہ عن الخانیۃ فانہ مخصص لما ھنا .

(رد المحتار : ۵/ ۱۸۰)

وقال الرافعی رحمہ اللہ تعالیٰ : (قولہ الظاھر رجوعہ للمستثنیات الثلاث) یدل لہ ما نقلہ فی المنح عن السراج بقولہ ولھم ان یقسموا الانفسھم اذا تراضوا الا ان یکون فیھم صغیرلاولی لہ اوغائب لاوکیل عنہ فحینئذ لا تجوز بالاصطلاح بل لا بد من القاضی لانہ لا ولایۃ لھم علی الصغیر ولا علی الغائب فان امر القاضی بھا جاز علی الصغیر والغائب لان لہ ولایۃ علی الصغیر ونظراً علی الغائب وتصرفہ یصح علی المیت (قولہ لکن یبقی قول الشارح ولوشرکاء بطلت محتاجا الی نقل) .

علل البطلان الرحمتی فی ھذہ المسألۃ بأن کل واحد اجنبی فی حق صاحبہ فلم یوجد قابل عن الصغیر ونحوہ وشرط عقد الفضولی

وجود القابل عن المالك ولا يتوقف شرط العقد على غائب بخلاف مسألة الورثة لان بعضهم يصلح خصيما عن الباقين فيصح ان يكون بعضهم مقاسما وبعضهم مقاسما اهـ ومعلوم ان الشارح ثقة في النقل يعتمد عليه فيه حتى يوجد ما يخالفه .

(التحرير المختار : ٢٩٦/٢)

تحقیق مذکور سے ثابت ہوا کہ عبارات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ میں جہاں وجود صغیر صحت تقسیم ترکہ سے مانع بتایا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم لازم و نافذ نہیں بلکہ اذن ولی یا اذن والی یا اذن بعد البلوغ پر موقوف ہے، اس لئے ان عبارات سے بعض اصاغر کا عدم انعقاد پر استدلال غلط فہمی پر مبنی ہے۔

مسئلہ زیر بحث:

امور بالا کی تحقیق سے مسئلہ زیر بحث صاف ہو گیا اس میں صغیر کی طرف سے غیر ولی نے عقد تخارج کیا ہے اس لئے تخارج علی الارض کا عقد موقوف ہے، کوئی وارث قاضی سے اذن حاصل کرلے تو یہ عقد نافذ ہو جائے گا ورنہ صغیر کے اذن بعد البلوغ تک موقوف رہے گا، اگر صغیر قبل البلوغ فوت ہو گیا تو اس کے ورثاء کے اذن سے نافذ ہو جائے گا۔

تخارج علی العروض کا عقد ابتداء ہی سے نافذ و لازم ہے۔

لان للام والاخ بيع المنقول من مال الصغير لغيره تجارة .

وما رأيت حكم فسخ احد من الشركاء تلك القسمة قبل الاذن ،

والظاهر الجواز كما في سائر العقود الموقوفة .

(۱) ارض صغیر کی بیع کا ولی کو اختیار نہیں الا فی صور مخصوصۃ، لیکن ولی کو تقسیم عقار کا اختیار ہے اس لئے کہ تقسیم من کل الوجوہ بیع نہیں بلکہ من وجہ بیع ہے اور من وجہ افراز۔

(۲) باپ اور اس کے وصی، دادا، اور اس کے وصی، اور قاضی کے سوا کسی دوسرے کو جس طرح صغیر کے لئے تقسیم کا اختیار نہیں اسی طرح صغیر کے مال میں تصرف کا بھی اختیار نہیں اس کے مال میں تجارت اور زمین میں زراعت وغیرہ کی اجازت نہیں، البتہ صغیر کی ماں، بھائی اور چچا کو

اس کے مال کی حفاظت، بیع منقول بغرض حفاظت اور صغیر کے لئے طعام ولباس وغیرہ ضروریات خریدنے کی اجازت شرط ہے بشرطیکہ صغیر ان کی پرورش میں ہو، البتہ خود ترکہ میں طعام یا لباس ہو تو اس سے صغیر کا حصہ اس پر خرچ کرنے میں صغیر کا زیر پرورش ہونا شرط نہیں۔

قال فی التنویر : او اشتری الوارث الکبیر طعاما او کسوة للصغیر من مال نفسه .

وفی الشرح : فانه یرجع ولا یکون متطوعا .

وفی الحاشیة : کذا فی الخانیة ، ونصها او اشتری الوارث الکبیر طعاما او کسوة للصغیر من مال نفسه لا یکون متطوعا وکان له الرجوع فی مال المیت والترکة اه، اقول : ولم یشترط الاشهاد مع ان فی انفاق الوصی خلافا کما مر وینبغی جریانه هنا بالاولی علی انه قد وقع الاختلاف فی انفاقه علی الصغیر نصیبه من الترکة نفقة مثله فی انه یصدق ام لا قولان حکاهما الزاهدی فی الحاوی ، ثم قال والمختار للفتوی مافی وصایا المحیط بروایة ابن سماعة عن محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ مات عن ابنین صغیر وکبیر والف درهم فانفق علی الصغیر خمس مائة نفقة مثله فهو متطوع اذا لم یکن وصیا ولو کان المشترک طعاما او ثوبا واطعمه الکبیر الصغیر او البسه فاستحسن ان لا یکون علی الکبیر ضمان اهـ .

وفی جامع الفتاوی ولو انفق الاخ الکبیر علی اخیه الصغیر من نصیبه من الترکة ان کان طعاما لم یضمن وان کان دراهم فکذلك ان کان فی حجره وفی غیر ذلك یضمن ان لم یکن وصیاه ومثله فی التاترخانیة وقدم المصنف فی فصل البیع من کتاب الکراهیة والاستحسان انه یجوز شراء مالا بد للصغیر منه وبیعه لأخ وعم وام وملتقط هو فی حجرهم وجارته لامه فقط اه، ومثله فی الهدایة وعلیه فیمکن حمل ما مر عن محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ علی ماذا لم یکن فی

حجره وتأمل وهو حسن لكن فما في الخانية مشكل لأن لم يكن الكبير وصيا فليتأمل (رد المحتار ٥/٥٠٧)

غرضیکہ واقعہ معہودہ میں حقیقی ماں اور بھائیوں پر لازم ہے کہ اس کے حصہ کی زمین حکومت کی تحویل میں دیں۔

(۳) اوپر جو تحقیق لکھی گئی ہے وہ نفس مسئلہ سے متعلق ہے صورت زیر نظر میں اگر بہنوں نے بھائیوں کی ناراضی کے خوف یا رواج کے دباؤ سے ایثار کیا ہے تو بھائیوں کے ذمہ ان کا شرعی حق باقی ہے، واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

ایک وارث کا دوسرے ورثاء کو کچھ رقم دیکر انکے حصہ سے صلح کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کے پاس زمین ہے جس میں بعض ورثاء کا حق ہے جو ان کو دیا نہیں گیا اب یہ شخص دوسرے ورثاء کے سامنے مثلاً دوسو روپے پیش کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ تمہارا جو حق اس جائیداد میں ہے اس کے عوض تم مجھ سے اتنے روپے لے لو، باقی چھوڑ دو، یا باقی سے مجھ کو بری کر دو یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ فقط

الجواب: قال في الهداية: واذا كانت التركة بين ورثة فاخرجوا احدهم منها بمال اعطوه اياه والتركة عقار او عروض جار قليلاً كان ماأعطوه اياه او كثيراً لأنه امكن تصحيحه بيعا وان كانت التركة فضة فاعطوه ذهبا او ذهبا فاعطوه فضة فكذالك لانه بيع الجنس بخلاف الجنس ويعتبر التقابض في المجلس لانه صرف وان كانت التركة ذهبا وفضة فصالحوه على فضة او ذهب فلا بد ان يكون ما اعطوه اكثر من نصيبه من ذلك الجنس ولو كان في التركة الدراهم والدنانير وبدل الصلح دراهم او دنانير ايضا جاز الصلح كيف ما كان صرفاً للجنس الى خلاف الجنس لكن يشترط التقابض للصرف اهـ. (٢/٢٤٠)

صورت مسئولہ میں یہ طریقہ جائز ہے کہ ایک وارث سے دوسرا وارث یوں کہے کہ تمہارا جو حق ترکہ میں ہے اس کے عوض تم مجھ سے اتنی رقم لے لو یا یوں کہے کہ میں تم کو یہ رقم اس شرط پر

دیتا ہوں کہ تم اپنے باقی ترکہ سے خارج اور ادعویٰ ہو جاؤ یا باقی ترکہ سے صلح کے طور پر یہ رقم لے لو یا باقی مجھ کو چھوڑ دو کیوں کہ ان سب صورتوں میں کلام کو صلح پر محمول کرنا ممکن ہے، اور صلح بحکم بیع جائیداد اور سامان غیر نقد میں تو اس طرح معاملہ کرنا مطلقاً درست ہے خواہ اس وارث کا حق نقدین میں بھی ہو اور اس سے بھی صلح کرنا مقصود ہو تو اس میں بعض قیود کی رعایت ضروری ہے جو عبارت عربیہ میں مذکور ہیں۔ فقط حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

تنبیہ ضروری:

آج کل بہنوں کو عام طور سے میراث نہیں دی جاتی اور محض رسم کی وجہ سے ہمشیرہ بھی لینے سے انکار کردیتی ہیں اور ایسے مواقع پر اس قسم کے حیلے فقط ظاہری طور پر کئے جاتے ہیں، دل سے ہمشیرہ رضامند نہیں ہوتی سو ایسے حیلہ سے مال حلال نہ ہوگا، بلکہ جہاں دلی رضامندی سے ہمشیرہ صلح کرنا چاہے اس صورت پر وہاں عمل کیا جاوے اس کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ فقط

(ماخوذ از امداد الاحکام: ۱۳۹/٤)

ترکہ میں رجوع عن الصلح کی ایک صورت:

سوال: ایک عورت کا انتقال ہوا، ورثاء میں اس کے شوہر اور ماں، باپ، دادا، اور دو بیٹے ہیں، تقسیم ترکہ کے وقت زوج نے کہا کہ میں نے سب مال سے یہ چیزیں معینہ لے لی ہیں اور باقی سب مال تم کو چھوڑ دیا ہے، تم یعنی ماں، باپ، دادا اور دو بیٹے باہم تقسیم کرلو ام اور اب اس پر راضی ہوگئے اور دونوں بیٹے اس شوہر کے صغیر ہیں اس کے بعد ان کو یہ فکر ہوئی کہ اب زوج تو نکل گیا اور ماں باپ اور دو لڑکوں کے درمیان تقسیم کس طرح ہوگی، مسئلہ ان کو معلوم نہ تھا، زوج نے کہا کہ میں اس صلح سے رجوع کرتا ہوں اور تقسیم میں پھر شریک ہوتا ہوں اور سہام بنا کر پورا پورا حصہ لینے میں زوج نے رجوع کرلیا اور کل مال کا ربع لے لیا اور سدس ماں اور سدس باپ نے لے لیا اور باقی مال دونوں لڑکوں کو دیدیا تو کیا زوج کا یہ رجوع صحیح ہے، اگر زوج رجوع نہ کرتا تو بقایا ورثاء کو مال زیادہ آتا اس لئے کہ زوج نے تھوڑی چیزیں لے کر صلح کی تھی۔

الجواب: قال فی الدار الصلح ان کان بمعنی المعاوضة بأن کان دیناً بعین ینتقض بنقضھا ای بفسخ المتصالحین وان کان لا بمعناھا ای المعاوضة بل بمعنی استیفاء البعض واسقاط البعض فلا

تصح اقالة ولا نقضه لأن الساقط لا یعود . اھ (٥/٧٣٣)

صورت مسئولہ میں نقض صلح جائز نہیں کیوں کہ ورثاء میں نابالغ بھی ہیں اور نابالغ کے حق میں صلح مفید تھی، اور نقض صلح مضر ہے، اور نقض صلح بدون تراضی ورثاء درست نہیں، اور نابالغ کی رضا معتبر نہیں، دوسری اس صلح میں استیفاء بعض واسقاط بعض ہے۔ معاوضہ کی صورت نہیں اس لئے بتراضی ورثاء بالغین کے حق میں بھی صلح منتقض نہیں ہو سکتی پس زوج نے جو اشیاء اول لے لی ہیں وہی اس کا حق ہے باقی کے چھ سہام کر کے ایک سہم ماں کا ایک سہم باپ کا حق ہے اور چار سہام لڑکوں کے ہیں دو ایک کے دو ایک کے۔ واللہ اعلم

(ماخوذ از امداد الاحکام : ٤/١٤٢)

احکام الوقف

الوقف لغۃ:

الحبس یقال : وقف داره أو ماله فی سبیل الله ای حبسها وخصصها فی وجوه الخیر ، طلبا لمرضاة الله ، ولا یقال أوقف الا فی لغة ردیئة والافصح أن یقال : وقفها .

وقف کے لغوی معنیٰ روکنا، لہٰذا وقف مالہ فی سبیل اللہ کا معنیٰ ہے، مال کو نیک کاموں میں خرچ کرنے کے لئے خاص کر دینا۔

الوقف شرعاً:

هو اخراج شئی من ملکه وجعله ملکا لله عزوجل ، موقوفا فی وجوه الخیر کالمسجد ، والمدرسه، والمستشفیٰ ، واجراء الماء، وسقی الحجاج والمعتمرین ، وسائر وجوه الخیر والاحسان ، ابتغاء الاجر والثواب،وهذا ما یسمی الوقف الخیری . (فقه المعاملات)

وقف کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ: اپنی مملوکہ مال کو اپنی ملک سے نکال کر اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کر دینا اور وجوہِ خیر، مساجد، مدارس، ہسپتال، پانی کا کنواں، یا حجاج کرام اور معتمرین کو پانی پلانا، اسی طرح دیگر کارِ خیر کے مال کو خاص کر دینا، وقف ہے۔

وقف کی مشروعیت:

اپنے اموال کو کارِ خیر کے لئے وقف کرنا یہ شرعاً مطلوب ومحمود ہے انسان کے انتقال کے بعد ایک عرصہ دراز تک اجر وثواب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ جوانی، صحت وعافیت، وتندرستی کے زمانہ میں اعمال صالحہ میں عام طور پر کمی کوتاہی ہو جاتی ہے، اور آخری عمر میں مؤمن میں اعمالِ صالحہ کی رغبت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن قویٰ کمزور ہونے کی وجہ سے جوانی وصحت کے زمانہ کی طرح اعمال انجام دینے پر قدرت برقرار نہیں رہتی، دوسری طرف موت کا وقت قریب نظر آتا ہے، اور آخرت کے لئے زیادہ سے زیادہ اجر وثواب حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے، تو شریعت مطہرہ نے بعض ایسے اعمال بتلائے کہ انسان کے مرنے کے بعد بھی ان کا ثواب برابر پہنچتا رہتا ہے، انہی اعمال میں سے ایک ''وقف للہ'' بھی ہے۔

كما روى عن النبي صلى الله عليه وسلم : اذا مات الانسان انقطع عمله الا من ثلاث، صدقة جارية، او علم ينتفع به، أو ولد يدعوله . (مسلم رقم ١٦٣١ ، في الوصية ، ترمذى : ١٣٧٦ ، ابو داؤد ٢٨٨٠ ، نسائى ٦/ ٢٥١ ، في الوصايا)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ، جب انسان کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ پر اجر وثواب کا ملنا بند ہو جاتا ہے مگر تین اعمال کے ثواب جاری رہتا ہے۔

(۱) صدقہ جاریہ۔

(مثلاً کوئی مسجد بنوادی، سبیل لگوادی، پانی کا کنواں کھودوایا، قرآن کریم کا مکتب مدرسہ بنوادیا، وغیرہ)

(۲) یا علم دین چھوڑ کر گیا جس سے لوگ فائدہ حاصل کرتے رہے، (مثلاً کسی کو دین کی تعلیم دی، کسی کو قرآن وحدیث پڑھایا، یا کوئی دینی کتاب تصنیف کی، یا قرآن کریم چھپوا کر تقسیم کیا وغیر ذالک)

(۳) یا کوئی صالح اولاد چھوڑ کر مرا جو اس کے حق میں دعا کرتی رہتی ہے۔

(مسلم ، ترمذی وغیرہ)

اس روایت میں صدقہٴ جاریہ سے مراد وقف ہی ہے جس شکل میں بھی ہو۔

اسلام میں سب سے پہلا وقف:

اسلام آنے کے بعد سب سے پہلا وقف جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، وہ مخیریق رضی اللہ عنہ کی زمین جو آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے لئے وصیت کی گئی تھی ان کے انتقال کے بعد جب آپ ﷺ کی ملکیت میں آئی تو آپ ﷺ نے وقف فرمادی، چنانچہ وہ زمین مدینۃ الرسول ﷺ میں ارض صدقۃ یعنی وقف زمین کے نام سے مشہور تھی اس کا تفصیلی واقعہ حدیث میں یوں مذکور ہے۔

قصة مخيريق: ومخيريق هو احد اكابراحبار اليهود، اسلم رضى الله عنه، وخرج يوم السبت ليعظ قومه، وسأل عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فقيل له: لقد خرج الى "أحد" لحرب أعدائه من قريش، فطلب من قومه الخروج لمساعدة رسول الله عليه السلام، كما هو العهدبينهم وبينه، فأبوا اعانته، فدخل بيته، ولبس عدّة الحرب، وحمل سلاح، وقال لأهله: اذا أنامت فى خروجى هذا، فمالى كله لرسول الله صلى الله عليه وسلم: وقاتل رضى الله عنه حتى قتل، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم "مخيريق سابق يهود" أى سابقهم الى الاسلام والى رضوان الله، ووقف رسول الله صلى الله عليه وسلم هذه الأرض التى أوصىٰ له بها"مخيريق" فكانت أول وقفٍ فى الاسلام.

(انظر ملتقى الابحر: ١/٣٩٩ لفضيلة الشيخ وهبى سليمان الالبانى بتحقيقه)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو بھی اس کی ترغیب دی اور صحابہ کرام میں بھی وقف کا سلسلہ جاری رہا بہت سے باغات اور زمین پانی کے کنویں وغیرہ وقف کیے، جو سیرت و تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا وقف:

روى البخارى ومسلم عن عبدالله بن عمر رضى الله عنهما أنه قال: "أصاب عمر أرضاً بخيبر، فأتى النبى صلى الله عليه وسلم

يستأمره فيها، أي يستشيره ماذا يصنع بها، فقال يا رسول الله إني أصبت أرضا بخيبر، لم اصب قط مالا أنفس عندي منه، فما تأمرني فيها ؟

فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان شئت حبست اصلها، أي وقفتها في سبيل الله، وتصدقت بها، غير أنه لا يباع أصلها ولا يبتاع، أي ولا يشترى، ولا يوهب ولا يورث!!

قال: فتصدق بها عمر في الفقراء، وذوي القربى، والرقاب، وابن السبيل، والضيف، لا جناح، أي لا اثم على من وليها أن يأكل منها، أو يطعم صديقا بالمعروف، غير متأثل فيه مالا "أي غير متكسب منها المال.

فهذا وقف للأرض، وما يكون فيها من ثمر، من أمير المؤمنين عمر، رضي الله عنه وأرضاه.

یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں ایک زمین ملی تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر، اس زمین کے بارے میں مشورہ کیا، کہ یا رسول اللہ یہ زمین میرے لئے بہترین عمدہ اور پسندیدہ مال ہے، آپ مشورہ دیں کہ میں اس زمین کو کس مصرف میں لاؤں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ چاہیں تو اس کو اللہ کے لئے وقف کردیں اس طرح کہ پھر یہ زمین نہ فروخت ہو سکے گی، نہ کسی اور کو ہبہ ہو سکے گی، نہ ہی آپ کے انتقال کے بعد اس میں وراثت جاری ہوگی، ابن عمر فرماتے ہیں، اس مشورہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس زمین کو وقف فرما دیا، فقراء، قرابت دار، مسافر، غلام آزاد کرنے وغیرہ مصارف پر اس کی آمدن کو خرچ کیا جائے، اسی طرح جو اس وقف کا متولی ہوگا وہ بھی ضرورت کے وقت اس کی آمدن کو استعمال کر سکے گا البتہ متولی اس وقف کو مال جمع کرنے کا ذریعہ نہ بنائے۔

گویا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے زمین اور اس کے پھلوں کا وقف ہوا۔

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا وقف:

وروى الشيخان عن انس رضى الله أنه قال:

" كـان أبـو طـلحة رضى الله عنه أكثر الأنصار بالمدينة مالا من نـخـل ، و كان أحب أمواله اليه ، "بيْرحاء" بستان من نخيل ، و كانت مستقبلة المسجد ، و كان رسول الله صلى الله عليه و سلم يد خلها، ويشرب من ماء فيها طيب ، أي عذْب ، فلما نزلت هذه الآية ﴿ لنْ تـنـالُـوْا الْبـرَّ حَتّـىٰ تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ﴾ قام أبو طلحة الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله : ان الله أنزل عليك : ﴿ لنْ تـنـالُـوْا الْبرَّ حتَّىٰ تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ﴾ وان أحب مالي الى "بير حاء" وانهـا صدقة للّٰه تعالىٰ، أرجو برها و ذخرها، أى أرجو خيرها و أجرها عند اللّٰه تعالىٰ، فضعها يا رسول اللّٰه حيث أراك اللّٰه!!

فـقـال لـه رسـول الله صـلـى الله عليه وسلم : بخ، أى ما أحسن هـذا؟ ذلك مـال رابـح ، ذلك مـال رابح، وقد سمعت ما قلت ، واني أرىٰ أن تـجـعـلها في الأقربين !!فقال أبو طلحة : أفعل ذلك يا رسول اللّٰه فقسمها أبو طلحة في أقاربه وبني عمه " .

(اخرجه البخاري رقم : ١٤٦١ ، ومسلم رقم : ٩٩٨)

فـدل هـذا الـحـديث الشريف، على أن الوقف جائز في "الوقف الأهـلـي "كـما هو جائز في الوقف الخيري ، وقد أشار عليه صلى اللّٰه عليه وسلم أن يجعلها في أقاربه لعلمه بفقرهم .

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ مدینۃ الرسول ﷺ میں مالدار ترین انصاری صحابہ میں سے تھے، ان کا سب سے پسندیدہ محبوب مال ''بیرحاء'' نامی کھجور کا باغ تھا، وہ مسجد نبوی ﷺ کے سامنے کی جانب تھا، رسول اللہ ﷺ اس باغ میں تشریف لاتے اور عمدہ میٹھا پانی نوش فرماتے، جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی، ''لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ''یعنی تم خیر کامل کو کبھی حاصل نہ کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے، تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے، اور میرا پسندیدہ

مال "بیر حاء" ہی ہے اس کو اللہ کی راہ میں وقف کرتا ہوں، میں اللہ تعالیٰ سے اس کے اجر وثواب کی امید رکھتا ہوں، اے اللہ کے رسول آپ اس کو جس کارِ خیر میں چاہیں خرچ فرمائیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ذرا توقف کرو، غور وفکر کرو، یہ ایک نفع بخش مال ہے، میں نے آپ کی پوری گفتگو سن لی ہے، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ اس کو اپنے خاندان کے افراد کے لئے وقف کریں، تو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ میں اس کو اپنے خاندان کے افراد پر وقف کرتا ہوں، چنانچہ ابو طلحہؓ نے اس کو اپنے خاندان کے محتاج افراد پر تقسیم کر دیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا عام اوقاف کی طرح خاندان کے مستحق افراد کے حق میں وقف کرنا بھی جائز ہے۔

وقف کا حکم:

جب کوئی انسان اپنے کسی مال کو اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کردے، مثلاً یوں کہہ دے "وقفت هذه الدار على فقراء المسلمين، او هذا وقف الله عزوجل في حياتي وبعد وفاتي" یعنی میں نے اس گھر کو فقراء مسلمین پر وقف کردیا، یا یہ گھر اللہ کے لئے وقف ہے، میری زندگی اور میرے مرنے کے بعد، اب صرف زبان سے یہ مکمل جملہ کہہ دینے سے وقف تام ہوجائے گا، اور اس کی ملک سے موقوفہ زمین جائیداد نکل جائے گی یا کچھ اور بھی تصرف کی ضرورت ہے؟

اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ وقف تام ہونے اور موقوف کا واقف کی ملک سے نکلنے کے لئے دو باتوں میں سے کسی ایک بات کا ہونا ضروری ہے:

(۱) حاکم فیصلہ کردے کہ یہ وقف عام مسلمانوں کے لئے ہوگیا ہے۔

(۲) وہ واقف یوں کہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا گھر یا زمین جائیداد فلاں پر یعنی فلاں مسجد یا فلاں مدرسہ پر وقف ہے اب واقف کا انتقال ہوتے ہی اس کی ملک ختم ہوجائے گی لیکن صاحبین اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ صرف زبانی وقف کرنے سے وقف تام ہوجاتا ہے اور واقف کی ملک ختم ہوجاتی ہے، اب وقف سے رجوع کرنا جائز نہیں۔

وقد جاء في ملتقى الابحر قوله: الوقف عند ابي يوسف ومحمد هو حبس العين على ملك الله تعالىٰ على وجه يعود نفعه الى العباد، ويلزم بزوال ملكه بمجرد القول وهو المختار للفتوىٰ.

(ملتقى الابحر للحلبی : ۱/ ۴۰۰)

موت کے بعد جن اعمال کا ثواب جاری رہتا ہے:

پہلے مشروعیت کے تحت حدیث گذر چکی ہے کہ بعض اعمال کا ثواب موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے، ان میں سے تین کا تذکرہ اس حدیث کے ضمن میں گذر چکا ہے، دوسری حدیث میں اس سے زیادہ تفصیل ہے۔

كما اخرجه ابن ماجه فی سننه عن النبی صلی اللّٰه علیه و سلم انه قال:

"ان مما يلحق المؤمن من عمله و حسناته بعد موته ، علما نشره، أو ولدا صالحا تركه، أو مصحفا ورثه، أو مسجدا بناه ، أو بيتا لابن السبيل ، أی الغريب المسافر بناه، أو نهر اجراه ، أو صدقة اخرجها من ماله فی صحته و حياته تلحقه بعد موته"

(اخرجه ابن ماجه رقم : ۲۱۴ فی المقدمة)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جن اعمال کا ثواب انسان کو موت کے بعد بھی ملتا رہتا ہے ان میں سے (۱) ایک علم ہے جس کی اس نے اشاعت کی (۲) نیک اولاد جن کو پیچھے چھوڑ کر گیا ہو (۳) قرآن کریم جو وراثت میں چھوڑا ہو (۴) مسجد تعمیر کی ہو (۵) یا کوئی مسافر خانہ بنایا ہو (اس دور میں اس کی بہترین مثال مدارس ہیں جہاں مسافر طلبہ قیام کرتے ہیں) (۶) پانی کے لئے نہر جاری کی ہو (تاکہ لوگ اس سے پانی پئیں) (۷) صدقہ جو اس نے زندگی میں صحت و تندرستی کے زمانہ میں نکالا ہو، اس حدیث میں سات کا تذکرہ ہے، امام سیوطیؒ نے دس تک گنوائے ہیں، ان کو چند ابیات میں نظم کیا ہے۔

كما قال:

اذا مات ابن آدم ليس يجری
عليه من فعال غير عشر
علوم بثها، و دعاء نجل
و غرس النخل ، و الصدقات تجری

ورائة مصحف، ورباط ثغر
وحفر البئر، أو اجراء نهر
وبيت للغريب بناه ياؤى
اليه، أو بناء محل ذكر

(فقه المعاملات)

اشیاء منقولہ وقف کرنے کا حکم:

جس طرح زمین اور جائیداد اور غیر منقولی اشیاء کا وقف جائز ہے، اسی طرح منقولی اشیاء کا وقف بھی جائز ہے، مثلاً قرآن کریم، کتب دینیہ، گھوڑے، اسلحہ وغیرہ، صحابہ کرام سے ان اشیاء کا وقف بھی ثابت ہے۔

قال الحميدى : تصدق ابو بكر بداره بمكة على ولده ، فهى الى اليوم، وتصدق عمر بربعه عند المروة على ولده ، وتصدق عثمان ببئر رومة، كانت البئر ملكاً ليهودى فاشتراها عثمان وجعلها صدقة على المسلمين، وتصدق على بأرضه بينبع ، وتصدق سعد بداره بالمدينة وتصدق عمرو بن العاص ببستان له بالطائف، وذلك كله الى اليوم،

قال جابر : لم يكن احد من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم ذو مقدرة الا وقف، واشتهر ذلك فلم ينكره أحد، فكان اجماعاً .

(المغنى لابن قدامه : ٥٩٨/٥)

وروى البخارى عن "عمرو بن الحارث" قال : ما ترك رسول الله صلى الله عليه وسلم عند موته دينارًا ولا درهما ، ولا عبدًا ولا امةً، ولا شئيا الا بغلته البيضاء ، التى كان يركبها وسلاحه، وأرضاً جعلها لابن السبيل .

(اخرجه البخارى فى الجهاد : ١٤٩/٢ ،وفى الزكوٰة)

امام بخاری رحمہ اللہ نے عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے موت کے وقت کوئی درہم، دینار، غلام، باندی اپنی ملک میں نہیں چھوڑا، سوائے اپنا سفید خچر

جس سواری فرماتے اور اسلحہ اور زمین جن کی وقف فرمادیا تھا۔

وقال صلی اللّٰہ علیہ وسلم: "انکم تظلمون خالدًا، فقد حبَّس ادراعہ، واعتادہ، فی سبیل اللّٰہ" (اخرجہ البخاری: ۲/۱۵٦) أی وقفھا فی سبیل اللّٰہ، نصرۃ لدینہ، فدل ھذا علی جواز وقف غیر.

دراہم ودینار کا وقف:

، اسی طرح دراہم ودنانیر کا وقف بھی شرعاً صحیح ہے، مگر چونکہ وقف میں انتفاع بالمنافع مع بقاء العین ہوتا ہے، اس لئے وقف دراہم میں یہ شرط ہے کہ اصل دراہم کو خرچ نہ کریں بلکہ ان کے منافع خرچ کریں یا ان سے کوئی چیز خرید کر ان کے منافع کو فقراء پر خرچ کریں۔

(تفصیلہ فی الشامیۃ ، احسن الفتاویٰ: ٦/٤١٦)

مدرسہ میں دی ہوئی رقم واپس لینے کا حکم:

اگر کسی نے مدرسہ میں چندہ دیا بعد میں معلوم ہوا کہ مدرسہ صحیح اصولوں پر نہیں چل رہا ہے تو کیا یہ رقم واپس لی جاسکتی ہے یا نہیں؟ شرعاً اس کا حکم یہ ہے، چندہ کی رقم مدرسہ میں داخل ہونے سے معطین کی ملک سے خارج ہوجاتی ہے، لہٰذا دی ہوئی رقم واپس نہیں لی جاسکتی، البتہ بااثر افراد پر فرض ہے کہ مدرسہ کے منتظمین کی اصلاح کی کوشش کریں، اگر وہ اصلاح قبول نہ کریں تو انہیں معزول کرکے نظم ونسق کسی صالح شخص یا صالحین کی جماعت کے سپرد کریں۔

(ماخوذ از احسن الفتاویٰ: ٦/٤١٧)

وقف مشاع جائز نہیں:

صحت وقف کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اپنی ملک سے جدا کرکے متولی وقف یا کسی ذمہ دار کے حوالہ کردیا جائے لہٰذا مشترک غیر منقسم چیزوں کا وقف جائز نہیں، یہی قول مفتی بہ ہے۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللّٰہ تعالیٰ: ویفرز فلا یجوز وقف مشاع یقسم خلافا للثانی رحمہ اللّٰہ تعالیٰ:

وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللّٰہ تعالیٰ: تحت قولہ (ھذا بیان) واختارہ المصنفتبعالعامۃ المشائخ وعلیہ الفتویٰ وکثیر من المشائخ اخذ وا بقول ابی یوسف رحمہ اللّٰہ تعالیٰ وقالوا ان علیہ

الفتوی . (ردالمحتار : ٣٧٦/٤ ، احسن الفتاوی : ٤١٧/٦)

ایک مسجد کا سامان دوسری مسجد میں منتقل کرنے کا حکم:

مسجد کا سامان دو قسم کا ہوتا ہے:

ایک وہ جس کا تعلق مسجد کی بنا کے ساتھ ہو، جیسے اینٹیں، گارڈر، دروازے وغیرہ، اسے انقاض المسجد کہا جاتا ہے، ایسے سامان کا حکم یہ ہے کہ اگر مسجد آباد ہے اور اس میں نماز پڑھی جاتی ہے تو اس مسجد کا ایسا سامان دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں، ان کو بعینہا یا بیچ کر ان کی قیمت اسی مسجد میں صرف کی جائے۔

قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : الفتوى على ان المسجد لا يعود ميراثاً ولا يجوز نقله ونقل ماله الى مسجد آخر .

(رد المحتار جـ ٣ كتاب الوقف مطلب فى نقل انقاض المسجد)

اور اگر مسجد غیر آباد ہو جائے کہ کوئی بھی اس میں نماز نہیں پڑھتا، مثلاً مسجد کے گرد ونواح کے لوگ وہ علاقہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جا بسے ہوں جس کی وجہ سے مسجد بالکل ویران ہوگئی ہو تو ایسی حالت میں اس مسجد کی اینٹیں، گارڈر، اور دروازے وغیرہ جماعۃ المسلمین کے متفقہ فیصلہ سے دوسری مسجد کی طرف منتقل کئے جا سکتے ہیں۔

قال فى الهندية : اهل المسجد لو باعوا غلة المسجد او نقض المسجد بغير اذن القاضى الا صح انه لا يجوز كذا فى السراجية .

(عالمگيرية : ٣٤٩/٢)

قلت فعلم انه يجوز باذن القاضى .

وقال فى الشامية : ناقلا عن فتاوى النسفى سئل شيخ الاسلام عن اهل قرية رحلوا وتداعى مسجد ها الى الخراب وبعض المتغلبة يستولون على خشبه وينقلونه الى دورهم هل لواحد لاهل المحلة ان يبيع الخشبة بامر القاضى ويمسك الثمن ليصرفه الى بعض المساجد او الى هذا المسجد قال نعم .

وقال قبيل هذا لا سيما فى زماننا فان المساجد وغيرها من رباط

او حوض یأخذ انقاضه اللصوص والمتغلبون کما هو مشاهد.

(ردالمحتار کتاب الوقف: جـ ۳)

مسجد کا دوسری قسم کا سامان جس کا بناءِ مسجد میں کوئی دخل نہیں، جیسے چٹائی اور فانوس وغیرہ انہیں آلات المسجد کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس مسجد میں ضرورت نہیں تو اس کا دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا جائز ہے، بشرطیکہ واقف بھی اجازت دے، اس لئے کہ ایسا سامان بوقت استغناءِ ملک واقف میں عود کر آتا ہے، لہٰذا واقف کا اذن ضروری ہے۔

قال فی الشامیة تحت (قوله ومثله حشیش المسجد الخ) قال الزیلعی وعلی هذا حصیر المسجد وحشیشه اذا استغنی عنهما یرجع الی مالکه عند محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ وعند ابی یوسف رحمه اللّٰه تعالیٰ ینقل الی مسجد آخر وعلیٰ هذا الخلاف الرباط والبئر اذا لم ینتفع بهما اه وصرح فی الخانیة ان الفتوی علی قول محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ قال فی البحر وبه علم ان الفتوی علی قول محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ فی آلات المسجد.

(ردالمحتار: جـ ۳، ماخوذ از احسن الفتاویٰ: ۲۲٦/٦)

سرکاری زمین میں بلا اجازت مسجد کا بڑھانا:

سوال: ایک مسجد تنگ ہے، اس کے بڑھانے کی سخت ضرورت ہے، لوگ بیچارے بہت پریشان ہیں، مگر مسجد کے ساتھ متصل سرکاری زمین ہے اور گورنمنٹ مسجد کو بڑھانے کی اجازت نہیں دیتی، اس صورت میں بلا اجازت مسجد کو وسیع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اس کا حکم یہ ہے کہ حکومت پر مساجد کا انتظام اور تعمیر بقدرِ ضرورت فرض ہے معہذا اگر حکومت اپنا یہ فرض ادا نہیں کرتی بلا اذن حکومت زمین پر تعمیر جائز نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

قبرستان کا درخت کاٹنا:

جن درختوں کے متعلق لوگوں کا شرکیہ عقیدہ ہو کہ یہ فلاں بزرگ یا فلاں پیر صاحب کے درخت ہیں جو انہیں ہاتھ لگائے گا اس پر آفت آجائے گی، ان کا کاٹنا عقیدۂ شرکیہ کے ابطال کے لئے ضروری ہے، مگر انہیں فروخت کر کے ان کی قیمت اسی قبرستان پر خرچ کی جائے، اگر اس

قبرستان میں کوئی مصرف نہ ہوتو دوسرے کسی قریبی قبرستان پر لگائی جائے۔

یہ حکم جب ہے کہ درخت خودرو ہوں، اگر کسی شخص نے لگائے ہیں تو وہ اس کی ملک ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ علم (ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ۶/۲۲۶)

قبرستان کے درخت سے مسواک کرنا:

وقف قبرستان کے خودرو درخت بھی وقف ہیں ان سے مصارف وقف کے علاوہ نفع اٹھانا جائز نہیں۔

قبرستان کے درختوں کوفروخت کرنے کا حکم:

سوال : ایک قبرستان میں بڑے بڑے درخت ہیں جن کوفروخت کر کے ان کی قیمت اگر قبرستان میں ہی لگادی جائے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب : جہاں کہیں درخت زمین کے قبرستان بن جانے سے قبل اُگے ہوں تو مملوکہ زمین ہونے کی صورت میں درخت مالکِ زمین کے ہوں گے، خواہ مالک کوئی ایک شخص ہو یا قوم، البتہ زمین کے قبرستان بن جانے کے بعد درخت اُگے ہوں اور یہ زمین کسی کی ملکیت نہ ہو، بلکہ عام مسلمانوں کے قبرستان کے لئے وقف ہوتو اس کے درخت فروخت کر کے ان کی قیمت قبرستان یا دوسرے اجتماعی مفاد میں خرچ کی جاسکتی ہے۔

لما فی الهندية : مقبرة عليها اشجار عظيمةفهذا علىٰ وجهين اما ان كانت الاشجار قبل ا تخاذالارض مقبرة او نبت بعد اتخاذ الارض مقبرة ففى الوجه الاول المسألة على قسمين اما ان كانت الارض مملوكة لها مالك او كانت مواتاًلا مالك لها واتخذها اهل القرية مقبرة . (الفتاوىٰ الهندية : ۲/۴۷۳ ، الباب الثانى عشر الخ)

وقال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخارى : مقبرة عليها اشجار ان كانت نابتة قبل اتخاذ الارض مقبرة والارض مملوكة لها مالك جعلها مقبرة فالاشجار باصلها علىٰ ملك رب الارض يصنع الورثة بالاشجار ماشاؤ الان الشجرة لا تدخل تحت الوقف......وان كانت الارض مواتا لا مالك لها باصلها علىٰ حالها القديمة هذا كله اذا كانت الاشجار نابتة قبل

اتخاذ ھا مقبرة ولم ینبت بعد ذلك لا يخلوا اما ان علم غارسها او لا یعلم ان علم كانت للغارش وان لم يعلم بها غارس فالحكم للقاضی .

(خلاصة الفتاوی : ٤١٩/٤ ، كتاب الوقف الفصل الثالث، نوع آخر ،
ومثله في البحر الرائق : ٢٠١/٥ ، کتاب الوقف)

مرض الموت میں وقف کرنے کا حکم:

اگر کوئی انسان مرض الموت میں وقف کرے، تو یہ وقف وصیت کے حکم میں ہوگا، لہٰذا میت کے تہائی مال تک نافذ ہوگا اس سے زائد میں نافذ نہ ہوگا، الا یہ کہ ورثاء زائد کی جازت دیدیں، کیوں کہ مرض الموت میں اس کے مال کے ساتھ ورثاء کا حق متعلق ہوجاتا ہے، اس لئے تہائی مال سے زائد میں ورثاء سے اجازت لینے کی ضرورت ہے، البتہ تہائی مال میں اس کو تصرف کا حق حاصل ہے۔

"لقوله عليه السلام : ان الله تصدق عليكم في اخر اعماركم ، بثلث اموالكم ، زيادة لكم في اعمالكم" .

(اخرجه ابن ماجه رقم : ٢٧١٤ ، في كتاب الصلح)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری آخری عمر میں تمہارے لیے تہائی مال کو صدقہ کیا ہے تا کہ تمہارے اعمال میں اضافہ ہو۔

اس کی وضاحت کے لئے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین اس صورت میں کہ ہندہ نے اپنے مرض الموت میں اپنا حصۂ مکان متروکہ پدری غیر منقسمہ حسب دستاویز وقف نامہ مصدقہ تحریر شدہ لوجہ اللہ بمسجد محلہ وقف کیا اور اپنی حیات میں اس پر متولیانہ قابض رہی، مکان مذکور میں کرایہ دار حسب دستور رہتے ہیں لہٰذا شرعاً واقفہ کی طرف سے بعد الوقف تسلیم اور قبضہ متولیانہ صحیح ہوا یا نہیں؟ نیز وقفنامہ مذکورہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بعد میرے اس کا متولی فلاں بجائے میرے رہے گا اور متولی موصوف کو اختیار ہوگا وہ حصۂ موقوفہ کو فروخت کر کے زرثمن اس کا مسجد موصوف تعمیر طلب میں لگادے چنانچہ بعد انتقال واقفہ کے متولی نے شئی موقوفہ پر بحیثیت متولیانہ تحریر کرایہ نامہ، کرایہ دار سے حصہ رسدی کرالیا، مگر چوں کہ وہ موقوفہ نہایت قلیل ہے قابل المنفعت نہیں تقریباً آٹھ، نو گز عریض اور بارہ گز

طویل تقسیم میں آتی ہے جو سوائے فروختگی اس سے کوئی حصول منفعت نہیں، بدیں لحاظ متولی کو حسب شرائط واقفہ، بمشورۂ واقفان صاحبان اہل الرای دیندار کی فروخت کر کے زر ثمن اس کا تعمیر مسجد موصوف میں صرف کر دینا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب: اگر یہ حصۂ مکان متروکہ پدری ومملوکۂ ذاتی ہندہ کے تمام ترکہ کا ثلث ہے یا ثلث سے کم ہے تو وقف صحیح و نافذ ہو گیا، اور اگر زائد ثلث سے ہے تو ثلث میں وقف صحیح ہے اور زائد کا وقف ہندہ کے وارثوں کی رضا پر موقوف ہے، اگر وہ جائز رکھیں تو جائز ہے اور اگر راضی نہ ہوں تو زائد از ثلث میں وقف صحیح نہیں، اگر یہ زمین موقوفہ نہایت قلیل غیر قابل منفعت ہے تو متولی مسجد کو چاہئے کہ اس کو فروخت کر کے اس کے ثمن سے کوئی دکان مسجد کے لئے چھوٹی یا بڑی تعمیر کر دے یا کوئی زمین خرید ے جس کا کرایہ مسجد میں آتا رہے یا مسجد میں تعمیر کی ضرورت ہو تو تعمیر میں لگا دے۔

قال فی الدر فی بیان شرائط الاستبدال: مانصه و کون البدل عقارًا، وقال الشامی: وزاد العلامة قنا لی زاده فی رسالته (شرطاً ثامناً وهو أن یکون البدل والمبدل من جنس واحد ثم قال: والظاهر عدم اشتراط اتحاد الجنس فی الموقوفة للاستغلال لان المنظور فیه کثرة الریع وقلة المرمة والمؤنة فلو استبدل الحانوت بارض تزرع وتحصل منها غلة قدر اجرة الحانوت کان احسن لان الارض ادوم وابقیٰ واغنی عن کلفته الترمیم والتعمیر اھ. (٣/٦٠١، شامی)

قلت: دل قوله: لان المنظور فیه کثرة الریع علی عدم جواز الاستبدال بما لا ریع فیه اصلاً، واللّٰه اعلم.

وفی الخلاصة: ولو شرط فی الوقف ان یبیعه ویجعل ثمنه فی وقف افضل منه له ان یبیعه ولا یبیعه الامام الحاکم لکن اذرأه الحاکم اذن له اھ. (٤/٤١٤)

قلت: ظهر منه جواز صرف ثمن الدار فی عمارة المسجد لا جل اجازة الواقف واذنه فی ذالك ولعل منعهم الحاکم عن ذلك لوقایته من التهم فقط، واللّٰه اعلم.

(ماخوذ از امداد الاحکام : ۶۲/۳)

کسی شخص اور اسکی اولاد پر کچھ زمین نسل در نسل امامت کیلئے وقف کرنے کا حکم:

سوال:

(۱) واقف نے زید اور ان کی اولاد نسلاً بعد نسلٍ الی یوم القیامۃ کے لئے ایک مسجد میں امامت کرنے کے لئے تھوڑی زمین وقف کی اور اس شرط کے موافق ابتک جاری رہی اور اب زید کی اولاد تین چار پشت ہو کر ان کے خاندان میں سو آدمی سے زیادہ ہو گئیں اب اس وقف کی زمین کی آمدنی ان لوگوں کو کفایت نہیں ہوتی ہے اور ان میں اکثر آدمی نماز پڑھانے کو لائق ہیں پس ان لوگوں میں کون امامت اور وظیفہ پانے کا مستحق ہے؟

(۲) واقف نے زید کو ایک مسجد میں امامت کرنے کو تھوڑی زمین وقف کی اب جماعت والے ان کو اس مسجد میں نماز پڑھانے کو حسد وغصہ کی وجہ سے منع کرتے ہیں اور جماعت والوں نے چندہ کر کے دوسرا امام مقرر کر لیا ہے، حالانکہ زید امامت کرنے کو لائق تھا اب زید نے دوسرے محلے میں ایک مسجد بنائی اس میں وقف زمین کی آمدنی سے وظیفہ پا کر زید کے لئے نماز پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:

(۱) اس وقف میں صرف وہ وارث مستحق ہے جو اقرب بطن میں ہو اور مسجد مذکور میں امامت کریں بقیہ اس میں مستحق نہیں ہے اگر زید کی اولاد میں بطن اقرب میں لائقِ امامت چند اشخاص ہوں تو اس میں تفصیل ہے، اگر اہل مسجد ان میں سے کسی ایک ہی کی امامت تجویز کریں بوجہ کسی ترجیح وافضلیت کے تب تو وہی شخص واحد آمدنی وقف کا مستحق ہے اور اگر سب کی امامت کو نوبت بہ نوبت منظور کر لیں تو ہر قابل امامت جو امامت کو بجلائے مستحق ہوگا اور آمدنی وقف ان سب پر تقسیم کی جائے گی پس جو شخص اولاد زید میں قابل امامت نہیں یا قابل امامت ہے مگر اہل محلہ واہل مسجد اس کی امامت منظور نہیں کرتے وہ اس وقف میں مستحق نہ ہوگا۔

هذا مافهمته من القواعد . والله اعلم

(۲) سوال دوم کا جواب بدون عبارت وقف نامہ دیکھے ہوئے نہیں دیا جا سکتا۔ فقط

(دليل الاول) قال في الفتاوى الحامدية : ونقل في الاسعاف

فی باب الوقف علی الاولاد و اولاد الاولاد ولو ذکر البطون الثلاثة ثم قال : علی الاقرب فالاقرب او قال : علی ولدی ثم علی ولدی ولدی ثم وثم او قال : بطناً بعد بطن یبدأ بما بدأبه الواقف ولا یکون للبطن الاسفل شئی ما بقی من الاعلیٰ احد اھ . (۱۳۷/۱)

قلت : فقوله : نسلاً بعد نسلٍ فی معنیٰ قوله بطناً بعد بطن فلا یستحق الاسفل شیئاً ما بقی من الاعلیٰ احد ویصلح للامامة ولیس للاناث فی ھذا الوقف شئ لانھن بمعزل عن الامامة .

وفیه ایضاً : لا یستحق الا من باشر العمل اھ .

وفی الاشباہ : وقد اغتر کثیر من الفقھاء فی زماننا فاستب حوا معالیم الوظائف من غیر مباشرة اھ . (۲۰۵/۱)

قلت : ومباشرة الامامة لیس باختیار المباشربل تتوقف علیٰ نصب اھل المحلة ایاہ لھا . (ماخوذ از امداد الاحکام : ۶۱/۳)

مال حرام سے مسجد تعمیر کرنے کا حکم:

حرام مال مسجد پر صرف کرنے کی مختلف صورتیں ہیں اوران کا حکم بھی مختلف ہے۔

(۱) حرام مال سے مسجد کی زمین نہ خریدی گئی ہو، بلکہ صرف دیواروں پر خرچ کیا گیا ہوتو اس صورت میں بعض اکابر نے تحریر فرمایا ہے۔

”حرام مال سے مسجد کی زمین کا استعمال نہیں پایا جاتا اس لئے اس میں نماز درست ہے، مگر حرام مال مسجد پر صرف کرنے کا گناہ ہوگا، لہٰذا مال حرام سے تعمیر کردہ دیواریں گرا کر حلال مال سے دوبارہ تعمیر کرنا ضروری ہے۔“

قال فی الشامیة : (قوله لوبما له الحلال) قال تاج الشریعة امالو انفق فی ذلك مالا خبیثاً او مالا سببه الخبیث والطیب فیکرہ لان اللّٰہ تعالیٰ لایقبل الا الطیب فیکرہ تلویث بیته بما لا یقبله اہ شر نبلالیة .

(رد المحتار : جـ ۱)

قول عدم استعمال خلاف ظاہر ہے، لہٰذا اس صورت کا حکم بھی صورت ثانیہ کی طرح معلوم

ہوتا ہے۔

(۲) اگر حرام مال فرش پر لگایا گیا تو نماز پڑھنے سے حرام کا استعمال ہوگا، لہٰذا اس میں نماز مکروہ تحریمی ہے، اس کا تدارک یوں ہو سکتا ہے کہ حرام مال سے تیار کردہ فرش اکھاڑ کر طیب مال سے فرش لگائے جائے۔

(۳) اگر حرام مال سے زمین خرید کر اس پر مسجد بنائی گئی تو اس میں بھی استعمال حرام کی وجہ سے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور اس کا تدارک بھی ممکن نہیں، مگر چونکہ اس کا وقف صحیح ہو چکا ہے اس لئے بیع اول کا استرداد کر کے دوبارہ مال طیب سے اشتراء نہیں کیا جا سکتا۔

یہ مسجد اگر چہ غیر منقول ہے، لحدیث ان اللّٰہ طیب لا یقبل الا طیباً، مگر اس کے باوجود اس کی مسجدیت میں کوئی شبہ نہیں، لہٰذا اس کی بے حرمتی جائز نہیں۔

مسجد کے لئے صرف یہ شرط ہے کہ موقوف للصلوٰۃ، اور صحت وقف کے لئے فارغ عن ملک الغیر ہونا شرط، یہ شرائط ایسی مسجد میں موجود ہیں۔ کشاف اور مدارک کے جزئیہ "قیل کل مسجد بنی مباھاۃ او ریاءً وسمعۃ او لغرض سوی ابتغاء وجہ اللّٰہ او بمال غیر طیب فھو لاحق بمسجد الضرار" سے شبہہ نہ کیا جائے، اس لئے کہ:

اوّلاً تو یہ قول "قیل" سے منقول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

ثانیاً اسے غیر مقبول ہونے پر محمول کرنا واجب ہے، یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ یہ مسجد ہی نہیں، اس لئے کہ مسجدیت کے شرائط موجود ہیں۔

غرضیکہ اس مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس کی بے حرمتی بھی جائز نہیں، اور نہ ہی اس کے تدارک کی کوئی صورت نظر آ رہی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید اوراق مغصوبہ پر لکھا گیا ہو تو اس کا پڑھنا جائز نہیں "للزوم استعمال الحرام" اور اس کی بے حرمتی بھی جائز نہیں۔

لانہ قرآن، واللّٰہ تعالیٰ اعلم (ماخوذ از احسن الفتاویٰ: ۶/۴۳۱)

عیدگاہ پر پل تعمیر کرنے کا حکم:

ہمارے علاقہ میں عیدگاہ ہے جس میں عیدین کی نمازیں ہوتی ہیں، بچے کھیلتے بھی ہیں، یعنی عام دنوں میں کھیل کے میدان کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اس لئے اس کا نام عیدگاہ گراؤنڈ ہے، اب حکومت ریلوے پل کو اس عیدگاہ سے گذارنا چاہتی ہے، جس سے عیدگاہ میدان کا آدھا حصہ

متاثر ہوگا، کیا شرعاً عیدگاہ پر پل تعمیر کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ احسن الفتاویٰ میں لکھا ہے کہ عیدگاہ میں مدرسہ تعمیر کرنا بھی جائز نہیں اس بارے میں سوالات و جواب حاضر خدمت ہے۔

عیدگاہ کی فاضل زمین پر مدرسہ بنانا:

سوال: یہاں مدرسہ عربیہ میں تعمیرات کی تنگی ہے اور عیدگاہ بہت وسیع ہے، اس کا کچھ حصہ کاشت کروایا جاتا ہے اور اس کی آمدنی عیدگاہ پر خرچ کی جاتی ہے، خیال ہے کہ اگر مدرسہ کی تعمیر کے لئے عیدگاہ کی فاضل اراضی کا استعمال کرنا شرعاً جائز ہوتو مدرسہ کافی وسیع پیمانہ پر چلایا جاسکتا ہے، اس کے متعلق ایک استفتاء مرتب کر کے بعض حضرات علماء کی خدمت میں بھیجا گیا تھا، مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ بنوری نے بلا شک جواز کا حکم دیا، لیکن خیر المدارس کے دارالافتاء سے اور سہارنپور سے جو جواب آیا، انہوں نے شرط الوقف کنص الشارع کی عبارت پیش کر کے اس کو خلاف شرط قرار دے کر عدم جواز کا حکم دیا، پھر حضرت مولانا خیر محمد صاحب یہاں تشریف لائے، ان سے گفتگو ہوئی، وہ بھی چاہتے یہ تھے کہ اگر مسئلہ کی گنجائش نکالی جاسکے تو ضرورت تو واقعی یہ ہے کہ مدرسہ منتقل کردیا جائے، اور انہوں نے فرمایا کہ آپ کی خدمت میں استفتاء بھیج دو، آپ مفصل جواب دیدیں گے، لہٰذا عرض ہے کہ آپ تفصیلی جواب عطا فرمائیں۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

بندہ نے صورت مسئلہ میں بار بار غور کیا مگر سمجھ میں یہی آیا کہ عیدگاہ کی زمین میں مدرسہ بنانا جائز نہیں، ہر چند سوچنے کے باوجود مجوزین حضرات کے خیال کی بناء سمجھ میں نہیں آتی، اگر آپ حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ کے افتاء کے دلائل تحریر فرمادیتے تو اس پر کچھ غور کرسکتا، بہرکیف مسئلہ کی نوعیت بالکل واضح ہے جس میں ذرا برابر شک وشبہ کی گنجائش نہیں، معہٰذا جو امور موجب خلجان ہوسکتے ہیں اثناء جواب میں ان کی تنقیح بھی کردی ہے۔

قال فی الشامیة : فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله ان يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصيته وله ان يخص صنفاً من الفقراء ولو كان الوضع فی كلهم قربة .

(ردالمحتار : ۴۹۹/۳)

وقال فی التنویر اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف علیه جاز للحاکم ان یصرف من فاضل الوقف الآخر علیه وان اختلف احدهما لا . (ردالمحتار : ۵۱۵/۳)

معلوم ہوا کہ شروط واقف کے خلاف کرنا اور جہت وقف کا بدلنا جائز نہیں۔

خود واقف بھی اپنی شرط کے خلاف نہیں کرسکتا۔

قال فی شرح التنویر وقف ضیعة علی الفقراء ثم قال لولیه اعط من غلتها فلانا کذا وفلانا کذا لم یصح لخروجه عن ملکه بالتسجیل. (رد المحتار : ۵۱۳/۳)

درمختار کے مندرجہ بالا جزئیہ کے بعد " ان للواقف الرجوع فی الشرط ولو مسجلاً. " (رد المحتار : ۵۱۴/۳) کے جزئیہ سے شبہ نہ کیا جائے، کیوں کہ اسی موقع پر علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:" وفیه کلام سیأتی " چنانچہ آگے چل کر ایک موقع پر نہایت بسط سے اس کی تحقیق فرمائی ہے جس سے چند اقتباسات تحریر کیے جاتے ہیں:

لا یجوز ان یفعل الاما شرط وقت العقد .

وما کان من شرط معتبر فی الوقف فلیس للواقف تغییره ولا تخصیصه بعد تقرره ولا سیما بعد الحکم الخ .

(ردالمحتار : ۵۹۷/۳)

غرضیکہ خود واقف بھی جہت وقف کو تبدیل نہیں کرسکتا۔

اسی طرح حاکم بھی بیت المال کے وقف میں تبدیل جہت کا اختیار نہیں رکھتا۔

قال فی شرح التنویر ان السلطان یجوز له مخالفة الشرط (الیٰ ان قال) وان غایر شرط الواقف لان اصلها لبیت المال .

وفی الشامیة قلت والمراد من عدم مراعاة شرطها ان للامام او نائبه ان یزید فیها وینقص ونحوذلك ولیس المراد انه یصرفها عن

الجهة المعينة الخ . (رد المحتار : ۳/۵۷۹)

حاصل یہ کہ جملہ کتب معتبرہ میں وضاحت ہے کہ شرط واقف اور جہت وقف کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، اگر موقوف علیہ سے استغناء ہو چکا ہو تو بھی وقف کی آمدن موقوف علیہ کے مجانس اقرب پر صرف کی جائے گی، اس حالت میں بھی جہت وقف کا بدلنا جائز نہیں۔

قال في التنوير ومثله حشيش المسجد وحصيره مع الاستغناء عنهما والرباط والبئر اذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر (والحوض شرح) الى اقرب مسجد اورباط او بئر (او حوض ، شرح) اليه .

وقال في الشامية (قوله الى اقرب مسجد اورباط الخ) لف نشر مرتب وظاهره انه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب الى حوض وعكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لا قرب مجانس لها .

(ردالمحتار : ۳/۵۱۳)

مذکورہ جزئیہ اگر چہ مصرف اول کے خراب ہوجانے سے متعلق ہیں مگر مصرف اول سے اوقاف کی آمدن اگر بہت زیادہ ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے، اس لئے کہ استغناء دونوں صورتوں کو جامع ہے۔

شرح التنویر مع الشامیہ صفحہ ۵۲۰ میں یہ جزئیہ ہے:

ويبدء من غلته بعمارته ثم ما هو اقرب بعمارته كامام مسجد ومدرس مدرسته يعطون بقدر كفايتهم ثم السراج والبساط الى آخر المصالح وان لم يشترطه الواقف لثبوته اقتضاءً .

اس سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ وقف مسجد سے مدرس کو دینا جائز ہے، اس سے مقصد یہ ہے کہ وقف مسجد سے امام کو اور وقف مدرسہ سے مدرس کو دینا جائز ہے، اس لئے مندرجہ ذیل جزئیہ میں تصریح ہے کہ مسجد پر وقف کرتے وقت اگر مدرس بھی مشروط فی الوقف ہو تو وہ بھی مصارف لازمہ سے نہیں۔

قال في شرح التنوير وانما يكون المدرس من الشعائر لو مدرس

المدرسة كما مر اما مدرس الجامع فلا لانه لا يتعطل لغيبته بخلاف المدرسة حيث تقفل اصلا . (ردالمحتار : ٥٢٥/٣)

خلاصہ یہ کہ اصل موقوف علیہ سے استغناء کے وقت بھی جہت وقف کا بدلنا جائز نہیں، اقرب مجالس پر صرف کرنا ضروری ہے، عالمگیریہ میں بھی اس قسم کا جزئیہ موجود ہے:

سئل شمس الائمة الحلوانی عن مسجد او حوض خرب ولا يحتاج اليه لتفرق الناس هل للقاضی ان يصرف او قافه الی مسجد اخر او حوض اخر قال نعم ولو لم يتفرق الناس ولكن استغنی الحوض عن العمارة وهناك مسجد محتاج الی العمارة او علی العكس هل يجوز للقاضی صرف وقف ما استغنی عن العمارة الی عمارة ما هو محتاج الی العمارة قال لا كذا فی المحيط .

(عالمگیریه : ٣٥٢/٢)

اس عبارت میں اقرب مجانس کی تصریح نہیں، شرح التنویر اور شامیہ کے مذکورہ جزئیات میں وضاحت ہے کہ بحالت استغناء مسجد کا وقف قریب ترین مسجد پر اور حوض کا وقف قریب ترین حوض پر صرف کیا جائے گا۔

وهذا ماجاء فی فهم هذا الفقير والعلم عند الله اللطيف الخبير .

(احسن الفتاویٰ : ٤٣٣/٦)

الجواب ومنہ الصدق والصواب

احسن الفتاویٰ میں مذکورہ مسئلہ اس عیدگاہ کے بارے میں ہے جو کسی کی طرف سے عید کی نماز کے لئے وقف ہو، چونکہ وقف میں واقف کی شرائط کی رعایت کرنا ضروری ہے، اس لئے اس کو عید گاہ کے علاوہ کسی اور کام میں استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، جبکہ کالونی گیٹ کے اس عیدگاہ کے بارے میں، کے، ڈی، اے، کے محکمہ سے اسی طرح علاقے کے قدیم باشندوں سے معلوم ہوا کہ یہ میدان سرکاری کاغذات میں کھیل کا میدان ہے، بعد میں آبادی والوں نے عید کی نماز یہاں شروع کی ہے اور عیدگاہ گراؤنڈ اس کا نام پڑ گیا اس لئے شرعاً اس عیدگاہ کا حکم موقوفہ عیدگاہ کی طرح نہ ہوگا۔

لہٰذا حکومت بوقت ضرورت مفاد عامہ کے لئے اس پر پل تعمیر کر سکتی ہے اس کو شرعی مسئلہ بنا کر

ہنگامہ اور شور شرابہ کرنا درست نہیں۔ (ابن شائق عفا اللہ عنہ)

مسجد کی زمین میں امام کا مکان بنا:

مسجد کی تعمیر شروع کرنے سے پہلے مسجد کی چھت پر امام صاحب کے لئے مکان بنانے کی نیت کر لی جائے تو مکان بنانا جائز ہے لیکن اگر اس وقت ارادہ نہیں تھا مسجد بن جانے کے بعد ارادہ ہوا اب چھت پر یا بنی ہوئی مسجد کے کسی حصہ پر امام کے لئے گھر بنانا جائز نہیں، کیوں کہ جو زمین ایک دفعہ مسجد میں داخل ہو چکی ہے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی کسی بھی ضرورت کے لئے اسے مسجد سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

قال فی شرح التنویر ولو خرب ما حوله استغنی عنه یبقی مسجدًا عند الامام و الثانی ابداً الی قیام الساعة و به یفتی .

وفی الشامیة (قوله ولو خرب ما حوله الخ) ای ولو مع بقائه عامرًا و كذا لو خرب وليس له ما يعمر به وقد استغنی الناس عنه لبناء مسجد اخر . (ردالمحتار : ۵۱۳/۳)

منہدم مسجد کے سامان کا حکم:

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک مسجد خام بنوایا تھا مگر فی الحال منہدم ہونے لگی تو زید نے اس مقام پر مسجد خام توڑوا کر مسجد پختہ کی بنیاد ڈالی مسجد پختہ تعمیر کرانا چاہتا ہے، اور جو سامان پختہ مسجد میں لگانے کے قابل نہیں ہے جیسے لکڑی، کپڑا وغیرہ، اب سامان مسجد خام فروخت کر کے مسجد پختہ میں لگانا درست ہے یا نہیں؟ یا بانی مسجد غیر سے قیمت زائد دیکر لے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہ فروخت کیا گیا تو سامان مسجد خام بہر کیف ضائع وہلاک ہو جائے گا۔

الجواب : اگر دوسری مسجد پختہ اسی جگہ اور اسی مقام پر بنائی جا رہی ہے جہاں مسجد خام واقع تھی تو اس صورت میں مسجد خام کا فاضل اسباب بیچ کر مسجد پختہ کی مرمت میں صرف کرنا جائز ہے اور اگر پختہ مسجد اسی مقام پر نہیں بنائی گئی تو مسجد خام کا اسباب بعینہ یا بعد فروخت کر کے اس کی قیمت کا پختہ مسجد میں لگانا درست نہیں بلکہ مسجد خام کو درست کر دینا لازم ہے۔

قال العلامة عبد الحی : فی فتاواه، فی السراج المنیر : ولا یحل

ان یھدم المسجد لیبنیه احکم الاان یخاف ان ینهدم فیجوز لاهل هذه المحلة لالغیرهم اذا بذامن مال انفسهم لامن مال الوقف الابامر القاضی اهـ . (۲۰۳/۱)

وفیه ایضاً : در بحر الرائق است : قال محمد : اذا اخرب المسجد ولیس له ما یعمر به وقد استغنی الناس عنه فانه یعود الی ملك الواقف وقال ابو یوسفؒ : هو مسجد ابدًا الی قیام الساعة لایعود میراثا ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیها اولا وعلیه الفتویٰ کذا فی الحاوی القدسی اه ونقل العلامة عبد الحیؒ عن "سعادة الساجد لعمارة المساجد"للشرنبلالی مانصه واذا علمت هذا فما فی الدررو فتاویٰ قاضی خان من جواز نقل المسجد اذا خرب خلاف ما علیه الفتویٰ کما هو المذکور فی الحاوی وخلاف الصحیح المذکور فی خزانة المفتین وقد مشی الشیخ الامام محمد بن سراج الدین الحانوتی علی القول المفتیٰ به من عدم نقل بناء المسجد اهـ (۲۳۰/۱) وفی المجتبیٰ : واکثر المشائخ علی قول ابی یوسفؒ ورجح فی فتح القدیر قول ابی یوسفؒ اهـ . فتاویٰ مذکور (٤۲۹/٤)

وفی الخلاصة : لو علق قندیلاً (وبسط حصیرًا وبواری فی المسجد ثم خرب المسجد واستغنی عنه عادت هذه الاشیاء الی ملك صاحبه ، والصحیح من مذهب ابی یوسفؒ انه لاتعود الی ملك متخذها بل یتحول الی مسجدآخر او یبیعها قیم المسجد لاجل المسجد اهـ . (٤۲٤/٤)

قلت : وهذا یؤذن بالفرق بین بناء المسجد حیث لایحول وبین القنادیل والحصیر حیث یجوز تحویلها عند ابی یوسفؒ ایضاً .

(ماخوذ از امدادالاحکام : ۱۷۳/۳)

بوقت ضرورت اوقاف فروخت کرنے کا حکم:

عام حالات میں تو وقف کو فروخت کرنا، یا کسی اور کو ہبہ کرنا جائز نہیں، اسی طرح اسکو بدلنا بھی جائز نہیں، اگر موقوفہ زمین خراب ہو جائے، بنجر بن جائے اس سے استفادہ کرنا اور موقوف علیہ کو فائدہ پہنچانا ممکن نہ رہے تو اس کو بیچ کر کسی نفع بخش زمین کو خریدنا جائز ہے۔

چنانچہ امداد الاحکام ۳/۵۷۱ میں ایک سوال کے جواب میں مذکور ہے، ایسی صورت میں مسجد اول کا سامان منتقل کر کے دوسری مسجد میں لگا دینا جائز ہے، اور زمین کا مبادلہ بھی جائز ہے۔

وهذا عند ابی حنيفة ومحمد رحمهما الله واما عند ابی یوسف رحمه الله فلا .

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک مکان کا چہارم حصہ متعلق مسجد وقف ہے اور بھی دیگر مکانات اس مسجد کے متعلق وقف ہیں جو مرمت طلب ہیں اگر چہارم موقوفہ فروخت کر کے متولی مسجد اس کی قیمت سے بقیہ مکانات متعلقہ مسجد کی مرمت کرا دے جس سے آئندہ مسجد کا نفع زیادہ ہونے کی امید ہے تو شرعاً اس میں کوئی ممانعت یا حرج تو نہیں ہے مفصل بروئے شرع شریف جو حکم ہو اس سے اطلاع فرمائی جائے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر اس چہارم حصہ کی آمدنی معقول نہ ہو یا یہ اندیشہ ہو کہ کسی وقت زیادہ حصہ والے مسجد کے چہارم حصہ کو شاید دبا لیں گے تو اس صورت میں اس کو فروخت کر کے بقیہ مکانات سالمۃ من شرکۃ الغیر کی مرمت میں اس رقم کا لگا دینا جائز ہے۔

وفی فتاویٰ النسفی : بیع عقار المسجد لمصلحة المسجد لایجوز وان کان بامر القاضی وان کان خراباً فاما بیع النقض فیصح ونقل عن شمس الائمة الحلوانیؒ انه یجوز للقاضی والمتولی ان یبیعه ویشتری مکانه آخروان لم ینقطع ولکن یؤخذ بثمنه ما هو خیر منه للمسجد لا یباع ای غلته وقد رویٰ عن محمد اذا ضعفت الارض الموقوفة عن الاستغلال والقیم یجد بثمنها ارضاً آخر هی اکثر ریعاً کان له ان یبیعها ویشتری بثمنهاما هو اکثر ریعاً وفی الفتاویٰ قیم

وقف خاف من السلطان او من وارث ان يغلب على ارض وقف يبيعها ويتصدق بثمنها .

قلت : اى اذا لم يكن للمسجد حاجة الى ثمنها .

(ماخوذ از امدادالاحکام : ۱۷۷/۳)

مسجد کو فروخت کرنا جائز نہیں:

اگر ایک مسجد غیر آباد ہوجائے اس طرح کہ آبادی والے وہاں سے چلے گئے نمازی کوئی نہیں رہا، مسجد بالکل ویران پڑی ہوئی ہے، دوبارہ آباد ہونے کا بھی امکان نہیں۔

چنانچہ مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسجد کو کسی حال میں بھی منتقل کرنا جائز نہیں جو جگہ ایک بار مسجد بن گئی وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی بالفرض مسجد ویران ہوجائے اور کوئی نماز پڑھنے والا بھی وہاں نہ رہے تو بھی اس مسجد کو باقی رکھنا واجب ہے۔

البتہ ویران مسجد کے سامان پر خطرہ ہو تو اس کو دوسری قریب ترین مسجد کی طرف منتقل کیا جاسکتا ہے، تو وہاں کے قریب ترین مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس جگہ کی چار دیواری کردے تاکہ اس جگہ کی بے حرمتی نہ ہو۔ (احسن الفتاویٰ : ٤٥١/٦)

مسجد ہونے کا حکم کب ہوگا

جو جگہ مسجد کے لئے مختص کر کے وقف کردی گئی ہے اور وہاں امام ومؤذن مقرر ہوگیا اور باضابطہ جماعت کے ساتھ نماز ہونے لگی ہے تو وہ مسجد شرعی بن گئی، چاہے کچا چبوترہ ہی کیوں نہ ہو اب اس کو توڑنا، اس کی بے حرمتی کرنا اور اس کو فروخت کرنا جائز نہیں۔

(ملخص از فتاویٰ عالمگیریہ : ۱۰۳/۲)

مسجد میں خوشبو لگانا:

مسجد کی تعظیم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اسے خوشبوؤں سے معطر کیا جائے، کیوں کہ مساجد کو پاک صاف اور خوشبودار رکھنا شرعاً پسندیدہ اور مطلوب ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ کا حکم ہے:

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ گھروں میں مسجد بناؤ اور ان کو پاک معطر رکھا جائے۔ (مشکوٰۃ باب المساجد : صـ ٦٩)

ایک حدیث میں ہے:

"اتخذوا علی ابوابها المطاهر وجمروا ها فی الجمع ."

(ابن ماجه : ص ٥٥)

یعنی مسجدوں کے دروازے کے پاس طہارت خانہ بناؤ اور جمعہ کے دن مسجدوں میں خوشبو کی دھونی دو۔

اور سلف صالحین کی بھی یہی سنت تھی کہ مساجد میں خوشبو لگاتے اور دھونی دیتے تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ کے بارے میں ہے: کہ انہوں نے حکم جاری فرمایا تھا کہ مدینہ کی مسجد میں ہر جمعہ کو دو پہر کے وقت دھونی دی جائے۔ (زادالمعاد : ١٠٤/١)

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ خود ہر جمعہ کے دن مسجد میں دھونی دیتے تھے۔

افسوس کہ آج یہ سنت بالکل چھوٹ گئی، لوگ مساجد کے اندر طرح طرح کے مکروہ تکلفات تو کرتے ہیں، مگر اس سنت کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے آج یہ سنت بالکل مرچکی ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اس سنت کو پھر سے زندہ کریں چاہے عطر استعمال کریں، چاہے عود کی دھونی دیں اگر بتی بھی جلا سکتے ہیں، البتہ اس کا اہتمام رہے کہ باہر جلا کر اندر لایا جائے تا کہ ماچس کی گندھک کی بو سے مسجد محفوظ رہے۔

مسجد میں بدبودار چیز داخل کرنے کی ممانعت:

کسی قسم کی کوئی بدبودار چیز مثلاً لہسن، پیاز اور مولی وغیرہ کو مسجد میں لانا یا ان کو کھا کر فوراً مسجد میں آنا ناجائز ہے، جناب نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"من اکل من هذه الشجرة المنتنة فلا یقربن مسجدنا فان الملائكة تتأذى مما يتأذى منه الانس ". (بخاری ومسلم)

یعنی ''جو شخص بدبودار درخت (یعنی پیاز وغیرہ) میں سے کھائے وہ ہماری مسجد کے قریب بھی نہ آئے اس لئے کہ فرشتوں کو بھی ان تمام چیزوں سے ایذا پہنچتی ہے جن سے انسانوں کو ایذا ہوتی ہے''۔

مراد یہ ہے کہ جب تک اس کی بومنہ سے نہ جائے اس وقت تک مسجد میں داخل نہ ہو اور یہی حکم ہے ہر بدبودار چیز کا جیسے، حقہ، سگریٹ، نسوار، بیڑی، اور لہسن وغیرہ جیسا کہ فقہ کی معتبر کتابوں میں مذکور ہے''اور طریقہ محمدیہ'' میں مولی کو بھی اسی حکم میں داخل کیا ہے۔

(آداب المساجد)

آج کل بہت سے لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں، سگریٹ پیتے پیتے مسجد تک پہنچ جاتے ہیں پھر اسی طرح نماز میں شریک ہوجاتے ہیں جس سے برابر میں کھڑے نمازیوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور فرشتوں کو ایذاء الگ ہے، اسی طرح بہت سے مزدوری پیشہ لوگ مزدوری کے کپڑے جن میں پسینہ وغیرہ کی بدبو ہوتی ہے انہیں کپڑوں میں نماز میں شریک ہوجاتے ہیں جس سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا اس سے بچنا بہت ہی ضروری ہے۔

سگریٹ اور نسوار جیب میں رکھنا:

جیسا کہ بدبودار چیزوں کو مسجد میں لانے کی ممانعت کی تفصیل اوپر معلوم ہوچکی ہے سگریٹ ونسوار وغیرہ حالت نماز میں جیب میں رکھنا بھی جائز نہیں ہے، البتہ نماز صحیح ہوجائے گی، اس لئے ان چیزوں کو مسجد سے باہر ہی کہیں رکھ کر مسجد میں داخل ہونا چاہئے۔

مسجد میں چٹائی کی ٹوپی رکھنا:

آج کل بعض مساجد میں چٹائی، پلاسٹک کی ٹوپی رکھنے کا دستور ہے جب کہ ایسی ٹوپیاں مسجد میں رکھنا احترام مسجد کے خلاف ہے بالخصوص جب کہ ان کے تنکے نکل کر مسجد میں بکھرتے ہیں اور ان پر میل کی تہہ نظر آتی ہے اور پسینے اور میل کی بو آتی ہے، کیا کوئی شخص ایسی ٹوپیوں کو اپنے مکان کی زینت بنانے کو تیار ہے؟ اگر نہیں تو خدا کے گھر کے لئے اس کو کیوں کر جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟

یہ بات بھی تو سوچنے کی ہے کہ چٹائی یا پلاسٹک کی ٹوپی پہن کر آپ کسی کی شادی بیاہ کی مجلس یا کسی افسر کے سامنے نہیں جاسکتے، مسجد اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا دربار ہے یہاں کیسے پہن کر آسکتے ہیں، اس لئے چٹائی یا پلاسٹک کی ٹوپیاں مسجد میں رکھنا جائز نہیں اور ان کو سر پر رکھ کر نماز پڑھنا مکروہ ہے، کیوں کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جو لباس پہن کر انسان کسی مجلس میں جانے سے شرماتا ہے ایسے لباس میں نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے، اس پر دوام مکروہ تحریمی کے قریب ہے، اس لئے احتیاط لازم ہے۔

مسجد میں قرآن کریم رکھنا:

تلاوت کی غرض سے مسجد میں وقف کرنا کارِ خیر ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن قرآن کریم کے احترام کا خاص لحاظ ہونا چاہئے عام طور پر مساجد میں دیکھا جاتا ہے کہ قرآن کریم بالکل بے

ترتیب رکھے ہوئے ہوتے ہیں بعض کی جلد پھٹی ہوتی ہیں بعض کے کچھ اوراق غائب ہیں، کچھ میں جزدان ہیں کچھ میں نہیں ہے، اس طرح قرآن کریم کی بے احترامی ہوتی ہے اس لئے منتظمین مسجد پر لازم ہے کہ اتنے قرآن کریم وصول کریں جتنے کی مسجد کو ضرورت ہے اور پھر ان کی حفاظت کا اور ادب واحترام کا پورا لحاظ کیا جائے مضبوط جلد بندی کر کے جزدان میں رکھے کبھی کبھی خوشبوؤں سے معطر کرے، ورنہ بے احترامی کی وجہ سے سب گناہ گار ہوں گے اس سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا بھی خطرہ ہے۔

مسجد یا مدرسہ کے قرآن پاک اور کتب دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم:

اگر واقف نے خاص مدرسہ یا مسجد کے لئے قرآن کریم یا کتاب وقف کیا ہے تو ان کو دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں۔

چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

مسجد کی چیزیں مسجد سے باہر لیجا کر استعمال کرنا حرام ہے۔

قال فی الخلاصة: لان البواری لیست من المسجد حقیقة لکن لها حکم المسجد ...... وقال ایضاً: ولا یحمل الرجل سراج المسجد الیٰ بیته ویحمل من بیته الی المسجد اهـ. (۲۲۹/۱)

قلت: وقد مر فی قول ابی یوسفؒ انه لایجوز نقل المسجد ونقل ماله الی مسجد آخر فالیٰ غیر المسجد بطریق الاولیٰ.

(ماخوذ از امداد الاحکام: ۱۷۳/۲)

مسجد کے چراغ کیلئے دی جانے والی رقم دوسرے مصرف میں خرچ نہیں کی جاسکتی:

سوال: بنیت چراغ مسجد میں پیسہ دیتے ہیں، اس پیسہ سے دوسرا کام جیسے بچھونا، ستون خریدنا یا مؤذن وامام کا مشاہرہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جب پیسہ دینے والا چراغ مسجد کا نام لیتا ہے تو دوسرے مصرف میں اس رقم کو صرف کرنا جائز نہیں اگر چراغ کے لئے ضرورت کم ہو اور دوسرے کام کے لئے رقم کی ضرورت ہو تو پیسہ دینے والے سے بصراحت اجازت لینی چاہئے کہ اگر تیل کی ضرورت نہ ہو تو ہم اس رقم کو دوسرے مصارف مسجد میں صرف کر دیں یا نہیں؟ اگر وہ اجازت دے دے تو پھر اس رقم کو صرف

کرنا جائز ہو جائے گا۔

وفي الخلاصة : رجل قال : جعلت حجرتي لدهن سراج المسجد ولم يزد على هذا صارت الحجرة وقفاً على المسجد اذا سلمها الى المتولي وليس للمتولي ان يصرف غلتها الى غير الدهن اهـ . (ماخوذ از امداد الاحكام : ٣/١٧٣ ، ٤/٤٤٢)

مسجد میں قرآن کریم کی تعلیم دینا:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ بچوں کو قرآن شریف وغیرہ اجرت لیکر مسجد میں پڑھانا بالاتفاق ناجائز ہے اور بلا اجرت محض ثواب کے لئے بعض فقہاء نے اجازت دی ہے۔ (کذا فی الاشباہ) لیکن بعض فقہاء اس کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں کیوں کہ بحکم حدیث بچوں کو مسجد میں داخل کرنا ہی ناجائز ہے۔

(كذا في حاشية الاشباه من التمر تاشي ، آداب المساجد : صـ ١٤)

البتہ مدرسہ میں جگہ کی تنگی ہو اور اہل مدرسہ دوسری جگہ کے انتظام کی کوشش میں ہوں تو سردست دوسری جگہ کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کی تعلیم خراب ہو رہی ہو، ایسی مجبوری کی صورت میں فقہاء نے مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے۔

(١) نماز، اذکار، تلاوت قرآن وغیرہ عبادات میں مخل نہ ہو۔

(٢) مسجد کی طہارت ونظافت اور آداب واحترام کا پورا خیال رکھا جائے۔

(٣) کمسن ناسمجھ اور آداب مسجد سے ناواقف بچوں کو نہ لایا جائے۔

(احسن الفتاویٰ : ٦/٤٥٨ ، فتاویٰ رحیمیہ : ٩/٢٠٠)

مسجد میں ذکر جہری کی مجلس:

اگر کوئی شخص مشائخ حقہ میں سے کسی سے بیعت ہو اور انہوں نے ذکر جہری کی تعلیم دی ہو تو تعلیم کے مطابق اپنا اپنا الگ ذکر جہری کر سکتے ہیں، لیکن مسجد میں ذکر جہری سے نمازیوں کو تشویش لاحق ہوتی ہو تو ایسی صورت میں مسجد میں زور زور سے ذکر کرنا جائز نہیں۔

(فتاویٰ رحیمیہ : ١٠/ ٢٣٨)

حضرت مفتی محمد شفیعؒ صاحب تحریر فرماتے ہیں اس میں اقوال بہت مختلف ہیں فیصلہ وہ ہے جو

علامہ شامی نے حاشیہ حموی سے امام سعدانی کا قول نقل کیا ہے

"اجمع العلماء سلفاً وخلفا علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرها الا أن یشوش جهرهم علی نائمه أو مصل او قاری الخ". (١/٦٩١)

یعنی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ذکر جہری کی مجلس قائم کرنا مسجد وغیر مسجد دونوں جگہ جائز ہے (بشرطیکہ شریعت کے خلاف اور کوئی بات نہ ہو) ہاں ذاکرین کے ذکر جہری سے سونے والوں کو یا نمازیوں اور تلاوت کرنے والوں کو تکلیف پہنچے تو ایسے وقت میں تکلیف دہ طریقہ سے ذکر نہیں کرنا چاہئے۔ (ماخوذ آداب المساجد)

اسی طرح اگر مسجد میں ذکر جہری سے بدعتوں اور نئی نئی چیزیں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتو ایسے موقع پر ذاکرین بھائی مسجد میں ذکر کرنے پر اصرار نہ کریں ان کو چاہئے کہ اپنے گھروں میں اس طرح ذکر کریں کہ سونے والوں اور نماز پڑھنے والوں وغیرہ کو تکلیف نہ پہنچے۔ (فتاوی رحیمیہ)

مسجد میں تبلیغی تعلیم کہاں کی جائے:

نماز ذکر وتلاوت میں خلل آئے اس طرح تعلیم کرنا منع ہے مگر تعلیمی سلسلہ بھی بہت اہم اور مفید ہے اس لئے دونوں سلسلے جاری رہ سکیں ایسی صورت اختیار کی جائے۔ مسجد بڑی ہوتو اس کے کسی گوشہ میں یا برآمدہ یا صحن میں تعلیم ہو اگر چھوٹی ہے تو کچھ انتظار کرے تاکہ نمازی حضرات نماز سے فارغ ہو جائیں۔ (ماخوذ از فتاوی رحیمیہ: ٦/١٠٠)

مسجد کی دیواروں پر آیات قرآنی لکھنا ممنوع ہے:

مسجد کے اندرونی اور بیرونی حصہ میں قرآن شریف کی آیت اور قابل تعظیم اشیاء لکھنا ممنوع ہے بے ادبی کے احتمال کی وجہ سے فقہاء اجازت نہیں دیتے۔

"لیس بمستحسن کتابة القرآن علی المحارب والجدران لما یخاف من سقوط الکتابة وأن توطا."

(طحطاوی علی الدر المختار: ١٠/٤٤٠، فتاوی رحیمیہ: ١٠/٢٤٣)

مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا:

بہت سے لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ مسجدوں میں آکر بھی دنیوی باتوں میں مشغول ہو جاتے

ہیں، بلکہ بہت سوں کو دیکھا گیا ہے جن کو مسجد میں ذرا زیادہ رہنا ہوتا ہے ان کے دل میں مسجد کا ادب واحترام بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

مسجد میں کھانا، پینا، سونا، آپس میں ہنسی مذاق کرنا حتیٰ کہ ایک دوسرے کی غیبت کرنا، بعض دفعہ اس قدر شور مچاتے ہیں کہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر مسجد ہے یا کوئی تفریح گاہ۔ (العیاذ باللہ)

حالانکہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص مسجد میں دنیا کی باتیں شروع کرتا ہے تو فرشتے پہلے کہتے ہیں "اسکت یا ولی اللّٰه" (اے اللہ کے ولی چپ رہ) پھر اگر وہ چپ نہیں ہوتا اور باتوں میں لگا رہتا ہے تو کہتے ہیں "اسکت یا بغیض اللّٰه" (اے اللہ کے دشمن چپ ہو جا) پھر اگر اس سے بھی آگے بڑھتا ہے تو کہتے ہیں "اسکت لعنة اللّٰه علیك" (تجھ پر خدا کی لعنت چپ رہ)۔ (کذا فی المدخل لابن الحاج آداب المساجد)

دوسری روایت میں ہے کہ آخری زمانہ میں ایسے لوگ ہوں گے جو مسجد میں آکر جگہ جگہ حلقہ بنا کر بیٹھ جائیں گے وہاں دنیا اور اس کی محبت کی باتیں کریں گے تم ایسے لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو مسجد میں ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں۔ (مشکوٰۃ بحوالہ شعب الایمان)

ان احادیث کی روشنی میں علماء کرام نے لکھا ہے کہ جو دنیا کی باتیں مسجد سے باہر جائز اور مباح ہیں مسجد میں وہ بھی ناجائز ہیں اور جو باتیں مسجد کے باہر بھی ناجائز ہوں وہ مسجد میں سخت حرام ہیں۔

"فتح القدیر" میں علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا لیتی ہیں جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہیں، اور "خزانۃ الفقہ" میں لکھا ہے، جو شخص مسجد میں دنیا کی باتیں کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے چالیس دن کے عمل حبط کر دیتے ہیں۔

(الاشباہ والنظائر)

مسجد میں بلند آواز سے تلاوت کرنا:

اگر مسجد میں لوگ نمازوں میں مشغول ہوں تو ایسی بلند آواز سے تلاوت کرنا جو لوگوں کی نماز میں مخل ہو، جائز نہیں ہے اس لئے تلاوت آہستہ کرے جس سے نمازیوں کو تشویش لاحق نہ ہو۔

مروّج صلوٰۃ وسلام:

بعض مسجدوں میں نماز جمعہ اور دیگر اوقات میں بھی کھڑے ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا رواج

ہے، اور عقیدۃً اسے ضروری سمجھتے ہیں، جبکہ اس کا ثبوت نہ تو خلفاء راشدین سے ہے نہ جماعت صحابہؓ سے اور نہ تابعین وتبع تابعین اور نہ بزرگان وسلف صالحین سے اور بتلایا جاتا ہے کہ یہ اظہار محبت اور عقیدت کا ایک طریقہ ہے حالانکہ اظہار محبت وعقیدت تو اتباع اور اطاعت سے ہوتا ہے۔

کما قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ ان كنتم تحبون الله فاتبعونى يحببكم الله ﴾ (الآية) (سورة آل عمران: ٣١)

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کردیں گے۔ ولنعم ما قيل.

تعصى الرسول وانت تظهر حبه، هذا العمرى فى الفعال بديع

لو كان حبك صادقا لاطعته، ان المحب لمن يحب مطيع

یعنی تم رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی بھی کرتے اور ان سے محبت کا اظہار بھی کرتے ہو، قسم خدا کی یہ بہت ہی عجیب بات ہے، اگر سچی محبت ہوتی تو ضرور ان کا اتباع کرتے کیوں کہ محبّ اپنے محبوب کی اطاعت کرتا ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ طریقہ اظہار محبت وعقیدت کا نہیں ہے بلکہ ریا ونمود اور خواہش پرستی ہے کئی بدعتوں کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے ناجائز اور قابل ترک ہے۔

مسجد کی زمین میں میت کو دفن کرنا:

آج کل ایک رواج یہ ہوگیا ہے کہ مسجد کی موقوفہ زمین میں بانی مسجد یا امام یا کسی بزرگ کے لئے مقبرہ بنایا جاتا ہے، جبکہ متولی یا منتظمہ کمیٹی کو شرعاً یہ حق نہیں ہے کہ موقوفہ زمین میں کسی کے لئے قبر بنانے کی اجازت دے، وہ جگہ صرف مصالح مسجد کے لئے خاص ہوگی اس کے علاوہ کوئی اور کام کرنا جائز نہیں ہے۔

صرح به عامة كتب الفقه، من الشامية والعالمگيرية.

(ماخوذ از امداد المفتيين: صـ ۷۸۸)

مسجد کی چھت پر جماعت کرانا:

مسجد کی چھت پر جماعت کرانا مکروہ ہے خواہ گرمی کی وجہ سے ہو یا کسی اور عذر سے البتہ مسجد اگر تنگ ہو تو زائد نمازی چھت پر جاسکتے ہیں۔

قال فى الهندية: الصعود على سطح كل مسجد مكروه ولهذا

اذا اشتد الحر يكره ان يصلوا بالجماعة فوقه الا اذا ضاق المسجد فحينئذ لايكره الصعود على سطحه للضرورة كذا فى الغرائب ،

(عالمگیریة : ۵/۳۲۲ ، احسن الفتاوی : ۶/۳۶۲)

مسجد میں چار پائی بچھانا:

بعض فقہاء غیر مسافر ومعتکف کے لئے مسجد میں سونا مکروہ ہے۔بحالت ضرورت شدیدہ یہ تدبیر اختیار کرسکتا ہے کہ پہلے بنیت اعتکاف داخل ہوکر کچھ عبادت کرے اس کے بعد سوئے۔

دراصل ادب یا بے ادبی کا مدار عرف پر ہے ہمارے عرف میں مسجد میں چار پائی بچھانا معیوب سمجھا جاتا ہے نیز اس سے عوام کے قلوب سے مسجد کی وقعت نکل جائے گی وہ چار پائی پر قیاس کرکے دوسرے ناجائز امور بھی مسجد میں شروع کردیں گے،لہٰذا مسجد میں چار پائی بچھانا جائز نہیں ،جیسے پہلے جوتے پہن کر مسجد میں آنا اور نماز پڑھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا مگر ہمارے عرف میں اسے مسجد کی بے ادبی سمجھا جاتا ہے اگر کوئی پاک جوتا بھی پہن کر مسجد میں آجائے تو عوام اس پر ہنگامہ برپا کردیں گے اس لئے جوتا پہن کر مسجد میں آنا مکروہ ہے۔(ماخوذ از احسن الفتاویٰ)

مسجد میں گمشدہ چیز کی تلاش:

گمشدہ چیز کی تلاش مسجد میں جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ مسجد کے احترام کے خلاف ہے کیوں کہ اس میں شور اور ہنگامہ ناگزیر ہے،آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

”من سمع رجلاً ينشد ضالة فى المسجد فليقل لاردها الله عليك فان المساجد لم تبن لهذا .“

جو کسی شخص کو سنے کہ وہ مسجد میں گمشدہ چیز کی تلاش کرتا ہے تو چاہئے کہ کہے اللہ تعالیٰ اس کو تجھ پر نہ لوٹائے کیوں کہ مسجد اس کام کے لئے نہیں بنائی گئی ہے۔

(مسلم باب النهى عن نشد الضالة : ۱/۲۱۰)

اس حدیث میں صرف گمشدہ چیز کی تلاش سے روکا ہی نہیں گیا ہے بلکہ اس میں اس پر زجرو توبیخ بھی موجود ہے اور ساتھ ہی اس کی علت بھی بیان کردی گئی ہے اس زمانہ میں خصوصیت سے اس حدیث پر عمل کرنا چاہئے اور اس حدیث کا مفہوم عام مسلمانوں کے ذہن نشین ہونا چاہئے ہاں اس وقت کوئی حرج سمجھ نہیں آتا جب چیز مسجد ہی میں گم ہوجائے تو آداب مسجد کا لحاظ کرتے ہوئے

تلاش کی جائے، باقی جو چیز مسجد سے باہر کہیں اور کھوگئی ہے اس کی جستجو ان مساجد کے ذریعہ کسی طرح مناسب نہیں ہے، اور مجمع الانھر میں ہے: جس جگہ لقطہ ملا ہو اس جگہ اعلان کرے اور اسی طرح لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ جیسے مسجد کا دروازہ اور بازار مالک تک خبر اور اس کی چیز پہنچانے کا یہ قریبی ذریعہ ہے۔

(مجمع الانهر : ۱/۱۳ كتاب اللقطة، ملخص از فتاوی رحیمیه)

بہتر یہ ہے کہ مسجد کے باہر گمشدہ چیز پہنچانے اور لینے کے لئے کوئی جگہ متعین کردی جائے اس تدبیر سے مسجد یں ہر وقت اعلان اور شور وشغب سے محفوظ رہیں گی۔

مسجد کے لئے مسجد میں چندہ کرنا:

بہتر اور مناسب صورت یہی ہے کہ مسجد کے باہر چندہ کیا جائے یا مسجد میں کسی بورڈ پر چندہ کی اپیل لکھ دی جائے البتہ اگر اس طرح چندہ کرنے سے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوتی ہو اور مسجد میں جمعہ کے دن چندہ کرنے سے مسجد کا زیادہ فائدہ ہو تو اس شرط کے ساتھ برائے مسجد، مسجد میں چندہ کرنے کی گنجائش ہے کہ نمازیوں کو تکلیف نہ ہو، ان کی گردن نہ پھاندے، نمازی کے سامنے سے نہ گذرے مسجد میں شور وشغب نہ ہو، مسجد کے احترام کے خلاف کوئی کام نہ ہو اور لوگوں کے سامنے کسی کو شرم اور غیرت میں ڈال کر زبردستی چندہ وصول نہ کیا جائے ان شرائط کی رعایت ضروری ہے اگر ان کی رعایت نہ ہو سکے تو مسجد میں چندہ نہ کیا جائے۔

وفي الشامية قال : والمختار ان السائل ان كان لايمر بين يدى المصلى ولا يتخطى الرقاب ولا يسأل الحافا بل لامر لابد منه فلابأس بالسوال والاعطاء اه ومثله في البزازية ولا يجوز الاعطاء اذا لم يكونوا على تلك الصفة المذكورة شامى باب الجمعة . (فتاوی رحیمیه : ۹/۲۳۹)

مدارس کے لئے مسجد میں چندہ کرنا:

عام حالات میں مسجد میں مدارس کے لئے چندہ نہ کرنا چاہئے مسجد میں شور وغل ہوگا نمازیوں کو خلل ہوگا، مسجد کی بے احترامی ہوگی لہٰذا مسجد میں چندہ نہ کیا جائے البتہ اگر کوئی خاص حالت ہو، تو حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں "اگر شق صفوف (یعنی گردن نہ پھاندے) نہ ہو اور نمازیوں کے سامنے سے نہ گذرے اور تشویش علی المصلین نہ ہو اور حاجت ضروریہ ہو تو درست

ہے۔(امداد الفتاوی : ۲/ ۲۴۱)

مسجد میں ہوا خارج کرنا:

مسجد میں ہوا خارج کرنا ناجائز ہے کہ فرشتوں کو ہر اس چیز سے ایذاء ہوتی ہے جس سے انسانوں کو ایذا ہوتی ہے (اشباہ) چونکہ معتکف اس حکم سے مستثنیٰ نہیں ہے اس لئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں اس کو ہوا خارج کرنے کے لئے باہر نکلنا چاہئے۔(آداب المساجد)

حضرت محمود حسن صاحبؒ فرماتے ہیں جو شخص کثرت ریاح کا مریض ہو اس کو یا تو بار بار مسجد سے نکلنا ہوگا یا کراہت کا ارتکاب کثرت سے کرنا ہوگا۔

لہٰذا احوط یہی ہے کہ ایسا شخص اعتکاف نہ کرے بلکہ اللہ پاک سے دعا کرتا رہے اس کو آرزو اور تمنا کا اجر ملے گا۔

واختلف فی الذی یفسو فی المسجد فلم یر بعضهم بأسًا وبعضهم قالوا لا یفسو ویخرج اذا احتاج الیه وهو الاصح کذا فی التمر تاشی . (عالمگیریه : ۵/ ۳۲۱)

مسجد کے روپیہ کو تجارت میں لگانا:

مسجد کی آمدنی اگر ضروریات مسجد سے زائد ہو تو مسجد کے نفع کے لئے اس کو تجارت میں لگانا جائز ہے۔(امداد المفتیین : ص ۷۸۰)

مسجد میں خرید وفروخت:

مسجد میں خرید وفروخت اور جملہ معاملات نکاح کے علاوہ ناجائز ہیں، البتہ معتکف کے لئے بقدر حاجت جائز ہے بشرطیکہ سامان فروخت مسجد میں داخل نہ کرے۔ (آداب المساجد)

مسجد میں عقد نکاح مستحب ہے:

قال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم : اعلنوا هذا النکاح واجعلوه فی المساجد . (مشکوٰة بحواله ترمذی)

یعنی جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ’’تم نکاح کا اعلان کیا کرو اور نکاح کی مجلس مسجد کے اندر منعقد کیا کرو‘‘۔(ترمذی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح مسجد کے اندر کرنا مستحب ہے اسی طرح جمعہ کے دن کرنا

بھی مستحب ہے کیوں کہ مسجد میں اور جمعہ کے دن نکاح کرنے سے برکت حاصل ہوتی ہے۔

(مظاہر حق جدید)

البتہ یہ بات خوب یاد رکھنے کی ہے کہ مسجد کے ادب واحترام ملحوظ رہے شور شغب سے احتراز کیا جائے اور چھوٹے بچے جو آداب المساجد سے ناواقف ہیں ان کو مسجد میں نہ لایا جائے اسی طرح کوئی گناہ کا کام نہ کیا جائے خصوصاً بعض ناداں تصویر کشی کی کوشش کرتے ہیں جو عام حالات میں بھی گناہ کبیرہ ہے پھر مسجد جیسی مقدس جگہ میں یہ اس کی قباحت وشناعت اور بھی بڑھ جاتی ہے، اسی طرح ہار وغیرہ مسجد کے اندر نہ پہنایا جائے کیوں کہ اس سے پتے وغیرہ گرنے کی وجہ سے تلویث مسجد کا خطرہ ہے۔

مسجد میں افطار کرنا:

آج کل جس طرح مساجد کے اندر افطار کرنے کا دستور ہے اس میں مسجد کی تلویث اور بے حرمتی ہوتی ہے لہٰذا یہ جائز نہیں۔ مسجد کی منتظمہ کمیٹی پر ضروری ہے کہ اذان کے بعد اتنا وقفہ دے کہ محلّہ کے نمازی گھروں میں اطمینان سے افطار کر کے مسجد میں پہنچ سکیں۔ (احسن الفتاویٰ) ہاں البتہ مسافر کے لئے مسجد سے باہر بقدر ضرورت انتظام کرے تا کہ سہولت رہے۔

مسجد کا مکان بینک یا کسی بھی حرام کام کرنے والے کو کرایہ پر دینا:

بینک یا کسی بھی خلاف شرع امور انجام دینے کو مسجد کا مکان کرایہ پر دینا تعاون علی الاثم کے مترادف ہے اور قرآن کریم میں تعاون علی الاثم کی ممانعت آئی ہے ارشاد خداوندی ہے:

﴿ و لا تعاونوا علی الاثم و العدوان ﴾

گناہ اور زیادتی کے کاموں میں معاونت مت کرو، لہٰذا شرعاً ان کو مکان کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۱۰۸/۶)

مسجد کی رقم کا سود:

اول تو مسجد کا روپیہ بینک میں جمع کرنا جبکہ حفاظت کا دوسرا ذریعہ موجود ہو خلاف احتیاط ہے اور اگر غلطی سے یا غفلت سے یا قانونی مجبوری کی وجہ سے رقم بینک میں رکھی ہو اور اس پر سود ملا ہو تو وہ مسجد کے بیت الخلاء، غسل خانہ کی مرمت یا صفائی کی چیزوں میں خرچ کیا جائے اگر اس میں ضرورت نہ ہو تو غرباء کو دیدیا جائے، رفاہ عام کے کاموں میں بھی استعمال کر سکتے ہیں، مسجد پر یہ رقم

خرچ نہ کی جائے کہ یہ تقدس مسجد کے خلاف ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ بحوالہ کفایۃ المفتی)

مسجد میں غیر مسلم کا چندہ لینا:

اگر غیر مسلم اپنے اعتقاد سے اسے قربت سمجھتا ہو تو اس کا چندہ لینے کی گنجائش ہے مگر اس زمانہ میں غیر مسلم کی رقم مسجد میں استعمال کرنے سے بچنا چاہئے غیر مسلم کا مسجد پر احسان چڑھے گا اور کسی وقت ان کے مذہبی کاموں میں چندہ دینا اور شرکت کرنا پڑے گی لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

(فتاویٰ رحیمیہ، امداد المفتیین)

مسجد میں نماز جنازہ:

بلا عذر مسجد میں نماز جنازہ مکروہ تحریمی ہے، خواہ جنازہ مسجد کے اندر ہو یا باہر البتہ نماز جنازہ کے لئے کوئی دوسری جگہ نہ ہو تو عذر کی وجہ سے مسجد میں جنازہ پڑھنے میں کراہت نہیں۔

(شامی، احسن الفتاویٰ: ۱۸۳/٤)

مسجد میں جماعت ثانیہ:

بعض لوگ جماعت سے رہ جاتے ہیں پھر ان کو مسجد میں دوسری جماعت کرانے کا شوق ہوتا ہے حالانکہ جماعت ثانیہ جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے کہ: مسجد محلّہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں دوسری جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ قولہ ویکرہ ای تحریماً۔ (شامی)

پس اس میں شرکت کرنا درست نہیں اور مقتدی مستحق ثواب نہیں جماعت ثانیہ کی عادت موجب تقلیل جماعت اُولیٰ ہے، یہ بھی ایک وجہ فقہاء نے ممانعت جماعت ثانیہ کی تحریر فرمائی ہے اور فعل مکروہ میں شرکت واعانت ظاہر ہے کہ موجب ثواب نہیں ہوسکتا۔

(عزیز الفتاویٰ: صـ ۱۹۰)

مسجد میں چھوٹے بچوں کو لانا:

مسجد میں چھوٹے بچوں کو لانے کی شرعاً اجازت نہیں ہے اس سے مسجد کا ادب واحترام باقی نہیں رہے گا اور لانے والے کو بھی اطمینان قلب نہ رہے گا، نماز میں کھڑے ہوں گے مگر خشوع وخضوع نہ ہوگا، بچوں کی طرف دل لگا رہے گا، حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

"جنبوا مساجد کم صبیا نکم و مجانینکم الخ".

یعنی اپنی مسجدوں کو بچوں اور پاگلوں سے بچاؤ۔ (ابن ماجه : صـ ٥٥)

اسی لئے فقہاء کرام رحمہم اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسجد میں بچوں کو داخل کرنا اگر اس سے مسجد کے نجس ہونے کا اندیشہ ہو تو حرام ہے وگرنہ مکروہ ہے۔ (الاشباه النظائر : صـ ٥٥٧)

ہاں البتہ اگر بچہ سمجھدار ہو، نماز پڑھتا ہو، مسجد کے ادب واحترام کا پاس ولحاظ رکھتا ہو تو اس کو مسجد میں لانے میں کوئی حرج نہیں، غالباً اسی بناء پر سات سال کی قید حدیث میں موجود ہے یعنی سات سال سے کم عمر کے بچوں کو نہیں لانا چاہئے اس سے بڑی عمر کے بچوں کو آداب واحترام کی تعلیم دے کر لانا چاہئے، وہ نابالغ بچوں کی صف میں کھڑا رہے اگر صرف ایک ہی بچہ ہے تو وہ بالغوں کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے مکروہ نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیه : ۱۲۱/۳)

مسجد کی صفائی کا اہتمام:

مسجد کی صفائی ستھرائی کا اہتمام کرنا امت محمدیہ ﷺ کے لئے کس حد تک ضروری ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ بنفس نفیس مسجد کی صفائی فرماتے تھے، حضرت یعقوب بن زیدؓ سے روایت ہے:

" ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یتبع غبار المسجد بجریدة." (مصنف ابن ابی شیبة : ۳۹۸/۱)

یعنی جناب نبی کریم ﷺ مسجد کے گرد وغبار کو کھجور کی ٹہنی سے صاف کیا کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق منقول ہے کہ وہ ایک مرتبہ گھوڑے پر سوار ہو کر مسجد قباء تشریف لے گئے اس میں نماز پڑھی پھر فرمایا "اے یرقا (کسی شخص کا نام ہے) مجھے کھجور کی ایک ٹہنی لا کر دو، اس نے لا کر دی آپؓ نے ایک کپڑے سے اپنی کمر باندھی اور تمام مسجد میں جھاڑو دی۔ (مصنف ابن ابی شیبه : ۳۹۸/۱)

اسی طرح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے اعمال کے ثواب سب میرے سامنے پیش کئے گئے یہاں تک کہ ایک ایسا تنکا کہ جس کو کسی شخص نے مسجد سے نکالدیا ہو اس کا ثواب بھی پیش کیا گیا اور میری امت کے سارے گناہ بھی پیش کئے گئے، پس میں نے کوئی گناہ اس سے بڑا نہیں دیکھا کہ آدمی قرآن مجید کی کوئی آیت یاد کر کے پھر بھول جائے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ابو داؤد ، ترمذی)

احکام الاکراہ

مجبور شخص کے احکام:

الاکراہ لغۃ: الالزام والاجبار، یقال: اکرہ علی فعل کذا اذا جبرہ علیہ دون رضاہ.

جبرواکراہ کی اصطلاحی تعریف:

کسی انسان کو قتل یا سخت اذیت یا مال تلف کرنے کی دھمکی دے، کسی خلاف شرع یا خلاف طبع کام کرنے پر مجبور کرنا۔

الاکراہ: حمل الغیر علی مایکرہ بالوعید بالقتل او التھدید بالضرب الشدیداو باتلاف المال اوبالا ذی الجسدی قال صلی اللّٰہ علیہ وسلم رفع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیہ ای ما اکرھوا علیہ من قول او فعل جبرًا وقھرا، دون اختیار.

اخرجہ ابن ماجہ فی سننہ رقم: ۲۰۵۳، بلفظ ان اللّٰہ تجاوز لی عن امتی: الخطأ والنسیان، وما استکرھوا علیہ. (فقہ المعاملات)

اکراہ کی دو قسمیں:

(۱) اکراہ غیرملجی:

یعنی کسی کو ایسے قول وفعل پر مجبور کیا جائے جس کے کہنے اور کرنے پر وہ دل سے راضی نہیں، مگر ایسا بے اختیار و بے قابو بھی نہیں کہ انکار نہ کر سکے، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ غیر ملجی کہلاتا ہے، ایسے اکراہ سے کوئی کلمۂ کفر کہنا یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا، البتہ بعض جزئی احکام میں اس پر بھی کچھ اثرات مرتب ہوتے ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ میں مفصل مذکور ہے۔

(۲) اکراہ ملجی:

یعنی اکراہ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اسلوب اختیار کر دیا جائے کہ اگر اکراہ کرنے والوں کے کہنے پر عمل نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ ملجی کہلاتا ہے۔

ایسے اکراہ کی حالت میں کلمۂ کفر زبان سے کہہ دینا، بشرطیکہ دل ایمان پر مطمئن ہو جائز ہے، اسی طرح دوسرے انسانوں کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی حرام فعل کرنے پر مجبور کر دیا جائے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں۔

مگر دونوں قسموں میں شرط یہ ہے کہ اکراہ کرنے والا جس کام کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس پر قادر بھی ہو اور جو شخص مبتلاء ہے اس کو غالب گمان یہ ہو کہ اگر میں اس کی بات نہ مانوں گا تو جس چیز کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس کو ضرور کر ڈالے گا۔ (تفسیر مظہری، معارف القرآن: ص ۴۰۷/ ج ۵)

قال في ملتقى الابحر: وشرط الاكراه قدرة المكره، اسم فاعل، على ما هدد به، سلطانا كان أولصا وخوف المكره، اسم مفعول، وقوع ذلك، وكونه ممتنعاً قبله عن فعل ما أكره عليه، لحقه، أو لحق آخر، أولحق الشرع وكون المكره به متلفا نفسه أو عضوًا أوموجباً غماً يُعدم الرضا.

(ملتقى الابحر للامام ابراهيم الحلبي: ۱۷۸/۲)

اکراہ سے حرام کے ارتکاب پر گناہ نہ ہونے کی دلیل ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

والاصل في هذا قول الله تبارك وتعالىٰ في أعظم الذنوب، وهو الكفر: ﴿ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

(سورة النحل: الآيتان ۱۰۶ـ۱۰۷)

یعنی جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے مگر جس شخص پر زبردستی کی جائے، بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو لیکن ہاں جو جی کھول کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا، اور ان کو بڑی سزا ہوگی اور یہ اس سبب سے ہوگا کہ انہوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا اور اس سبب سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا۔
(بیان القرآن)

یہ آیت صحابۂ کرام کے بارے میں نازل ہوئی جن کو مشرکین نے گرفتار کرلیا تھا، اور کہا تھا کہ وہ کفر اختیار کریں ورنہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

یہ گرفتار ہونے والے حضرات، حضرت عمارؓ، اوران کے والدین یاسرؓ اور سمیہؓ اور صہیب اور بلالؓ اور خباب رضی اللہ عنہم تھے، جن میں سے حضرت یاسر اوران کی زوجہ سمیہ نے کلمۂ کفر بولنے سے قطعی انکار کیا، حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا، اور حضرت سمیہ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر ان کو مختلف سمتوں کی طرف دوڑایا گیا جس سے ان کے دو ٹکڑے الگ الگ ہو گئے اور وہ شہید ہوئیں یہی دو بزرگ ہیں جن کو اسلام کی خاطر سب سے پہلے شہادت نصیب ہوئی، اسی طرح خباب رضی اللہ عنہ نے کلمۂ کفر بولنے سے قطعی انکار کر کے بڑے اطمینان کے ساتھ قتل کئے جانے کو قبول کیا، ان میں سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے جان کے خوف سے زبانی کلمۂ کفر کا اقرار کرلیا، مگر دل ان کا ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، جب دشمنوں سے رہائی پا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بڑے رنج وغم کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار کیا، آنحضرت ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ جب تم یہ کلمہ بول رہے تھے تو تمہارے دل کا کیا حال تھا، انہوں نے عرض کیا کہ دل تو ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کو مطمئن کیا کہ تم پر اس کا کوئی وبال نہیں، آپ ﷺ کے اس فیصلہ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (قرطبی، مظہری)

وقال العلامة الصابونی حفظه الله :

ومن سبب نزول الآية الكريمة ، يتّضح لنا بجلاء حكم الاكراه الملجى ، الذى تحدث عنه الفقهاء ، والذى يبيح للمسلم فعل ما أكره عليه .

أ- روى الحافظ ابن كثير من سبب نزول هذه الآية أن "عمار بن ياسر" رضى الله عنه ، أخذه المشركون فعذّبوه ، عذاباً شديداً ، حتى قاربهم ، اى وافقهم ، فى بعض ما أرادوا ، وأظهر الكفر على لسانه فشكا ذلك الى النبى صلى الله عليه وسلم ، فقال له الرسول صلى الله عليه وسلم : كيف تجد قلبك؟ فقال يا رسول الله : أجده مطمئناً بالايمان !! فقال له عليه الصلاة والسلام : "ان عادوا

فعد"تفسیر ابن کثیر : ۲/۶۰۹،أی ان عادوا الی تعذیبك و اکراهك ، فعُد الی ما قلت لهم .

ب۔ وروی الحاکم والبیهقی ، أن "عمار بن یاسر" لما أکرهه الکفار علی سبّ محمد صلی اللّٰه علیه وسلم ، رجع الی رسول اللّٰه علیه السلام،فقال له : ماوراءك یا عمار؟ قال : شریا رسول اللّٰه، ماترکونی حتی سببتك وذکرت آلهتهم بخیر!!

قال : کیف تجد قلبك ؟ قال : مطمئناً بالایمان ، فقال له صلی اللّٰه علیه وسلم :

"فان عادوا فعُد" وفی ذلك أنزل اللّٰه تعالیٰ : ﴿ اِلَّا مَنْ اُکْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ ﴾ الآیة .

(اخرجه الحاکم والبیهقی ، وقال الحاکم : صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه انظر نصب الرایة : ۴/۱۵۸)

کفر پر اکراہ کے وقت ایمان پر ثابت قدم رہنا افضل ہے:

اگر کوئی مسلمان کسی کافر کی قید میں آجائے اور وہ کلمۂ کفر پر مجبور کرے اور بصورت دیگر قتل کی دھمکی دے تو شرعاً زبان سے کلمۂ کفر کہنے کی جواجازت ہے یہ گنجائش اور رخصت ہے اس وقت بھی عزیمت کا راستہ یہی ہے کہ زبان سے بھی کلمۂ کفر نہ کہے اور ایمان پر ثابت قدم رہے، اور کفریہ طاقت کے سامنے ڈٹ جائے اور جان دیدے، صحابۂ کرام کے بکثرت واقعات ہیں، جن میں انہوں نے ایمان پر ثابت قدمی دکھائی اور جان قربان کردی، چنانچہ ذیل میں صحابہ کرام کے ایمان پر ثابت قدمی کے چندواقعات نقل کئے جاتے ہیں جو بعد کے مسلمانوں کیلئے یقیناً مشعل راہ ہیں۔

۱۔ ویدل علی ذلك ماروی أن "مسیلمة الکذاب "الذی ادّعی النبوة، وقع تحت یدیه رجلان من اصحاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی الأسر، فجئی بهما الیه ، فقال لأحدهما : ما تقول فی محمد؟قال : هو رسول اللّٰه !!

قال : فما تقول فیّ ؟ قال وأنت أیضاً!! فخلی سبیله!

وحيء بالآخر، فقال: ما تقول في محمد؟ قال: أشهد أنه رسول الله!!

قال: فما تقول في؟ فقال: ماذا تقول؟ أنا أصم لا أسمع!،

فأعادها عليه ثلاثاً، وفي كل مرة يجيبه بالجواب نفسه: أنا أصم لاأسمع، فقتله عدو الله!!

فبلغ خبرهما رسول الله صلى عليه وسلم، فقال: "أما الأول فقد أخذ برخصة الله عز وجل، وأما الثاني فقد صدع بالحق فهنيئا له الجنة".

(انظر التلخيص الحبير: ص ۲۷۱، تفسير القرطبي، ۱۸۹/۱۰)

(۱)

یعنی جھوٹا مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کے لوگوں نے دو صحابۂ کرام کو گرفتار کرلیا اور مسیلمہ کے پاس حاضر کردیا، اس نے ایک صحابی سے پوچھا کہ تم محمد کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو، تو انہوں نے کہا وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، پھر دوبارہ پوچھا کہ میرے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو، تو انہوں نے (جان بچانے کے لئے زبان سے کہہ دیا) کہ تم بھی رسول ہو تو ان کو قید سے رہا کردیا۔

دوسرے صحابی کو مسیلمہ کے سامنے لایا گیا تو اس نے سوال کیا کہ محمد ﷺ کے بارے میں کیا عقیدہ ہے تو جواب دیا، اشهد انه رسول الله یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں پھر مسیلمہ نے اپنے بارے میں پوچھا میرے بارے میں کیا عقیدہ ہے تو صحابی نے جواب دیا کیا پوچھتے ہو؟ میں تو بہرہ ہوں سنتا نہیں ہوں، تو مسیلمہ نے اپنے بارے میں تین مرتبہ پوچھا، صحابی رسول نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ مجھے تمہاری بات سنائی نہیں دے رہی ہے، تو اس صحابیؓ کو قتل کروادیا، رسول اللہ ﷺ کو جب اس واقعہ کی خبر پہنچی تو ارشاد فرمایا کہ، پہلے شخص نے تو اللہ تعالیٰ کی رخصت پر عمل کیا، لیکن دوسرا حق پر ثابت قدم رہا، (اور جان دیدی) اس کو یہ ثابت قدمی مبارک ہو اور اس کے لئے جنت کی خوش خبری ہے، یہ واقعہ التلخیص الحبیر میں ہے اور تفسیر قرطبی میں بھی۔

۲۔ وعذب المشركون "ياسراً" والد "عمار" حتى مات تحت

العذاب ، من أجل دينه، كما استشهدت "سمية"ام عماربن ياسر ، قتلها أبو جهل عدو الله، بحربة قطع بها أمعاءها، لأنها أبت الكفر ، وثبتت على الاسلام ، فكانت أول شهيدة من النساء في الاسلام ، وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يمرُّ على هؤلاء المعذبين من آل ياسر، فيقول لهم : صبرًا آل ياسر ، فان موعدكم الجنة .

٣۔ يروى لنا الامام البخارى فى صحيحه ، ما أصاب المسلمين من شدائد ومحن ، فيقول بسنده عن خباب بن الأرت رضى الله عنه قال : شكونا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم ، وهو متوسد بردة له فى ظل الكعبة، وقد لقينا من المشركين شدة فقلنا يا رسول الله : ألا تستنصر لنا !!ألا تدعولنا!! .

فقال لهم صلى الله عليه وسلم : قد كان من قبلكم ، يؤخذ الرجل فيحفر له فى الأرض ، يعنى حفرة فيجعل فيها ، ثم يؤتى بالمنشار، فيوضع على رأسه فيجعل نصفين ، أى ينشر حتى يقع على الأرض شقين ، ويمشط بأمشاط الحديد مادون لحمه وعظمه ، ما يصده ذلك عن دينه!! .

والله ليتمن الله هذا الأمر ، أى يظهر دين الاسلام، حتى يسير الراكب من صنعاء الى حضر موت ، لا يخاف الا الله، والذئب على غنمه ، ولكنكم تستعجلون . (اخرجه البخارى رقم : ٣٦١٢)

(۲)

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کے سایہ میں چادر لپٹے ہوئے تشریف فرما تھے ہمیں مشرکین کی طرف سے سخت اذیت پہنچ رہی تھی ،ہم نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ) کیا آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب نہیں فرماتے ؟ کیا آپ ہمارے حق میں دعا نہیں فرماتے ؟

آپ ﷺ نے تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ گذشتہ انبیاء کی امتوں کو طرح طرح کی تکلیفیں

دی گئیں ہیں ان پر سخت آزمائشیں آئی ہیں حتی کہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ گڑھا کھود کر اس میں ڈال دیا جاتا پھر آری سے ان کے سر کو چیر کر دو ٹکڑے کر کے زمین پر پھینک دیتے اور بعض لوگوں کے زندہ جسموں پر لوہے کی کنگی کی جاتی جس سے تمام گوشت ادھڑ جاتا جسم پر صرف ہڈی رہ جاتی، لیکن یہ تمام تکالیف ومشقتیں ان کو دین حق سے نہ پھیر سکیں۔

اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ دین اسلام کو ضرور غلبہ عطاء فرمائیں گے، یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا، دین کی برکت سے ایسا امن وسکون قائم ہوگا کہ ایک شخص صنعاء یمن سے حضر موت تک تنہا سفر کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ کے سواء کسی کا خوف نہ ہوگا جیسے بھیڑیا سے بکریوں پر نقصان کا خوف نہ ہو، لیکن تم مدد اور غلبۂ اسلام کی طلب میں جلدی مچاتے ہو۔ (بخاری)

٤ـ وقصة "خبيب بن عدی" رضی اللّٰه عنه، رمز للبطولة والفداء، والشهادة فی سبيل اللّٰه، فقد غدر المشركون ببعض الصحابة، الذين أرسلهم رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، لتعليم القرآن والدعوة الى اللّٰه، فوقع "خبيب بن عدی" فی شباكهم، فنزلوا به الى مكة وباعوه لكفار قريش، فعذبوه عذاباً شديدًا ليجبروه على الكفر، ويردوه عن الاسلام، وطلبوا منه أن يسب محمدًا صلى اللّٰه عليه وسلم ويذكر آلهتهم بخير، فلم يسب الا آلهتهم، ولم يذكر رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الا بخير.

ولما يئسوا من كفره، عزموا على قتله، اجتمع حوله الأشرار الفجار، ليروا مصرعه، ولما أرادو اقتله طلب منهم أن يصلی ركعتين، فأذنوا له، فأوجز فی صلاته، وقال: واللّٰه لولا أن يظنوا بی الجزع، أی الخوف من الموت، لأطلت فی الصلاة، ثم طلب منهم أن يلقوه على وجهه ليموت وهو ساجد، فأبوا عليه ذلك، فرفع يديه نحو السماء ثم قال: اللهم انی لا أرىٰ الا وجه عدو، فأقرأ رسول اللّٰه منی السلام، ثم دعا على المشركين فقال: اللهم أحصهم عددًا، واجعلهم بددًا، ولا تبق منهم أحدًا، ثم أنشد يقول:

ولستُ أبالي حين أقتل مسلما

على أي جنب كان في الله مصرعي

ولست بمبد للعدو تخشعا

ولا جزعا أني الى الله مرجعي

فلما قتلوه وصلبوه ، تحول وجهه نحو القبلة، وأخبر عنه الرسول صلى الله عليه وسلم فقال :

" هو رفيقي في الجنة" فهذا دليل على أن الثبات على الايمان أفضل من الأخذ بالرخصة . "

(روى قصته الامام احمد ، وابوداؤد ، والنسائي ، انظر نصب الراية : ٤/١٥٩)

(۳)

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے تعلیم قرآن اور دینِ اسلام کی دعوت کے لئے مدینہ منورہ سے وفد کی شکل میں روانہ فرمایا تھا، لیکن اتفاق سے کفار کی غداری اور دھوکہ کی وجہ سے ان کے قید میں آ گئے اور ان کو گرفتار کر کے مکہ مکرمہ لے جایا گیا، اور قریش مکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا، قریش نے انہیں سخت تکلفیں پہنچا ئیں اور بہت ڈرایا دھمکایا تا کہ وہ دین اسلام سے پھیر جائیں اور کفر کی طرف لوٹ آئیں، اور ان سے مطالبہ کرتے رہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سب وشتم کریں اور کفار کے معبودان باطلہ کی تعریف کریں ، لیکن ہر دفعہ ان معبودان باطلہ کی مذمت اور رسول اللہ ﷺ کی تعریف ہی فرماتے رہیں، جب کفار مکہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے کفر وارتداد سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے قتل کا ارادہ کرلیا ، اور ان کے قتل گاہ کے گرد کفار کا مجمع جمع ہو گیا تا کہ قتل کا نظارہ کریں، اس وقت حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کفار سے اجازت طلب کی تا کہ وہ دو رکعت نماز پڑھ لیں چنانچہ اجازت مل گئی اور مختصراً دو رکعت نماز پڑھی ، پھر ارشاد فرمایا بخدا اگر مجھے اس طعنہ کا خوف نہ ہوتا کہ یہ مسلمان موت سے گھبرا گیا تو میں طویل نماز پڑھتا ، پھر کفار سے درخواست کی کہ مجھے اوندھے منہ لٹایا جائے تا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کی حالت میں موت آئے لیکن کفار نے اس بات کو قبول نہیں کیا، تو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے آسمان کی طرف

ہاتھ اٹھایا اور دعا کی، اے اللہ یہاں تو دشمن کے چہروں کے علاوہ کوئی چہرہ نظر نہیں آ رہا ہے، پھر مشرکین کے خلاف بددعا کی:

اللّٰهم احصهم عددا ، و اجعلهم بددا ، و لا تبق منهم احدا .

یعنی اے اللہ ان کفار کو گن گن کر قتل کر دے، اور ان کو منتشر کر دے، اور ان میں سے کسی کو روئے زمین پر باقی نہ چھوڑیئے، پھر مذکورہ بالا اشعار کہے جن کا مطلب یہ ہے:

جب ایمان کی حالت میں موت نصیب ہو رہی ہو تو مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اللہ کی خاطر جان دینے کے بعد میری لاش کس سمت میں گر رہی ہوگی، میں کفار کے سامنے جزع وفزع کا اظہار نہیں کروں گا میرا مرجع وماویٰ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

قصة عبد اللّٰه بن حُذافة السهمي

٥ـ وذكر الحافظ ابن كثير في تفسيره ، هذه القصة الرائعة ، قصة "عبد اللّٰه بن حُذافة "أحد صحابة النبي صلى اللّٰه عليه وسلم ، أنه كان في أحد المعارك مع الروم، فوقع أسيرًا مع بعض المسلمين في أيدي الروم،وأخبر ملك الروم بأن بين الأسرى رجل من الصحابة ، فأمر به فأُحضر، فعرض عليه أن يتنصر ، وقال له : أزوّجك ابنتي ، وأقاسمك نصف ملكي ، ان دخلت في النصرانية،وتركت دين محمد!!

فقال له عبد اللّٰه : واللّٰه لو أعطيتني كل ما تملك ، وكل ما يملكه العرب، وكل ما في الدنيا ، على أن أترك دين محمد طرفة عين، مافعلت !!

فقال له ملك الروم : اذا أقتلك !!قال : افعل ما بدا لك وماشئت!!

فأمر به الملك أن يصلب على عمود ، وأمر الرماة أن يرموه بالسهام في غير مقتل ، وهو يعرض عليه النصرانية فيأبى !!

ثم أمر بانزاله، وأمر الجند أن يأتو اله بقدر كبيرة ، فأحمى عليها حتى صارت حمراء لاهبة من شدة الحرارة ، وأمر هم أن يأتوا بأسير

من المسلمين ، فأتى به فألقوه فى القدر ، فاذا به عظام تلوح ، وعرضوا على الصحابى النصرانية وهو يأبى ، فأمر به الملك أن يلقى فى القدر ، فوضعوه فى البكرة ليلقوه فى النار ، فبكى ، فطمع به ملك الروم وأمر باعادته اليه ، وقال له : ما يبكيك !!

قال : ابكى لأنها نفس واحدة تموت فى سبيل الله ، وكنت أتمنى أن يكون لى مائة نفسٍ تموت فى سبيل الله!!

فلما رأى ملك الروم صلابة دينه ، أمر أن يحبس فى مكان ضيق ، وأن يمنع عنه الطعام والشراب أياماً ، ثم اتي بخمر ولحم خنزير ليأكل منه ، بعد ثلاثة أيام ، وقد كاد الجوع والعطش أن يهلكه ، فأبى أن يأكل ، فأخبر الملك فدعاه فقال له : لِمَ لَمُ لم تأكل من الطعام ، وقد أوشكت على الموت؟

فقال : انى أعلم أنه يحل لى ، لأننى مضطر ، ولكنى ماأردت أن أشمتك فى دين محمد !!

فقال له الملك : قبل رأسى وأنا أطلق سراحك!! فقال له عبد الله : أقبل رأسك ، بشرط أن تطلق معى جميع أسرىٰ المسلمين ، فقال له : أفعل ذلك ، فقبل الصحابى رأسه ، فأمر باطلاق سراحه ، واطلاق جميع الأسرى من المسلمين .

ولما رجع الى المدينة المنورة ، كان الخبر قد وصل الى عمر رضى الله عنه وهو خليفة المسلمين ، فلما دخل عليه قام نحوه عمر مسرعاً وقال : "حق على كل مسلم ، أن يقبل رأس " عبد الله بن حذافة " وأنا أول من يفعل ذلك ، فقبل عمر رأسه ، وقبل المسلمون رأسه " .

وهكذا تكون الصلابة فى الدين ، أعز للمسلم ولدين الله ، بحيث ترغم أنوف الأعداء ، والأخذ بالعزيمة أفضل من الأخذ

بالرخصة كما ذكر العلماء .

(انظر تفسير حافظ ابن كثير : ٢/ ٦١٠، وقد روى هذه القصة عن الحافظ ابن عساكر)

دوسرے مسلمان کے مال تلف کرنے پر جبر واکراہ:

جب کسی مسلمان کو قتل وغیرہ کی دھمکی کے ذریعہ مجبور کیا جائے کہ دوسرے مسلمان کا مال تلف کرے تو شرعاً حکم یہ ہے کہ مال تلف کر کے اپنی جان بچالے بعد میں "مکرہ" یعنی مجبور کرنے والے کے ذمہ ضمان لازم ہوگا، البتہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکراہ کی صورت میں بھی دوسرے مسلمان کا مال تلف کرنا حرام ہے، کیوں کہ یہ حق العبد ہے۔

قال العلامة الصابوني حفظه الله :

اذا أكره انسان على اتلاف مال مسلم، فيرخص له عند الاكراه التام الملجيء، لأن مال الغير يباح عند الضرورة، وعند شدة المخمصة، المجاعة، والضرورة متحققة هنا بسبب الأكراه، قال تعالىٰ : ﴿ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ والرخصة هنا ترفع عنه اثم المؤاخذة الأخروية، المراد بالاكراه التام هو احراق المال، أو مافي معناه عند الجمهور "الشافعية، والحنفية، والحنابلة"

(انظر الفقه الاسلامي وادلته للدكتور وهبة الزحيلي : ٥/ ٢٩٤)

وقال المالكية : لا يرخص له في الاحراق ، لتعلق حق العبد به، وقد قال صلى الله عليه وسلم :

" كل المسلم على المسلم حرام : دمه، وماله، وعرضه، "

والصحيح قول الجمهور .

قال في ملتقى الأبحر : وان أكره على اتلاف مال مسلم، بالقتل، أو قطع عضومنه، رخص له أن يفعل ذلك، والضمان على المكره".

(ملتقى الابحر : ٢/ ١٨٠)

خنزیر کا گوشت یا شراب نوشی پر مجبور کرنا:

اگر کسی مسلمان کو خنزیر کے گوشت کھانے یا شراب نوشی پر مجبور کیا جائے یا بتوں کو سجدہ کرنے پر

مجبور کیا جائے یا رمضان کے روزہ توڑنے پر مجبور کیا جائے، یا غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھنے پر مجبور کیا جائے ایسے موقع پر دیکھے کہ یہ جبر و اکراہ کس نوعیت کا ہے، اگر مار پیٹ قید وغیرہ کا ہے تو ہرگز حرام کا ارتکاب نہ کرے اور اگر قتل یا کسی عضو کے تلف کرنے کا ہے جس کو پہلے اکراہ ملجی کامل لکھا گیا، تو پھر ان گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنی جان بچانا ضروری ہے، بلکہ اس موقع پر واجب ان امور کا ارتکاب کر کے اپنی جان بچائے اگر حرام سے بچتے ہوئے صبر کرے اور قتل ہو جائے تو گناہ گار ہوگا کیوں کہ اس نے اپنے نفس کو ہلاکت کے لئے پیش کر دیا۔

قتل یا زنا پر مجبور کرنا:

اگر کسی انسان کو دوسرے انسان کے قتل پر یا زنا کرنے پر مجبور کیا جائے، تو شرعاً اس کے لئے حلال نہیں کہ دوسرے انسان کو قتل کرے اگر چہ اس مجبور کی جان چلی جائے، کیوں کہ دوسرے مسلمان کا قتل کسی حال میں بھی حلال نہیں کیوں کہ اس مجبور انسان کی جان دوسرے انسان کے مقابلہ میں کوئی زیادہ قیمتی نہیں۔

قال العلامة الصابونی رحمه الله تعالیٰ:

واذا أكره انسان على قتل غيره، أو أكره على الزنى، فلا يحل له أن يقدم على ذلك، ويجب أن يصبر، ولو أدىٰ به ذلك الى تعريض نفسه للخطر، لأن هذا مما لا تبيحه الضرورة، فليست نفس الانسان أعزّ ولا أغلى من نفس غيره، حتى يقدم على قتله، فكما يحرص على حياته، ينبغي أن يحرص على حياة الناس، فان قتله أثم، لأن قتل المسلم حرام، لا يباح لضرورةٍ ما، سواءً كان اكراها بالقتل أو بغير.

قال الامام القرطبی: "أجمع العلماء على أن من أكره على قتل غيره، أنه لا يجوز الاقدام على قتله، ولا انتهاك حرمته، ويصبر على البلاء الذى نزل به، ولا يحل له أن يفدى نفسه بغيره، ويسأل الله العافية فى الدنيا والآخرة" والله تعالیٰ اعلم وصلى الله على سيدنا محمد وآله وصحبه وسلم.

(تفسیر القرطبی: ۱۰/۱۹۷)

معاملات میں اکراہ:

وہ معاملات جن کے انعقاد کے لئے دل سے رضامند ہونا شرعاً ضروری ہے، جیسے خرید وفروخت، ہبہ وغیرہ۔

کما قال تعالیٰ: ﴿ الا ان تکون تجارة عن تراض منکم ﴾

یعنی کسی دوسرے کا مال حلال نہیں ہوتا، جب تک کہ تجارت وغیرہ کا معاملہ طرفین کی رضا مندی سے نہ ہو۔

و کماروی عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم: "لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منه."

یعنی کسی مسلمان کا مال اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے اس کے دینے پر راضی نہ ہو، اگر ایسے معاملات جبر واکراہ کے ساتھ کرالئے جائیں تو شرعاً ان کا اعتبار نہیں، اکراہ کی حالت سے نکلنے کے بعد اس کو اختیار ہوگا کہ بحالت اکراہ جو بیع ہبہ وغیرہ کیا تھا اس کو اپنی رضاء سے باقی رکھے یا فسخ کردے۔ (معارف القرآن: ۵/۴۰۷، آیت ۱۰۶ سورۃ النحل)

نکاح وطلاق میں اکراہ:

ایسے معاملات جن کا مدار صرف زبانی الفاظ کہہ دینے پر ہے دل کا قصد وارادہ یا رضاء وخوشی انعقاد معاملہ کے لئے شرط نہیں ہے جیسے نکاح، طلاق، عتاق وغیرہ ایسے معاملات کے متعلق حدیث میں ارشاد ہے:

ثلث جدھن جد وھزلھن جد، النکاح والطلاق والرجعة.

رواہ ابوداؤد والترمذی وحسنه

یعنی دو شخص زبان سے نکاح کا ایجاب وقبول شرائط کے مطابق کرلیں یا کوئی شوہر اپنی بیوی کو زبان سے طلاق دیدے، یا طلاق کے بعد زبان سے رجعت کرے، خواہ وہ بطور ہنسی مذاق کے ہو دل میں ارادہ نکاح یا طلاق یا رجعت کا نہ ہو پھر بھی محض الفاظ کہنے سے نکاح منعقد ہو جائے گا اور طلاق پڑ جائے گی، نیز رجعت صحیح ہو جائے گی۔ (مظہری)

امام اعظم ابوحنیفہ، شعبی، زہری، نخعی، اور قتادہ رحمہم اللہ کے نزدیک طلاق "مکرہ" کا بھی یہی حکم ہے کہ حالت اکراہ میں اگر چہ طلاق دینے پر دل سے آمادہ نہیں تھا مجبور ہو کر الفاظ طلاق کہہ

دیئے، اور وقوع طلاق کا تعلق صرف الفاظ طلاق ادا کر دینے سے ہے، دل کا قصد وارادہ شرط نہیں، جیسا کہ حدیث مذکور سے ثابت ہے اس لئے یہ طلاق واقع ہو جائے گی۔

(معارف القرآن : ٥/٤٠٨)

کسی کو خودکشی پر مجبور کیا جائے اس کا حکم:

اگر کسی انسان کو مجبور کیا جائے کہ خودکشی کر لے ورنہ ہم تجھے قتل کر دیں گے تو ایسی صورت میں بھی خودکشی کرنا حرام ہے کیوں کہ مکرَہ کے لئے فعل حرام کا ارتکاب اس وقت جائز ہے جب اس سے جان بچ جائے، خودکشی میں تو اپنے ہاتھ سے جان کو تلف کرنا ہے اسلئے یہ ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا ایسے موقع پر صبر کرے اگر جان چلی جائے تو شہادت کا مرتبہ حاصل ہوگا۔

احکام الشفعه

حق شفعہ کے شرعی احکام

حق شفعہ کی تعریف:

قال صاحب ملتقى الابحر : هى تملك العقار على مشتريه بما قام عليه جبرا، اى تملكه بالثمن الذى باعه به جبرًا عنه .

(ملتقى الابحر : ٢/١٩٥)

حق شفعہ کی مشروعیت:

شریعت مطہرہ نے ہر انسان کو آزادی اور سکون کے ساتھ زندگی گذارنے کا حق دیا ہے، اگر کسی کے پڑوس میں کوئی ایسا شخص آباد ہو جس کے عادات واخلاق پسندیدہ نہ ہوں تو ان کے ساتھ زندگی گذارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، بسا اوقات انسان تنگ ہو کر وہاں سے کوچ کر جاتا ہے۔

کما قال الشاعر :

دار جار السوء ان جار وان
لم تجد صبرا فما احلى النقل

یعنی وہ گھر جس کا پڑوسی برا ہے، اگر اس کی ایذاء پر صبر ممکن نہ ہو تو وہاں سے کوچ کر جانا ہی میٹھا ہے۔

اس لئے برے پڑوسی کے شر سے بچنے کے لئے شریعت نے شفعہ کا حق دیا ہے کہ اگر کسی کے پڑوس میں کوئی مکان دکان، جائیداد، زمین فروخت ہوتو اسکی خریداری کا اصل حقدار پڑوسی ہے، لہٰذا اس میں بائع پر بھی کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا، بلکہ جتنی قیمت پر دوسرے کو فروخت کرنا چاہتا ہے اتنے میں پڑوسی کو فروخت کرے جیسا کہ تعریف شفعہ سے ظاہر ہوا، اس کی مشروعیت پر بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ أما السنة : فهو ما رواه البخارى عن جابر بن عبد الله رضى الله عنه قال : قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم بالشفعة فى كل مالم يقسم ، فاذا وقعت الحدود ، وصرفت الطرق، فلا شفعة " .

(اخرجه البخارى : ۲/ ۳۲ من كتاب الشفعة ، ومسلم رقم : ۱۶۰۸)

ومعنى قوله صلى الله عليه وسلم " وصرفت الطريق " اى انتهى أمر البيع ببيان مصارف الطرق، ولم يطلب الجار حقه فى الشفعة ، فلاشفعة له .

۲۔ وروى الامام احمد وأصحاب السنن عن جابر رضى الله عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : " الجار أحق بشفعة جاره، ينتظر بها وان كان غائباً ، اذا كان طريقهما واحداً " .

(اخرجه أحمد فى المسند : ۳۸۸/٤ ، والترمذى رقم : ۱۳۷۰ ، وأبو داؤد رقم : ۳۵۱۳ ، والنسائى : ۳۰۱/۷)

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شفعہ کا فیصلہ فرمایا تھا ہر اس جائیداد میں جو تقسیم نہ ہوئی ہو جب تقسیم کے بعد حد بندی ہوگئی (اور پڑوسی نے حق شفعہ کا مطالبہ نہ کیا) اب حق شفعہ باقی نہ رہا۔

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پڑوسی شفعہ کا زیادہ حقدار ہے، اگر وہ بیع کے وقت موجود نہ ہوتو اس کے آنے کا انتظار کیا جائے گا، جب دونوں کا راستہ ایک ہو۔

(۳) وروى البخارى عن عمرو بن الشريد قال : " وقفت على

سعد بن أبي وقاص ، فجاء المسور بن مخرمة ، فوضع يده على احدىٰ منكبي ، اذ جاء "أبو رافع " مولى النبي صلى الله عليه وسلم ، أى عبده ومملوكه ، فقال ياسعد : ابتع مني بيتي في دارك، فقال سعد: والله ماأبتاعهما، أى لا أشتريهما !!

فقال المسور : والله لتبتاعنهما !!

فقال سعد : والله لا أزيدك على أربعة آلاف منجمة ، أى على أربعة آلاف درهم (منجمة) أى مفرقة على دفعات ! "

قال أبو رافع : لقد أعطيت بها خمسمائة دينار، يعني خمسة آلاف درهم ، ولولا أني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : الجار أحق بسقبه"، أى أحق بالشفعة بسبب قرب داره من دار جاره، ما أعطيتكها بأربعة آلاف، وأنا أعطى بها خمسمائة دينار، قال: فأعطاه اياه " .

(اخرجه البخاری فی كتاب الشفعة : ٢/ ٣٢ باب عرض الشفعة على صاحبها قبل البيع)

(٤) وروى مسلم عن جابر رضى الله عنه قال : " قضى رسول الله بالشفعة في كل شرك، أى شراكة لم يقسم، ربعة، أى منزل ، أو حائط، أى بستان ، لا يحل له أن يبيع ، حتى يستأذن شريكه، فان شاء أخذ ، وان شاء ترك، فان باع ولم يستأذنه ، فهو أحق به " أى أحق المبيع من المشترى .

فهذه نصوص نبوية صريحة واضحة ، في أن للجار والشريك ، حق الشفعة فيما يبيعه جاره، رعاية لحق الجوار، ودفعاً للضرر الذى ينشأ عن مجاورة شخص أجنبى غريب، لا سيما اذا كان عدواً أو خصماً!! . (فقه المعاملات)

حق شفعہ کا پہلا حق دار:

سب سے پہلے حق شفعہ اس شریک کو حاصل ہوگا جو مالک کے ساتھ نفس مبیع میں شریک ہو۔۔

اگر لینے سے انکار کرے تو دوسرے نمبر پر اس کا حق ہے جو مالک کے ساتھ حق مبیع یعنی جن دونوں کا نالہ اور راستہ ایک ہو ان کا حق ہوگا اگر وہ بھی لینے سے انکار کرے تو برابر میں جس کا مکان یا زمین ہے اس کا حق ہے۔

الشفعة واجبة للخليط في نفس المبيع ثم للخليط في حق المبيع كالشرب والطريق ثم للجار. (الهدايه: ٤/٣٩١)

حق شفعہ طلب کرنے کا طریقہ:

جب شفیع کو اس بات کا علم ہو جائے کہ ہمارے پڑوسی نے اپنی وہ زمین فروخت کردی ہے جس میں مجھے شفعہ کا حق حاصل ہے تو اسی مجلس علم میں جو لوگ موجود ہوں ان کے سامنے اس کا اظہار کرے کہ مجھے یہ زمین لینے کا حق ہے اور میرا ارادہ بھی ہے آپ لوگ گواہ رہیں، اس کے بعد جاکر زمین کے پاس یا مشتری کے پاس یا بائع کے پاس اگر مبیع ابھی تک مالک کے قبضہ میں ہو یوں گواہی قائم کرے کہ فلاں نے یہ زمین خریدی میں نے اس پر حق شفعہ کا دعویٰ کیا ہے اب بھی کر رہا ہوں آپ لوگ گواہ رہیں۔

قال صاحب الملتقى الابحر: فاذا علم الشفيع بالبيع يشهد في مجلس علمه أنه بطلبها، ويسمى طلب مواثبه، ثم يشهد عند العقار، أو على المشترى، أو على البائع، ان كان المبيع في يده، فيقول اشترى فلان هذه الدار، وقد كنت طلبت الشفعة، وانا اطلبها الآن فاشهدوا على ذلك. (ملتقى الابحر: ٢/١٩٢)

اب یہاں سے شفعہ کے متعلق چند مسائل کو سوال وجواب کی صورت میں نقل کئے جاتے ہیں جن سے حق شفعہ کے جزئیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ایک ماہ بعد شفعہ کا دعویٰ قبول نہیں ہوگا:

سوال: میں نے زمین خریدی اور اس میں کاشت کرتا رہا، شفیع میرا تصرف چھ ماہ تک دیکھتا رہا، مگر شفعہ طلب نہیں کیا، اب اس نے دعویٰ دائر کردیا ہے تو شرعاً اب تک اسے حق طلب ہے یا کہ حق باطل ہو چکا ہے؟

اگر بالفرض شفیع طلب مواثبہ وطلب تقریر پر گواہ پیش کردے تو تاخیر طلب خصومت عند

القاضی جوایک ماہ سے زائد ہے،اس کی وجہ سے امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول میں حق شفعہ ساقط ہوگا یا نہیں؟

(نوٹ): مقدمہ مجسٹریٹ کے ہاں چل رہا ہے، مجسٹریٹ نے شرعی فیصلہ کے متعلق کہا ہے، اس لئے پہلی فرصت میں جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اس صورت میں طلب مواثبہ وطلب تقریر کے فقدان کی وجہ سے شفیع کا حق باطل ہو چکا ہے، اگر بالفرض شفیع طلب مواثبہ وطلب تقریر شہادت معتبرہ سے ثابت کردے تب بھی طلب خصومت عندالقاضی میں ایک ماہ سے زیادہ تاخیر اگر بلا عذر ہوئی تو حق شفعہ نہ رہا، یہ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے پرزور الفاظ سے اسی کو ترجیح دی ہے اور مفتی بہ قرار دیا ہے۔

(قوله وقيل يفتى بقول محمد) اور (قوله يعني دفعا للضرر) اور (قوله قلنا الخ) ان تینوں مواضع میں علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کو ہی مختار اور مفتی بہ قرار دیا ہے۔

علاوہ ازیں رافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا التحریر المختار میں اس پر کچھ نہ لکھنا اور سکوت کرنا بین دلیل ہے کہ یہی قول بلا شک وشبہ مفتی بہ ہے، البتہ اگر کسی معقول عذر کی وجہ سے طلب خصومت عندالحاکم میں تاخیر ہوئی ہو تو حق ساقط نہ ہوگا، بشرطیکہ مواثبہ اور طلب تقریر شہادت سے ثابت کرے۔

(قوله بلا عذر) فلو بعذر كمرض وسفر او عدم قاض يرى الشفعة بالجواز فى بلده لا تسقط اتفاقا.

(ردالمحتار: ۱۵۹/۵، ماخوذ از احسن الفتاوی: ۳۵۳/۶)

سکوت شفیع سے بطلان حق کی تفصیل:

سوال: ایک زمین بیع ہونے کے بعد شفیع چند ایام تک خاموش رہا، اب حق شفع طلب کرنے کا اسے شرعاً اختیار ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

حق شفعہ کے لئے علم بیع کے بعد مواثبہ اور طلب تقریر بعجلت ممکنہ ضروری ہے، صورت مسئلہ

میں اس شرط کے فقدان کی وجہ سے حق شفعہ باطل ہو جائے گا، البتہ اگر مشتری یا ثمن کا علم نہ ہونے کی وجہ سے شفیع نے سکوت کیا ہو اور علم ہو جانے کے بعد فوراً طلب مواثبہ وطلب تقریر بشرائطھما المعتبرۃ کی ہوں تو حق ساقط نہیں ہوگا۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ معزيا الى الـ انية : اخبربها فسكت قالوا لا تبطل مالم يعلم المشترى والثمن (الى قوله) اقول وبه افتى المصنف التمر تاشى فى فتاواه فليحفظ .

(رد المحتار : ٥/ ١٥٨ ، ماخوذ از احسن الفتاوىٰ : ٧/ ٣٥٤)

بوقت بیع موت شفیع میں اختلاف:

سوال : زید نے اپنے والد کی وفات کے بعد بالغ ہوتے ہی بکر پر شفعہ کا دعوی کر دیا جبکہ تمام لوازمات شفعہ پہلے مکمل کئے جا چکے تھے، بکر نے کہا کہ چوں کہ بوقت بیع تمہارے والد زندہ تھے اور انہوں نے اس وقت کوئی دعویٰ نہیں کیا لہٰذا اب تمہارا دعویٰ لا حاصل ہے، زید نے بوقت بیع اپنے والد کی وفات پر بینہ قائم کئے اور بکر نے اس کی زندگی پر بینہ قائم کئے اب کس کے گواہوں کو ترجیح ہوگی؟ بینوا توجروا

جواب: مندرجہ ذیل جزئیات سے بظاہر اس مسئلہ پر استشہاد کیا جا سکتا ہے:

(١) قال الامام قاضى خان رحمه الله تعالىٰ : اذا شهد رجلان ان زوج فلانة قتل او مات وشهد آخر ان انه حى كانت شهادة الموت والقتل اولى . (خانية بهامش العالمگيرية : ٢/ ٤٨٤)

(٢) وقال فى الفتاوى المهدية : ان الاصل تقديم بينة الموت على بينة الحياة لانها تثبت امراعارضا كما هو الاصل فى البينات ففى الفصل الثالث عشر من العمادية اذا شهد رجلان ان زوج فلانة قتل او مات وشهد اخران انه حى كان شهادة الموت والقتل اولىٰ لان الموت اثبت العارض اه نعم فى تنقيح الحامدية بينة زوج فلانة قتل او مات اولىٰ من بينة انه حى الا اذا اخبر بحياته بتاريخ لاحق اه (الى ان قال) فبينة الموت اولىٰ مطلقا كما هو ظاهر اطلاقهم له

والتوجيه الجاري مطلق عن قيد التاريخ وعدمه وتأخره وتقدمه الخ .

(فتاویٰ مهدية : صـ ٣٦٧)

(٣) وقال العلامة ابن نجيم رحمه الله تعالىٰ : يوم الموت لا يدخل تحت القضاء ويوم القتل يدخل كذا في البزازية والوالجية والفصول وعليها فروع .

(٤) وقال العلامة الحموي رحمه الله تعالى تحت قوله وعليها فروع : لو برهن ان من شهد واعلى اقراره في وقت كذا كان ميتا في ذلك الوقت لا يقبل لان زمان الموت لا يدخل تحت القضاء حتى اذا برهن ان فلانا مات يوم كذا وادعت امرأة نكاحا بعد ذلك اليوم وبرهنت يقبل بخلاف زمان القتل والنكاح حيث يدخلان تحت القضاء ومنها لو ادعى ان اباه مات يوم كذا وقضى ثم ادعت امرأة النكاح بعده بيوم تقبل فهذا والذي قبله مما فرعوه على الاول ومما فرعوه على الثاني لو برهن الوارث على انه قتل يوم كذا فبرهنت المرأة ان هذ المقتول نكحها بعد ذلك اليوم لاتقبل .

(شرح الاشباه والنظائر ، الفن الثاني : ٢/٣٤٦)

جزئیہ اولی وثانیہ سے بینہ شفیع کی اولویت معلوم ہورہی ہے مگر ان سے استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ صورت مسئلہ میں شفیع کے والد کی موت وحیات میں تنازع نہیں ، اس کی موت پر جانبین متفق ہیں ، تنازع امرین حادثین (الموت والشراء) کے تقدم وتأخر میں ہے۔

جزئیہ ثالثہ ورابعہ سے بظاہر بینہ مشتری کو ترجیح معلوم ہورہی ہے مگر بنظر غائر بینہ شفیع کی ترجیح ثابت ہوتی ہے ، اس لئے جزئیات مذکورہ میں مدعیہ نکاح کے بینہ کے قبول ہونے کی علت یہ ہے کہ یہ مدعیہ حق اور جانب آخر اس کے حق کی منکر ہے اور اصولا مدعی حق کا بینہ راجح ہوتا ہے ، صورت متنازع فیہا چونکہ شفیع مدعی حق ہے اور مشتری منکر ، لہٰذا شفیع کا بینہ راجح ہوگا۔

علاوہ ازیں اگر بالفرض مشتری کے بینہ ہی کو ترجیح ہو تو بھی یہ مشتری کے لئے مفید نہیں اس لئے کہ بوقت شراء زید کے والد کی محض حیات ثابت ہوجانے سے حق شفعہ ساقط نہ ہوگا جب تک

کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس کو شراء، مشتری اور مبلغ ثمن کا بھی علم ہو چکا تھا، معہذا وہ خاموش رہا۔

اور اگر بروئے قانون " اذا تعارضا فتساقطا " دونوں کے بینہ کا تہاتر تسلیم کرکے حال کو قاضی بنایا جائے تو بھی شفیع کو حق پہنچتا ہے۔

غرض یہ کہ وجوہ ذیل کی بناء پر حق شفیع قائم ہے:

(۱) شفیع مدعی ہے اور مشتری منکر، فترجح بینۃ المدعی۔

(۲) مشتری نے شفیع کے والد کا علم بالشراء والمشتری والثمن ثابت نہیں کیا۔

(۳) قضاء بالحال۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اقالہ سے دوبارہ حق شفعہ ثابت ہو جاتا ہے:

سوال: اقالہ سے شفیع کے حق شفعہ پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اقالہ سے شفیع کے لئے حق شفعہ نئے سرے سے ثابت ہو جاتا ہے۔

قال فی الهندية: وبالرد بحكم الاقالة يتجدد للشفيع حق الشفعة. (عالمگيرية: ٥/١٩٤)

احیاء موات میں حق شفعہ نہیں:

سوال: جو ارض موات آباد زمینوں کے ساتھ متصل ہو، اس کے احیاء سے حق شفعہ ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب: حق شفعہ صرف زمین کی بیع کی صورت میں ہوتا ہے، احیاء موات میں حق شفعہ نہیں۔

قال فی التنوير: هی تمليك البقعة جبرا على المشترى بما قام عليه.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ تحت (قوله جبرا على المشترى) واحترز بقوله على المشترى عما ملكه بلا عوض كما بالهبة والارث والصدقة او بعوض غير معين كالمهر والاجارة والخلع والصلح عن دم عمد ودخل فيه ما وهب بعوض فانه اشتراء انتهاء.

(ردالمحتار: ٥/١٥٢)

فیصلہ میں تاخیر سے حق شفعہ باطل نہیں ہوتا:

سوال: اگر شفیع نے شفعہ کا دعویٰ دائر کردیا، فیصلہ میں تاخیر ہوتی رہی، کئی سال گذر گئے تو کیا اس تاخیر فیصلہ سے حق شفعہ ساقط ہوجاتا ہے؟ اگر ساقط ہوجاتا ہے تو کتنی مدت میں ساقط ہوتا ہے؟ بینوا توجروا

جواب: دعویٰ دائر کرنے کے بعد حق شفعہ کا فیصلہ قاضی کے اختیار میں ہے، اگر قاضی نے تأخیر کی تو چونکہ اس میں شفیع کی طرف سے کوئی غفلت نہیں پائی گئی، اس حق کا شفعہ باطل نہ ہوگا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

حق شفعہ میں ترتیب کی تفصیل:

سوال: ایک آدمی صرف شریک فی المبیع ہے اور دوسرا شریک فی المبیع بھی ہے اور شریک فی الحقوق بھی ہے تو حقہ شفعہ میں دونوں برابر ہیں یا دوسرے کو ترجیح ہوگی جو دو وجوہ سے حقدار ہے؟

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص صرف شریک فی المبیع ہے اور دوسرا شریک فی الحقوق بھی اور جار ملاصق بھی ہے تو حق شفعہ میں ترجیح کس کو ہوگی؟ یعنی ترتیب مراتب کا لحاظ کیا جائے گا یا کثرت مراتب کا؟ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارات سے تو ترتیب ہی کو ترجیح معلوم ہوتی ہے، مگر یہاں بعض علماء کثرت مراتب کی ترجیح کے قائل ہیں، فریقین آپ کے فتویٰ کو قول فیصل قرار دینے پر متفق ہیں؟ بینوا توجروا

جواب: پہلی صورت میں دونوں برابر ہوں گے اور دوسری صورت میں شریک فی المبیع کو ترجیح ہوگی، لان الاعتبار لقوة الدلیل لا لکثرته، اسی بناء پر شرکاء فی المبیع میں حصہ کی کثرت وقلت اور جوار میں مجاورت کی مقدار کا اعتبار نہیں، بلکہ شرکاء اور ملاصق برابر ہیں۔

قال فی شرح التنویر: بقدر رؤس الشفعاء لا الملك.

(رد المحتار: ٥/١٥٤)

وقال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه تعالیٰ: (قوله ثم لجار ملاصق) ولو متعددا والملاصق من جانب واحد ولو بشبر كالملاصق من ثلاثة جوانب فهما سواء اتقاني.

(رد المحتار: ٥/١٥٥، ماخوذ از احسن الفتاوی: ٧/٣٥٧)

تبادلہ جائیداد میں بھی حق شفعہ ثابت ہو جاتا ہے:

مثلاً زید وبکر نے ایک دوسرے سے اپنی جائیداد کا تبادلہ کیا بکر کے رشتہ دار عمرو خالد نے زید وبکر پر حق شفعہ کا دعویٰ کیا تو شرعاً یہ دعویٰ صحیح ہوگا، کیوں کہ تبادلہ سے بھی حق شفعہ ثابت ہوتا ہے۔

لان فیہ تملیك بعوض المال ، وفی الدرالمختار : (لا تثبت قصدًا الا فی عقار ملك بعوض)

خرج الهبة (هو مال) خروج المهر (وان لم) یکن یقسم اهـ .

(ماخوذ از امداد الاحکام : ٤ / ١٧١)

شفعہ کے متفرق مسائل:

1...... شفیع کو معلوم ہوا کہ مثلاً زید نے اس کے برابر کی زمین خریدی ہے تو شفیع اس پر راضی ہوگیا، کیوں کہ وہ زید کی شرافت سے واقف ہے بعد میں معلوم ہوا کہ خریدار تو خالد ہے جبکہ شفیع کے علم کے مطابق خالد شر پسند آدمی ہے، تو شفیع کا حق شفعہ ساقط نہ ہوگا کیوں کہ پہلے اس کو دھوکہ دیا گیا ہے۔

2...... جس طرح مسلمان کو حق شفعہ حاصل ہوتا ہے اسی طرح ذمی کو بھی یہ حق حاصل ہوتا ہے، کیونکہ دفع ضرر کی ضرورت میں دونوں برابر ہیں لہٰذا حق شفعہ میں بھی دونوں برابر ہونگے۔

3...... مجلس قضاء میں دعویٰ شفعہ دائر کرنے اور مقدمہ کے فیصلہ کے وقت ثمن کا حاضر کرنا ضروری نہیں البتہ جب اس کے حق میں شفعہ کا فیصلہ ہوگیا تو اب ثمن کی ادائیگی لازم ہے۔

4...... شفیع کو بھی خیار رویت اور خیار عیب حاصل ہوگا کیوں کہ شفعہ کے ذریعہ لینا اصل خریداری کی طرح ہے، لہٰذا جو حق مشتری کو حاصل ہے وہ شفیع کو بھی حاصل ہوگا۔

احکام المساقاۃ والمزارعہ

باغات اور درختوں کو بٹائی پر دینے کے احکام

مساقاہ کا معنی: اپنے درخت یا باغ کو کسی دوسرے کے حوالے کرنا تاکہ وہ اس کو سیراب کرے اور اس کی دیکھ بھال کرے اور اس کو اس قابل بنائے کہ اس میں زیادہ پھل لگے، اور شرط یہ ٹھہرائے کہ پیدا ہونے والے پھل کا ایک معین حصہ اجرت میں دیا جائے گا۔

هی دفع الشجر الی من یسقیه و یصلحه ، بجزء معین من ثمره .

(ملتقی الابحر : ۲/۲۱۳)

شرعاً یہ معاملہ مشروع ہے، جناب رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ یہ معاملہ فرمایا تھا، کہ جب خیبر فتح ہوا، تو وہ علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا پھر آپ ﷺ نے ان کے ساتھ معاہدہ فرمایا کہ تم لوگ خود ان باغات کی دیکھ بھال کرو اور جو پھل لگے اس کا آدھا مدینۃ الرسول(ﷺ) بھیجا کرو۔

المساقاة مشروعة بالسنة المطهرة ، وهی صحيحة عند جمهور العلماء ، فهی كالمزارعة ، الأصل فيها أنها لا تجوز ، لأنها شركة علی شیء ، مجهول ، قد يخرج النبات وقد لا يخرج الثمر ، ولهذا خالف فيها بعض الفقهاء ، ولكن حاجة الناس اليها تجعلها مشروعة ، وان كانت مخالفة للقياس ، وقد وردت السنة بتقريرها ، فلا عبرة بخلاف من خالف فيها .

فقد روی البخاری ومسلم عن عبد الله بن عمر رضی الله عنهما أنه قال :

"عامل النبی صلی الله عليه وسلم أهل خيبر ، بشطر ، أی نصف ما يخرج من ثمر أو زرع " .

(اخرجه البخاری : ۲/۴۶ ، ومسلم فی صحيحه)

فالثمر هنا يراد به شجر النخيل الذی اشتهرت به خيبر وهو نص صريح فی المساقاة ، فقد عاملهم صلی الله عليه وسلم ، بأن يأخذوا النصف مقابل خدمتهم للشجر .

وقد اقتصر بعض الفقهاء علی جواز المساقاة فی شجر النخيل والكرم ، أی العنب ، لأن أهل المدينة كانوا يتعاملون بهما مساقاة ، كما هو مذهب الشافعية .

وأجاز فقهاء الحنفية المساقاة فی جميع أنواع الشجر ، ما كان

منه مثمرا ، وما كان غير مثمر ، كشجر الحور الذى ينتفع به ، لسقوف البيوت وللحطب ، قياساً على شجر النخيل ، لأن الجواز للحاجة وقد عمت ، والأصل العموم لا التخصيص .

قال صاحب الهداية : وتجوز المساقاة فى النخل ، والشجر ، والكرم ، والرطاب ، وغير ذلك لأن أهل خيبر كانوا يتعاملون فى الأشجار والرطاب أيضاً ، والأصل فى النصوص أن تكون معلولة ، أى تتضح فيها الحكمة والعلة ، والجامع دفع الحاجة ، فان ذا المال قد لا يهتدى الى العمل ، والقوى عليه لا يجد المال ، فمست الحاجة الى انعقادها كالمزارعة . (الهداية : ٤ / ٣٩٠)

مساقاۃ کی شرائط:

(۱) عمل صرف عامل کے ذمہ ہو باغ کا مالک عمل میں شریک نہ ہوگا ، یہی مساقاۃ کا تقاضا ہے۔

(۲) باغ مکمل طور پر عامل کے حوالہ کردیا جائے تاکہ وہ باغ کی درستگی نالہ وغیرہ بنانا ، زائد کانٹے وغیرہ کاٹنے کا عمل یکسوئی کے ساتھ انجام دے سکے۔

(۳) پیداوار کے بعض حصے کو اجرت ٹھہرایا جائے مثلاً آدھا ، یا تہائی ، یا چوتھائی ، مثلاً اگر اجرت اس طرح متعین کرے کہ پیداوار میں سے ، مثلاً دس من میرا ہوگا بقیہ تمہارا ، تو عقد مساقاۃ باطل ہوجائے گا ، کیوں کہ بسا اوقات ہوسکتا ہے کہ کل پیداوار ہی صرف دس من ہو یا اس سے کم ، اس صورت میں عامل کا نقصان ہوجائے گا۔

(٤) اسی طرح مدت متعین ہونی چاہئے ، وہ مدت جس میں آسانی کے ساتھ ایک مرتبہ پھل لگ کر تیار ہوجائے اور اس کو اتارا جاسکے ، اگر ایسی مدت مقرر کی کہ جس میں عام طور پر ایک مرتبہ پھل لگ کر تیار نہیں ہوتا ، تو اس سے عقد مساقات فاسد ہوجائے گا ، کیوں کہ پیداوار میں دونوں کی شرکت کا جو مقصد ہے وہ مقصد فوت ہوجائے گا۔

قال الفقهاء فان سميا فى المعاملة ، اعنى المساقاة وقتا يعلم أنه لا يخرج منها الثمر ، فسدت المساقاة لفوات المقصود وهو الشركة

فی الخارج ، ولو سمیا مدة یبلغ الثمر فیها ، وقد یتأخر عنها قلیلا ،
جازت لعدم فوات الغرض . (الهدایه : ٣٨٩/٤ والمغنی : ٤١٤/٥)

مساقاۃ فاسدہ کا حکم:

اگر شرط فاسد کی وجہ سے عقد مساقاۃ فاسد ہو جائے تو فیصلہ کا طریقہ یہ ہے کہ، تمام پھل مالک کا ہوگا کیوں کہ اس کے باغ کی پیداوار ہے اور عامل کو اجرت مثل ملے گی۔

احکام المزارعة

زمین دوسرے کو بٹائی پر دینے کے احکام

اسلام اپنے پیروکاروں کو عبادات کے علاوہ اس بات کا بھی حکم دیتا ہے کہ اپنے لئے کوئی ذریعہ معاش اختیار کرو ویسے ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھو کہ اس بات کا انتظار میں کہ دوسرا کما کر مجھے کھلائے گا۔

کمائی کے ذرائع میں سے کھیتی باڑی، باغ بانی وغیرہ بھی ہیں رسول اللہ ﷺ نے اس کی بھی ترغیب دی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

" ما من مسلم یغرس غرسا ، أو یزرع زرعا، فیاکل منه طیر أو انسان ، أو بهیمة ، الا کان له به صدقة ."

(اخرجه البخاری : ٤٥/٢ ، باب فضل الزرع ومسلم فی المساقاة رقم : ١٥٥٣)

یعنی جو مسلمان بھی کوئی درخت لگائے ، یا کھیتی کرے پھر اس سے پرندے، انسان، یا جانور فائدہ حاصل کریں وہ اس کے لئے صدقہ جاریہ ہوگا، اس کو اجر ملے گا۔

وقال علیه الصلوٰة والسلام : " التمسوا الرزق من خبایا الارض ."

(اخرجه الترمذی ، ای من باطنها بزراعتها واستخراج المعادن)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ زمین کے مخفی خزانوں سے رزق تلاش کرو، یعنی زراعت کر کے یا کان کنی وغیرہ کے ذریعہ۔

مزارعۃ کی تعریف اور حکم:

هی عقد علی زراعة الارض ، ببعض الخارج منها ، مثل اتفاق

مالك الارض مع الفلاح المزارع باعطاء ثلث او ربع ، أو نصف، مايخرج من النبات و الزرع على أن يزرعها و يعمل فيها .

عقد مزارعت وہ مالک زمین کا کسی کسان سے اس طرح معاہدہ کرنا ہے کہ کسان اس زمین میں کھیتی باڑی کرے، اور جو پیداوار حاصل ہوگی اس کا آدھا یا تہائی یا چوتھائی حصہ، کسان کو دیا جائے گا بقیہ مالک کا ہوگا۔

قال العلامة الموصلي رحمه الله : هي عقد على الزرع ببعض الخارج وهي جائزة عند ابي يوسف ومحمد لان النبي صلى الله عليه وسلم عامل من اهل خيبر على نصف ما يخرج من تمر وزرع ، ولان الحاجة ماسة اليها لان صاحب الارض قد لا يقدر على العمل بنفسه ولا يجد ما يستاجر به والقادر على العمل لا يجد ارضا ولا ما يعمل به ، فدعت الحاجة الى جوازها دفعا للحاجة كالمضاربة .

(الاختيار لتعليل المختار : ٧٥/٢)

قال العلامة الصابوني : وقد فعل ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فقد روى البخاري عن ابن عمر رضي الله عنهما قال :

" عامل النبي صلى الله عليه وسلم خيبر ، بشطر، أي نصف ، مايخرج منها من ثمر أو زرع ." (اخرجه البخاري : ٤٦/٢)

وفي رواية أخرى عنده عن ابن عمر : "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أعطى خيبر اليهود على أن يعملوها ويزرعوها، ولهم شطر، ماخرج منها . (اخرجه البخاري : ٤٧/٢)

وكذلك أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم تعاملوا بالمزارعة فقد حدث قيس بن مسلم عن أبي جعفر قال :

" ما بالمدينة أهل بيت هجرة، الا ويزرعون على الثلث، والربع."

قال البخاري : وزارع علي ، وابن مسعود ، وعمر بن عبد العزيز، وآل أبي بكر ، وآل عمر ، وآل علي ، وابن سيرين ، وقال عبد الرحمن

ابن الأسود : كنت أشارك عبد الرحمن بن يزيد فى الزرع ، وعامل عمر الناس على ان جاء عمر بالبذر من عنده فله الشطر، النصف، وان جاء وا بالبذر فلهم كذا، وقال الحسن : لا بأس أن تكون الأرض لأحدهما ، فينفقان جميعاً، فما خرج فهو بينهما .

(صحيح البخارى : ٤٦/٢ باب المزارعة بالشطر ونحوه)

قال صاحب المغنى : وهذا أمر مشهور ، عمل به رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى توفاه الله ، ثم خلفاؤه الرشدون حتى ماتوا، ثم أهلوهم من بعد هم ، ولم يبق بالمدينة أهل البيت الا عمل به، وعمل به أزواج رسول الله صلى الله عليه وسلم من بعده .

" وقد كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما ظهر على خيبر ، أراد إخراج اليهود منها ، وصارت الأرض حين ظهر عليها لله ولرسوله ، وللمسلمين ، فسألت اليهود رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يقرهم بها، أى يتركهم ، على أن يكفوه عملها ، ولهم نصف الثمر، فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم : نقركم بها على ذلك ما شئنا !!فقروا بها حتى أجلا هم عمر رضى الله عنه الى تيماء وأريحاء ."

(انظر صحيح البخارى : ٤٨/٢ ، المغنى لابن قدامة : ٤١٨/٥ ، فقه المعاملات)

صحت مزارعت کی شرائط:

صحت مزارعت کی شرائط کی تفصیلات کے لئے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال : مزارعت کے سلسلہ میں زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان اختلاف ہوتا رہتا ہے، لہٰذا بٹائی پر زمین دینے کا جواز مع شرائط صاف صاف عام فہم مفصل تحریر فرمائیں، نیز مزارعت کے جواز میں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ میں اختلاف ہے مفتی بہ قول کیا ہے؟ حدیث " من لم يترك المخابرة فليؤذن بحرب من الله ورسوله " کا کیا مطلب ہے؟ بینوا توجروا

جواب: قول جواز مفتی بہ ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ سے لے کر آج تک امت کا تعامل ہے۔

صحت مزارعت کے لئے آٹھ شرائط ہیں:

(۱) زمین زراعت کی صلاحیت رکھتی ہو۔

(۲) زمیندار اور مزارع اہل عقد میں سے ہوں۔

(۳) مدت کی تعیین۔

(٤) صاحب تخم کی تعیین۔

(۵) حصہ کی تعیین۔

(٦) مزارع کو زمین کا قبضہ دینا۔

(۷) پیداوار میں دونوں کی شرکت کا بیان۔

(۸) تخم کی جنس کی تعیین۔

مزارعت کی سات صورتیں ہیں:

(۱) ارض وبذر ایک کے ہوں، بقر وعمل دوسرے کے۔

(۲) ارض ایک کی، باقی سب دوسرے کا۔

(۳) عمل ایک کا باقی سب دوسرے کا۔

(٤) ارض وبقر ایک کے، بذر وعمل دوسرے کے۔

(۵) بقر وبذر ایک کے، ارض وعمل دوسرے کے۔

(٦) بقر ایک کے، باقی سب دوسرے کا۔

(۷) بذر ایک کا، باقی سب دوسرے کا۔

ان سات اقسام میں سے پہلی تین قسمیں مزارعت صحیحہ کی ہیں اور آخری چار مزارعت فاسدہ کی۔

قال فی التنویر وشرحہ: وکذا صحت لو کان الارض والبذر لزید والبقر والعمل للآخر والارض لہ والباقی للآخر او العمل لہ والباقی للآخر فھذہ الثلاثۃ جائزۃ وبطلت فی اربعۃ اوجہ لو کان الارض

والبقر لزيد او البقر والبذر له والأحران للآخر والبقر او البذر له والباقي للآخر . (رد المحتار : ١٩٥/٥)

حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس زمانے میں مزارعت میں شرائط فاسدہ لگاتے تھے، مثلاً پیداوار سے وزن کی متعین مقدار کسی کے لئے رکھنا وغیرہ اس لئے ایسی مزارعت سے منع فرمایا ہے۔

قال الامام ابن الهمام رحمه الله تعالىٰ : ويمكن ان يقال لهما ان يدفعا ذلك بحمل المروى عن النبي صلى الله عليه وسلم على ما اذا شرط في عقد المزارعة شرط مفسد اذ قدروى انهم كانوا يشترطون فيه شيئا معلوما من الخارج لرب الارض ونحو ذلك مما هو مفسد عند هما وقد اشار اليه صاحب الكافي الخ . (فتح القدير : ٣٤/٨)

وقال في التنوير وشرحه : ولا تصح عند الامام لانها كقفيز الطحان وعندهما تصح وبه يفتى للحاجة وقياسا على المضاربة .

(ردالمحتار : ١٩٣/٥ ، ماخوذ از احسن الفتاوىٰ : ٣٨٠/٧)

قال العلامة الصابوني : وذهب بعض الفقهاء الى عدم جواز المزارعة وشبهتهم في ذلك أنها قائمة على شئى مجهول ، لأنه لا يعرف مقدار الخارج، فتكون الأجرة مجهولة، وبذلك يفسد العقد، كما هو معروف في شروط الاجارة ، لما فيه من المخاطرة .

واحتجوا بما رواه البخارى عن " رافع بن خديج " أنه قال :

" نهانا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن أمر كان بنا رافقاً ، أى سهلاً ونافعا، قال : ما تصنعون بمحاقلكم؟ أى مزارعكم ، قلت : نؤاجرها على الربع، وعلى الأوسق من التمر والشعير !!قال : لاتفعلوا، ازرعوها ، أو أزرعوها أى ادفعوها لمن يزرعها، أو أمسكوها!! قال رافع : قلت سمعاً وطاعة . " (اخرجه البخارى : ٤١٨/٢)

فالحديث الشريف ظاهره يدل على النهى عن اكراء المزارع

ببعض ما يخرج منها، الربع و الثلث ، وهذا الفهم رده أبن عباس رضى الله عنهما ، وبين أن النهى انما كان من أجل ارشادهم الى ما هو خير لهـم ، فقال : "ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يحرم المزارعة ، ولـكـن أمـر أن يرفق الناس بعضهم ببعض فقال : "من كانت له أرض فليزرعها ، او ليمنحها اخاه، فان ابى فليمسك ارضه .

(اخرجه البخارى من رواية جابر : ٢ / ٤٩)

وهـنـاك سبب اخر لحديث رافع بن خديج الذى يخبر بأن الرسول صـلـى الله عليه وسلم نهى عن المزارعة ، حدث عنه زيدبن ثابت رضى الله عـنـه أن الـنبـى صـلـى الله عليه وسلم كان لقض النزاع فقال؛ يغفر اللهلـرافـع بن خديج ، انا والله اعلم بالحديث منه ، انما جاء رجلان من الانـصـار قد اقتتلا فقال النبى صلى الله عليه وسلم : ان كان هذا شأنكم فـلا تـكـروا اى تـوجروا ، المزارع فسمع رافع قوله فلا تكروا المزارع، ولم يعرف سبب هذا النهى. (اخرجه ابو داؤد والنسائى)

وبهـذا اتضح الغرض من الحديث الشريف ، وبقى حل المزارعة عـلـى اصـلـه مـن الابـاحة والجواز ، كذلك التضح معنيحديث جابرؓ الـذى رواه الـبـخـارى مـن حيث قال : كانوا يزرعون بالثلث، والربع، والـنـصـف ، فـقـال الـنبـى صـلـى الله عليه وسلم : من كانت له ارض فليزرعها ، او يمنحها فان لم يفعل فليمسك ارضه " .

هـذاالـحـديـث الشـريف ايـضـا سببـه وقـوعـه بعد المنازعات والخصومات بين بعض الانصار ، فاراد الرسول صلى الله عليه وسلم أن يـنـهـى هذا الخلافات فنها هم عن المزارعة ، وارشد هم الى ما هو الافضل والا صلح ولم يحرم عليهم التعامل بها . (فقه المعاملات)

دخیل کار اور موروثی زمین کی پیداوار کا حکم:

اراضی پر سرکاری قبضہ زمینداروں کی ملک، کاشتکاروں کے ساتھ معاملہ کی شرعی حیثیت کی

تفصیلات کو سمجھنے کے لئے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی ایک تحقیق سوال و جواب کی صورت میں نقل کی جاتی ہے:

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ آج کل جو تمام ہندوستان میں سرکار نے قانون قبضہ اراضی نافذ کر کے کاشتکاروں کو قبضہ دلایا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص دخیل کار اور موروثی کاشتکار ہو گیا ہے پیشتر دخیل کاروں کی تعداد کم تھی مگر اب ہر کاشتکار دخیل کار ہو گیا ہے زمیندار جس طریقہ سے پیشتر کے دخیل کاروں سے ناخوش اور ناراض تھے اسی طریقے سے ان کاشتکاروں سے بھی ناخوش اور ناراض ہیں چونکہ زمینداروں کا منشاء تو یہ ہے کہ ہر سال نئے نئے کاشتکاروں کو زمین دیدی جایا کرے اور اس لگان سے کچھ زر لگان خفیہ کر لیا جایا کرے، بغیر پٹواری کے کاغذات میں بجائے للعرفی پگا کے درج کرا کر مال گذاری میں کمی رکھی جائے سرکار نے اس وجہ سے کل کو دخیل کار بنایا تا کہ زمیندار یہ غبن نہ کریں اور مال گذاری بمقابلہ وصولیت زر لگان از کاشتکار لے جایا کرے اس کے بعد سرکار نے یہ حق زمیندار کو دیا ہے کہ جو روپیہ تم اپنی جائیداد سے وصول کرو اس میں سے ۴۵ فی صد رکھ کر باقی تحصیل میں داخل کر دو، اور احناف کا مذہب ہے کہ استیلاء کافر علی مال مسلم سبب ملک کا ہے سرکار کا جس وقت آنا ہندوستان میں معلوم ہوتا ہے اس سے پہلے یہی پتہ چلتا ہے کہ ملک پر قبضہ پورے طریقہ سے ان کو حاصل ہوا، لہٰذا یہ استیلاء کل ملک پر ظاہر ہے اس کے بعد قدرے قدرے قطعہ اراضی لوگوں کو دے گئے جن کو زمینداروں کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے مشہور تو ہے کہ زمیندار مالک اراضی نہیں لیکن بعض قانون دانوں سے نیز بعض زمینداروں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زمیندار مالک اراضی نہیں بلکہ ایک مقدار معینہ کے معاہدہ سے ٹھیکہ دار ہیں، معاہدہ یہ ہے کہ فیصد آمدنی اراضی سے مثلاً مبلغ ۵۰ روپیہ ادا کریگا، چنانچہ اگر ایک سال میں اس معاہدہ کے خلاف کرلے تو اس کو اراضی سے سرکار علیحدہ کردے گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمیندار مالک نہیں ہے بلکہ ٹھیکہ دار ہے اور اگر اس کو مالک ہی کہا جاوے تو اس قانون کے نفاذ کی وجہ سے سرکار کا استیلاء اراضی پر نہیں ہے جو موجب ملک ہے اور خود سرکار کا مقولہ ہے کہ زمیندار کوئی چیز نہیں کاشتکار یا ہم ثالث کون ہیں، تو ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ارشاد عالیہ سے سرفراز فرمایا جاوے کہ ان کاشتکاروں کا قبضہ اراضی پر جو باجازت سرکار ہے جائز ہے یا ناجائز اور ان کاشتکاروں کی آمدنی حلال ہے یا حرام، درصورتِ حرمت ان

لوگوں کا مساجد و مدارس وغیرہ میں چندہ دینا واعانت کرنا درست ہے یا نہیں، ونیز جولوگ محتاج ہیں ان کو ان کاشتکاروں سے غلہ خریدنا جو ان اراضی میں پیدا ہوتا ہے درست ہے یا نہیں؟ حلت وحرمت دخیل کارِ امسال اور گذشتہ زمانہ کے جو دخیل کار ہیں مساوی ہیں یا کچھ فرق ہے؟ ہر دو غاصب ہیں یا نہیں اگر احدھما غاصب ہے تو ما بہ الامتیاز کیا ہے؟ جبکہ رضا مندی زمیندار ہر دو کاشتکار سے متعلق نہیں ہے۔ بینوا توجروا

الجواب: حکومت کے قبضۂ سلطنت کو استیلاء علی الارض سمجھنا ہمارے فہم میں نہیں آیا کیوں کہ استیلاء قبضۂ مالکانہ کا نام ہے اور گورنمنٹ نے جو ہندوستان پر تسلط کیا ہے وہ مالکانہ ہے اور قبضہ مالکانہ سے زمین ملک کے بادشاہ کی ملک نہیں ہوتی، وہ صرف منتظم ومدبر ہے۔ گذشتہ حالات کی ہم کو خبر نہیں اور نہ صحیح طور پر خبر ہوسکتی ہے، لیکن حالاتِ موجودہ اس پر شاہد ہیں کہ گورنمنٹ نے اراضی ہند پر قبضہ مالکانہ نہیں کیا، مثلاً گورنمنٹ اپنی ضرورت کے لئے بعض دفعہ اگر کسی کی زمین لیتی ہے تو اس کا معاوضہ دیتی ہے۔

عدالتوں میں شب وروز جائیداد کے بیع نامے اور ہبہ نامے اور وقف نامے اور وراثت کے دعوے دائر ہوتے ہیں اور گورنمنٹ ان سب کو معتبر سمجھتی اور اس کے موافق عمل کرتی ہے، اگر زمیندار مالک نہیں ہے بلکہ محض ٹھیکہ دار ہے تو اس کی بیع وہبہ ووراثت ووقف سب باطل ہونے چاہئیں اور اس پر جس فسادِ عظیم کا مرتکب ہوگا وہ مخفی نہیں ہے، اس لئے ان حالات کے ہوتے ہوئے یہ ہرگز تسلیم نہیں ہوسکتا کہ اراضئ ہند گورنمنٹ کی ملک ہیں اور زمیندار محض ٹھیکہ دار ہے اور اگر ایسا ہوتا تو گورنمنٹ کو زمینداروں کا یک قلم الگ کردینا کیا مشکل تھا وہ اپنے استیلاء کو دلیل بنا کر یہ سہولت کہہ سکتی تھی کہ زمیندار صرف ٹھیکہ دار ہے اب ہم اس کو ٹھیکہ دینا نہیں چاہتے، پھر ٹھیکہ اجارہ کی قبیل سے ہے جس کے لئے شرائط اجارہ کا تحقق ضروری ہے، اور یہاں ان کا بالکل وجود نہیں نہ اس ٹھیکہ کی مدت مقرر ہے نہ زمیندار کی موت سے وہ اجارہ باطل ہوتا ہے بلکہ اس میں میراث جاری ہوتی ہے پھر کیوں کر اس کو اجارہ مان لیا جاوے بلکہ یقیناً زمیندار اپنی زمین کا مالک ہے جو کاشتکار کو اجارہ پر زمین دیتا ہے، اور کاشتکار مُستاجر ہے لیکن اس قانونِ جدید کی وجہ سے اب جو کاشتکار کسی زمیندار کی زمین اجارہ پر لیتا ہے تو وہ گویا اجارہ میں یہ شرط بھی لگاتا ہے کہ زندگی بھر میں اس کی زراعت کروں گا جو ایک شرط فاسد ہے، نیز اس میں مدت اجارہ ہی مجہول ہے پس اس کا حکم اجارۂ فاسد کا حکم ہوگا، جس کا

حاصل یہ ہے کہ موجر کے لئے اجر حلال ہے اور مستاجر جو کچھ زراعت کرتا ہے، پیداوار سب اس کی ملک ہے لیکن مستاجر بوجہ اس شرطِ فاسد کے گہنگار ہے اور زمیندار تو قانون کی وجہ سے اس شرط کے ماننے پر مجبور ہے لیکن مستاجر مجبور نہیں ہے اس لئے اس شرط کی وجہ سے وہی گناہ گار ہوگا رہا یہ کہ اس گناہ کا اثر صرف کاشتکار کے ذمہ تک ہے یا زراعت و پیداوار میں بھی اس کا خبث سرایت کرے گا؟ تو اس میں تفصیل ہے، جو روایاتِ ذیل سے واضح ہوگی۔

قال فی الهندیة : ولو کان المشتری استاجر الارض الیٰ ان یدرك ولم یذکر مدة معلومة فالاجارة فاسدة لجهالة المدة فان ترکه فی الارض حتی أدرك لزمه أجر المثل بخلاف حتی لا یجب هناك الأجر اصلاً ، قال ویطیب له من الذرع بقدر الثمن وما عزم من الأجر ویتصدق بالفضل هذا الذی ذکرنا قیاس قول ابی حنیفة ومحمد واما علی قول ابی یوسف یطیب له الزیادة فی الوجوه کلها کذا فی الذخیرة اهـ . (٢٧٢/٥)

قلت ووجه قول ابی یوسف کونها من الاجارات الناس کما یظهر من کلامه والله أعلم .

قال فی الدر : فی الاجارة الفاسدة وحکم الاول وهو الفاسد وجوب اجر المثل بالاستعمال لو المسمی معلوما ان کمال اه .

وفیه ایضاً : الفاسد من العقود ماکان مشروعاً باصله دون وصفه والباطل مالیس مشروعا اصلاً لاباصله ولا بوصفه .

وقال الشامی تحت قوله : وجوب أجر المثل والاجر طیب وان کان السبب حراماً کما فی المنیة ، ونقل فی المنع أن شمس الأئمة الحلوانی قال تطیب الأجرة فی الاجارة الفاسدة اذا کان اجر المثل اهـ . (٤٢/٥)

وفی الدر : ولاتملك المنافع بالاجارة الفاسدة بالقبض بخلاف بیع الفاسد فان المبیع یملك فیه بالقبض بخلاف فاسد الاجارة حتی

لو قبضها المستاجر ليس له أن يوجرها ولواجرها وجب المثل ولايكون غاصباً اهـ .

فيه ايضاً : وفى الاشباه : المستاجر فاسد لو آجر صحيحا جاز ولو بعد قبضه فى الأصح منية ، اهـ . (٥/٤٣)

قلت وهذا حكم المنافع واما الاعيان المتولدة من المأخوذ اجارة فاسدة فحكمهٗ فى الخامدية : وفى الخلاصة رجل دفع الى خياط ثوبا باليخيط له قبأ أو حبة ولم يشا الأجرة فلما فرغ منه اعطاه صاحب الثوب زيادة على اجر مثله فى قياس قول ابى حنيفة يطيب له وقال فقيه ابو الليث الزيادة جائز ة فى قولهم جميعا اهـ . (٣/١٤٩)

قلت واذا طاب للخياط الزيادة على اجر مثله فالظاهر جواز لبس القباء للمالك ايضاً ولعل وجه ذلك عند هما كونهن اجارات الناس ، والله اعلم .

ونصها لوزرع ارض الغيربغير اذنه يعتبر العرف فان اقتسموا الغلة انصافاً او ارباعاً اعتبر والافالخارج للزارع وعليه اجر المثل للارض اه ثم نقل عن جامع الفصولين ومن زرع ارض غيره بلا امره يجب الثلث او الربع على ماهو عرف القرية ثم رمز الفتاوى القاضى ظهيرالدين زرع الا كارسنين بعد مضى مدة الزراعة جواب الكتاب انه لا يكون مزارعة فالزرع كله للاكار وعليه تصدق بما فضل من بذره واجر المثل عمله وهكذا كانوا يفتون ببخارى وقيل تكون مزارعة وقيل لو كانت الارض معدة للزراعة بان كان ربها ممن لا يزرع بنفسه ويدفعه مزارعه فلرب الارض حصة على ماهو عرف تلك القرية لكن انما يحصل على هذا لو لم يعلم وقت الزراعة انه زرعها على وجه الغصب صريحاً اودلالة او علىٰ تاويل فان من آجر أرض غيره بلااذنه ولم يحزربها وقد زرعها المستاجر فالزرع كله

لـلـمستـاجر لا على الزراعة (بل على وجه الاجارة لانه زرعها بتاويل الاجـارـة) والحاصل ان فى المسئلة قولين او ثلاثة الأول انه اذا زرع ارض غيـره بلا امره لايكون غصبا بل يحمل على الزراعة وحصة رب الارض مـاجـرى عـليـه عـرف الـقـرية مـن ثلث او ربع والقول الثانى جواب الكتاب انه يكون غاصبا والزرع كله له لكن يتصدق ما فضل عـن بذره واجر مثل عمله ويمكن حمل هذا على ما اذا لم يكن عرف فى اخذها على وجه المزارعة اذا كان صاحبها اعدها للاستغلال بان كـان يـدفعها مزارعة لغيره ولا يزرعها بنفسه لانه يكون قرينة على ان الزراع انـمـا اخـذهـا عـلـى وجه المزارعة على عرف تلك القرية اما لـو كـان صـاحبهـا يـزرعها بنفسه يكون الزارع غاصبا فالزرع كله له اهـ. (فتاوى حامدية : ٢/١٥٧ ـ ١٥٨)

قـلـت وظهـر مـن مـجـمـوع الـكلام ان الزراع انما يجب عليه التـصدق بما فضل عن بذره واجر مثل عمله اذا كان غاصبا ولايكون غـاصبـا اذا لـم تكن الارض معدة للاستغلال او كان صاحبها يزرعها بـنفسـه وهـذا كله فيما اذا زرع ارض الغير بدون اذنه واما فى صورة الـمسئـولة فـلا يـمـكـن القول بكون الزارع غاصبا لانه يزرعها على تاويل الاجارة ويـزرعهـا بـاذن الـمالك لا بلا اذنه فيكون مستاجرًا لا غـاصبـاً فيـكـون الـزرع كـله له ولا يجب عليه التصدق بم فضل عن بـذره واجـر مثل عمله عند ابى يوسف خلافاً لهما وللمالك اجر مثل ارضـه بـالـغـامـابلغ ولا ينقض عن المسمى لا يقال كيف يجب اجر الـمثل بالغا ما بلغ والاجرة ليست بمجهولة بل مسماة وحينئذ لا يزاد عـلـى الـمسمى كما فى الدر قلت علل فيه عدم الزيادة على المسمى برضاهما به . (٤٦/٥)

وفى الصورة المسئولة لايكون المالك راضيا بالاجر الذى يؤديه

الا كار المدعي لنفسه حق القرار كما هو مشاهد والله اعلم

خلاصۂ روایات یہ ہوا کہ جو شخص غاصب ہو کر دوسرے کی زمین میں زراعت کرے اس کی زراعت کی پیداوار میں زائد سب خبیث ہے جس کا تصدق واجب ہے۔

اور جو شخص اجارہ فاسد کے ساتھ دوسرے کی زمین میں زراعت کرتا ہے اس کی پیداوار بھی طرفین (امام ابوحنیفہ و محمد رحمہما اللہ) کے نزدیک مطلقاً خبیث ہے، الا بقدر بذرہ واجر مثل عملہ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کے نزدیک بعض صورتوں میں جو من جنس اجارات الناس ہو جائز ہے۔

پس صورت مسئولہ میں جبکہ مالک ارض جانتا ہے کہ متاجر اپنی حیات تک زمین پر قابض رہے گا اور اس بات کو جانتے ہوئے زمین کو اجارہ پر دے رہا ہے تو متاجر اس صورت میں غاصب نہیں البتہ یہ اجارہ فاسدہ جس میں متاجر ایک شرط فاسد کر رہا ہے اور مدتِ اجارہ بھی مجہول ہے اس لئے اس کا حکم یہ ہے کہ خود اس متاجر کے حق میں تو اس کی پیداوار کا وہ حصہ جو قدر تخم اور اجرت مثل عمل سے زائد ہو حلال نہیں، علی قول الطرفین، اور دوسرے کے حق میں قول ابو یوسف پر اس کی کل پیداوار کو دفع حرج کے لئے جائز کہا جائے گا، کیوں کہ اب اس میں ابتلاء عام ہو گیا ہے۔ جس سے دوسروں کو تحرز دشواری ہے ان کے لئے ایسے متاجر کے حق میں دعوت ہدیہ چندہ کی رقم لینے کو جائز کہا جائے گا، اور خود اس متاجر کے حق میں چوں کہ حرج نہیں ہے کیوں کہ وہ اس اجارہ فاسد کا اپنے فعل سے مرتکب ہو رہا ہے تو اس کے حق پیداوار اور زائد علی القدر المذکور کو حرام کہا جائے گا، اور دوسروں کے لئے بھی یہ توسع صرف اس صورت میں ہے جبکہ مالکِ ارض ابتداء ہی سے کسی متاجر کو حیاتی کاشتکار مان کر زمین اجارہ پر دے اور اگر مالک ارض نے ابتداء میں حیاتی کاشتکار مان کر زمین نہ دی تھی بلکہ ایک مدت معینہ کے لئے اجارہ پر دی تھی پھر متاجر اس قانون جدید کی وجہ سے حیاتی کاشتکار و دخیل کار بن گیا تو یہ شخص مدتِ معینہ کے تمام ہونے کے بعد غاصب شمار ہوگا، اور اس کی پیداوار زائد علی القدر المذکور سب کے لئے حرام ہے اس کے حق میں بھی اور دوسروں کے حق میں بھی، مگر یہ وہ مدتِ معینہ اجارہ اولیٰ کے ختم ہونے پر اجارہ فسخ کر دے اور دوبارہ قانونِ جدید پر اجارہ کرے یا مالک ارض کو قانوناً اس کاشتکار کو الگ کر دینے کا مدتِ معینہ تک حق حاصل تھا اور مالک ارض نے عمداً اس کو الگ نہیں کیا تو اب یہ کاشتکار بھی صورتِ اولیٰ کے کاشتکاروں جیسا ہو گیا۔ وحكمه كحكم الاول

اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ امسال کے دخیل کاروں اور گذشتہ زمانہ کے دخیل کاروں میں فرق ہے کیوں کہ گذشتہ زمانہ کے دخیل کاروں سے مالکانہ ارض مدت معینہ تک کے لئے اجارہ کرتے تھے پھر وہ بدون رضا مالک کے بارہ سال کے بعد محض قانون کی وجہ سے قابض اور دخیل کار بن جاتے ہیں پس وہ بحکم غاصب تھے اور اس وقت جو کاشتکار کسی سے زمین لیتا ہے تو مالک زمین اس کو دائمہ کاشتکار مان کر زمین دیتا ہے تو وہ اس کے قبضۂ حیاتی میں ابتداء ہی سے ہے، رہا یہ کہ وہ دل سے کہاں راضی ہے محض قانون کی وجہ سے مجبور ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ قانوناً زمین کاشت کے لئے دینے پر مجبور نہیں اگر وہ خود کاشت کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، اور جب وہ خود کاشت نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو زمین دے رہا ہے اور جانتا ہے کہ یہ کاشتکار بنتے ہی دخیل کار ہو جائے گا، تو اس کا اس حالت میں زمین دینا کاشتکار کی دخیل کاری پر رضا ہے، نیز قانون نے زمین کے مالک کی زبان تو بند نہیں ہے وہ اس قانون کے بعد بھی زبان سے اتنا کہہ سکتا ہے کہ میں یہ زمین مدت معینہ کے لئے (مثلاً دو سال کے لئے) اجارہ پر دیتا ہوں اس سے زائد کے لئے میں راضی نہیں ہوں، اگر وہ زبان سے ایسا کہہ دے تو اس کاشت کار کا اب بھی مدت معینہ کے بعد وہی حکم ہوگا جو گذشتہ دخیل کاروں کا حکم تھا لیکن جب وہ زبان سے کوئی مدت متعین نہیں کرتا اور قانون حال سے واقف ہے تو دلالۃً وہ مستاجر کی شرط فاسد پر راضی ہے اس صورت میں مستاجر کو غاصب مثل گذشتہ دخیل کاروں کے نہ کہا جائے گا ہاں اس قانون سے نفع لینے میں وہ گناہ گار ضرور ہے، اس کے حق میں اس کی پیداوار حرام ہی ہے لاستفتاء مامر، لیکن غاصب نہ ہونے کا اثر دوسروں کے حق میں بصورت توسع ظاہر ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم

(ماخوذ از امداد الاحکام: ٤/١٧٥، کتاب المزارعة)

احکام احیاء الموات

یعنی بنجر غیر مملوکہ زمین کو آباد کرنے کا حکم

غیر آباد زمین کو آباد کرنے کا مطلب:

آبادی سے دور کوئی زمین جس کا کوئی مالک معلوم نہیں بے آباد پڑی ہوئی ہے، اب کوئی شخص اس کو درست کر کے قابل کاشت بناتا ہے تو وہ اس زمین کا مالک ہو جائے گا۔

والأصل فيها : قول النبى عليه الصلاة والسلام : "من أحيا أرضاً ميتة فهي له" .

(اخرجه الترمذى رقم ١٣٧٩، فى الأحكام ، وقال : هذا حديث صحيح)

وفى رواية أخرى: "من أعمر أرضا ليست لأحدٍ فهو أحق بها".

(اخرجه احمدو الترمذى وابو داؤد)

وقد اشترط الفقهاء أن تكون بعيدة عن البلدةِ ، لا ينتفع بها أهل العامر، أى أهل المدينة ، ولا يجوز احياء ماقرب من البلدة ، بل يترك مرعىً لأهل البلدة ، لأنعامهم ومواشيهم .

قال صاحب الهداية : الموات مالا ينتفع به من الأراضى، لانقطاع الماء عنه ، أو لغلبة الماء عليه، كالسبخة، أو ما أشبه ذلك، مما يمنع الزراعة ، سمى بذلك لبطلان الانتفاع به، فما كان منها قديماً لا مالك له ، أو كان مملوكاً في الاسلام ، لا يعرف له مالك بعينه ، وهو بعيد من القرية بحيث اذاوقف انسان من أقصى العامر، أى المسكونة ، فصاح لا يسمع الصوت فيه ، فهو مواتٌ .

واشترط محمد بن الحسن أن لايكون مملوكاً لمسلم، أو ذمى، مع انقطاع الارتفاق به ، ليكون ميتة مطلقاً ، أما المملوكة لمسلم أو ذمى ، فلا تكون مواتاً واذا لم يعرف مالكه يكون لجماعة المسلمين.

(الهداية : ٤/٤٣٥)

غیر آباد زمین آباد کرنے کے لئے اجازت حاکم کا حکم:

زمین آباد کرنے کے لئے ائمہ ثلاثہ کے ہاں حاکم وقت سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں لیکن امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں چونکہ یہ زمین حکومت کی ملک میں ہے اس لئے حکومت وقت سے باقاعدہ اجازت لینے کی ضرورت ہے۔

ثم من احياها باذن الامام ملكه وان احياه بغير اذنه لم يملكه عند ابى حنيفة رحمه اللّٰه ، وقالا : يملكه لقوله عليه السلام : من احيا

ارضا میتة فهی له ولانه مال مباح سبقت يده اليه فيملكه كما فی الحطب والصيد،ولابی حنيفة قوله عليه السلام : ليس للمرء الا ماطابت به نفس امامه وما رويا ه يحتمل انه اذن لقوم لا نصب للشرع ولانه مغتوم لو صوله الی يد المسلمين بايجاف الخيل والركاب فليس لاحد أن يختص به بدون اذن الامام كمافی سائر الغنائم . (الهدايه : ٤/٤٨٣)

احیاء کے لئے صرف علامات رکھ دینا کافی نہیں:

اگر کوئی شخص بے آباد زمین کو آباد کرنے کی غرض سے چار دیواری کردے یا پتھر وغیرہ علامات سے دوسری زمینوں سے جدا کردے تو صرف اتنا کرنے سے اس زمین کا مالک بن جائے گا یا حقیقتاً قابل کاشت بنا کر کاشت کرنا ہوگا۔

اتنا کام کرنے سے وہ دوسروں کے مقابلہ میں اس زمین کا زیادہ حقدار ہوگا البتہ تین سال کی مدت میں اس کو قابل کاشت بنانا ضروری ہے اگر نہیں بنایا تو پھر حاکم اس سے واپس لے کر کسی دوسرے کے حوالے کردے گا تا کہ وہ قابل کاشت بنائے۔

لقوله عليه السلام : من سبق الی ماءٍ لم يسبق اليه مسلم فهو احق به . (اخرجه ابوداؤد رقم : ٣٠٧١، واسناده ضعيف)

وينتظره السلطان ثلاث سنين فان لم يعمر ها اخذها منه ودفعها الی غيره لما روی عن عمر رضی الله عنه أنه قال : " من تحجر ارضا فعطلها ثلاث سنين فجاء قوم فعمروها فهم احق بها ."

قال صاحب الهداية : ومن حجر ارضا ولم يعمر ها ثلاث سنين، اخذها الامام ودفعها الی غيره لان الدفع الی الاول ، كان لعمرها فتحصل المنفعة للمسلمين ، من حيث العشر أو الخراج فاذا لم تحصل يدفع الی غيره تحصيلا للمقصود . (الهدايه : ٤/٤٨٣)

زمین کی کاشتکاری میں وراثت جاری نہیں ہوتی:

اگر کوئی زمیندار اپنی کسی کھیتی کی بخوشی کاشتکاری لگوادے تو زمیندار اور کاشتکار دونوں یا کسی

ایک کے انتقال کے بعد یہ معاہدہ خود بخود ختم ہو جائے گا ان کی اولاد کو کاشتکاری کا حق نہ پہنچے گا، کیوں کہ وراثت مملوک میں ہوتی ہے، حقوق مجردہ میں نہیں ہوتی، نیز اگر زمیندار کچھ عوض لیکر زمین کو موروثی کردے تو بھی زمین شرعاً موروثی نہ ہوگی اور زمیندار نے جو رقم لی ہے وہ رشوت ہے، اس کا تصرف میں لانا حرام ہے، کاشتکار اپنی رقم واپس لے سکتا ہے۔

قال فی الدر والاشباہ : لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردة، کحق الشفعة ، (٤ / ٢٠ ، ملخص از امداد الاحکام : ٤/١٧٢)

حاکم رعایا کو غیر آباز مین دے سکتا ہے:

حکومت کو حق حاصل ہے کہ غیر آباد زمین کسی کو دیدے تا کہ وہ اس کو آباد کرے، البتہ ایسی زمین نہ دے جو عام لوگوں کی ضرورت کی ہے، مثلاً راستہ، نہر، وغیرہ۔

نبی کریم ﷺ نے بلال بن حارث کو''عقیق'' نامی زمین بطور قطع کے دی تھی جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خلافت کا زمانہ آیا تو انہوں نے حضرت بلال سے فرمایا:

ما اقطعك رسول الله صلى الله عليه وسلم لتحجزه عن الناس، انما اقطعك لتعمره فخذمنها ما قدرت على عمارته ورد الباقي .

(اخرجه سعيد في سننه كذا في المغني : ٥/٥٧٠)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے تمہیں زمین محض چار دیواری کی غرض سے نہیں دی تھی بلکہ دینے کا مقصد اس کو آباد کرنا تھا، جتنی زمین آباد کرسکا، وہ تو تمہاری ہوگئی اور جو غیر آباد رہ گئی ہے اس کو واپس کردو۔

روى الترمذي عن علقمه بن وائل عن ابيه أن النبي صلى الله عليه وسلم اقطعه ارضا بحضر موت .

(اخرجه الترمذي رقم : ١٣٨٠ وقال حسن صحيح)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو''حضر موت''میں ایک زمین بطور قطع کے دی تھی۔

وكذا اقطع صلوات الله نا سامن جهينة مزينة فعطلوها، فجاء قوم فاحيوها، فخاصمهم الذين اقطعهم رسول الله صلى الله

علیہ وسلم، الی عمر رضی اللّٰہ عنہ فقال عمر رضی اللّٰہ عنہ ، لو کانت قطیعة منی او من ابی بکر لم اردھا، ای لم ارجعھا الیھم ولکھنا قطیعة من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فانااردھا، ثم قال عمر : من کانت لہ ارض فعطلھا ثلاث سنین ، فجاء قوم فعمروھا ، فھم احق بھا . (فقہ المعاملات)

غیرآباد زمین کوآباد کرنے کی شرائط:

(۱) یہ غیرآباد زمین کسی کی ملک میں نہ ہو کیوں کہ غیرآباد مملوکہ زمین مالک کی اجازت یا مالک سے خریدے بغیر کسی غیر کے لئے آباد کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اگرچہ بالکل ہی بےکار پڑی ہوئی ہو۔

(۲) یہ زمین کسی آباد زمین کی ضرورت میں سے نہ ہو، مثلاً کسی گھر کا صحن یا کسی کنویں کا من وغیرہ نہ ہو۔

کما روی : من حفر بئرًا فلہ مما حولھا اربعون ذراعا عطنا لماشیتہ . (اخرجہ ابن ماجہ باب حریم البئر رقم : ۲۵۱۱)

(۳) زمین ملنے کے بعد تین سال پورے ہونے سے قبل اس کوآباد کرنا ضروری ہے۔

تمت الجزء الثانی من

"جدید معاملات کے شرعی احکام"

بعون اللّٰہ سبحانہ تعالیٰ

فی ثمانیہ عشر من شعبان ۱٤۲۷ھ ویلیہ الجزء الثالث

ان شاء اللّٰہ تعالیٰ۔